اسلام

اور

جدید فکری مسائل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اسلام اور جدید فکری مسائل

جس میں اسلام اور شریعت اسلامی سے متعلق ملکی وعالمی سطح پر پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کا سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اس کی عقل وفطرت اور حکمت ومصلحت سے ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز موجودہ دور میں پیش آنے والے جدید وقدیم مسائل پر دعوتی وتذکیری اسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ کو واضح کیا گیا ہے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جمع وترتیب

مولانا محمد نعمت اللہ قاسمی مکی

مکتبہ قاسم العلوم

نام کتاب

اسلام اور جدید فکری مسائل

مصنف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اہتمام ——— ملک اسد علی قاسمی
مطبع ——— گنج شکر پریس
ناشر ——— مکتبہ قاسم العلوم

ڈسٹری بیوٹرز

ملک اینڈ کمپنی

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، پاکستان
042-37231119 , 0321-4021415

فہرست مضامین

✿ ✿ ✿

طبع دوم

جس درخت پر پھل ہوتے ہیں، اسی پر پتھر پھینکے جاتے ہیں اور جس جاندار میں زندگی ہوتی ہے، اسی پر مخالفتوں اور عداوتوں کے وار کیے جاتے ہیں، شجر بے ثمر پر کوئی پتھر کیوں پھینکے، جو خود ہی اپنے ناموس کو گنوا چکا ہو، اور بے جان لاش ہو، اس پر کیوں کر وار کیا جائے کہ وہ تو خود ہی بے روح اور رمق حیات سے عاری ہے، یہی کیفیت ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات کی ہے، جو مذاہب اپنا وجود کھو چکے ہیں، جن سے انسانیت کا کوئی نفع متعلق نہیں رہا اور جن میں انقلاب انگیزی اور زمانہ سازی کی صلاحیت باقی نہیں رہی، ان پر کیوں سوالیہ نشان لگائے جائیں اور انھیں کیوں تنقید کا ہدف بنایا جائے؟

لیکن پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ جس دین حق کو اپنی مکمل اور آخری شکل میں لے کر آئے ــــ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس کی حفاظت کا غیبی انتظام کیا گیا، جو انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور عقل و سائنس سے حد درجہ موافق ہے، جس میں مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور انسانیت کو مادیت سے روحانیت کی طرف لانے کی صلاحیت ہے اور جو ایک زندہ و پائندہ نظامِ حیات ہے ــــ کا معاملہ دوسرے مذاہب سے مختلف ہے، دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ خود ان کے ماننے والوں نے انھیں کنارے کر دیا ہے؛ لیکن اسلام آج بھی زندگی سے مربوط ہے اور مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ نہ صرف آخرت کی نجات؛ بلکہ دنیا کی فلاح بھی اسی دین حق سے متعلق ہے اور اگر رسول عربی ﷺ کا دامن نبوت ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر دنیا و آخرت دونوں جگہ ناکامی ان کا مقدر رہے۔

اسلام کی اسی اثر انگیزی اور انقلابی صلاحیت کی وجہ سے لامذہبیت کے نمائندے خاص طور پر اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے اور غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں؛ چنانچہ یہ حقیر 'شمع فروزاں' کے کالم میں جن موضوعات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ شبہات اور غلط فہمیاں بھی ہیں، اس طرح کے مضامین کا ایک مجموعہ ''حقائق اور غلط

فہمیاں‘‘ کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہو چکا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس مجموعہ کو بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور کئی معروف اصحابِ علم نے خط لکھ کر اور فون کر کے حوصلہ افزائی فرمائی اور بعضوں نے کہا کہ اس موضوع پر اُردو زبان میں متعدد کتابیں آئی ہیں؛ لیکن مدلل گفتگو، سنجیدہ لب ولہجہ اور اعتدالِ فکر کے اعتبار سے اس مجموعہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

اسی طرح اس دور میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں اسی کالم میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے، ان میں بعض فکری مسائل ہیں اور بعض فقہی؛ لیکن اخبار کے قارئین کو سامنے رکھتے ہوئے کوشش ہوتی ہے کہ اسے فقہی زبان میں لکھنے کی بجائے دعوتی اور تذکیری اُسلوب میں لکھا جائے۔ نیز اس کے مخاطب صرف اہل علم ہی نہ ہوں؛ بلکہ عوام بھی ہو؛ چنانچہ ایسے مضامین کا ایک مجموعہ ۲۰۰۴ء میں ’’نئے مسائل — اسلامی نقطۂ نظر‘‘ کے نام سے چھپ چکا ہے، ان دونوں مجموعوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں دل سے زیادہ دماغ کو مخاطب بنایا گیا ہے اور موجودہ دور کے نوجوانوں کو اسلام کے تئیں جو فکری اُلجھنیں پیش آتی ہیں، ان کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی قدرِ مشترک کی بنا پر اس کو ’’اسلام اور جدید فکری مسائل‘‘ کے نام سے شائع کیا جارہا ہے، خدا کرے یہ کم سواد تحریریں شکوک وشبہات کے کچھ کانٹوں کو دلوں سے نکالنے اور اسلام پر ایمان ویقین کے بڑھانے کا باعث بنیں، وباللہ التوفیق۔

یہ مضامین ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۰ء ’منصف‘ کے جمعہ ایڈیشن ’’مینارۂ نور‘‘ کی فائلوں میں دبے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ بے حد اجر عطا فرمائے عزیزی الاعز مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی (متعلم جامعہ اُم القریٰ مکہ مکرمہ) — بارک اللہ فی علمہ واعمالہ — کو؛ کہ انھوں نے جگہ جگہ سے ڈھونڈ کر ان مضامین کو اکٹھا کیا اور پھر ایک خوبصورت ترتیب کے ساتھ قارئین کے لئے لائق استفادہ بنایا، اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کو بے حد اجر عطا فرمائے اور ان سے دین اور علمِ دین کی بھرپور خدمت لے۔ وللہ الحمد أولا وآخراً۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۲۷/ ذوالقعدہ ۱۴۳۲ھ
۲۶/ اکتوبر ۲۰۱۱ء

پیش لفظ

۱۹۹۸ء سے روز نامہ منصف حیدر آبادنئی اور خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ اور نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہونے لگا، اس موقع سے اخبار کے منتظمین نے اس حقیر سے خواہش کی کہ ہر جمعہ کو اخبار کے لئے ایک خصوصی کالم لکھا کروں اور اس کو ''شمع فروزاں'' کا عنوان دیا گیا، چوں کہ اخبار کی رسائی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور عوام وخواص، مرد وخواتین، چھوٹے اور بڑے سبھی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اگر صحیح استعمال ہو تو یہ خیر کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس پیش کش کو قبول کرلیا۔

چنانچہ شروع سے آج تک ہر جمعہ کو یہ کالم اس حقیر کے قلم سے ہوتا ہے، جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ پیش آنے والے نئے حالات اور تازہ واقعات کے پس منظر میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے؛ تاکہ لوگ محسوس کریں کہ یہ ایک زندہ اور زندگی سے مربوط مذہب ہے، اس کالم کے تحت ان غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اسلام سے متعلق پیدا کی جارہی اور پھیلائی جارہی ہیں، عام لوگوں کی استعداد اور ان کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ان مضامین میں خالص علمی وتحقیقی انداز اختیار کرنے کے بجائے تذکیری اور دعوتی رنگ کو غالب رکھا جاتا ہے اور اس رنگ میں کوشش کی جاتی ہے کہ علمی دلائل بھی آجائیں: چنانچہ ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک جو مضامین شائع ہوئے، ان میں سے اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ پرمبنی تحریروں کا یہ مجموعہ ''حقائق اور غلط فہمیاں'' اشاعت پذیر ہورہا ہے۔

شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کو محفوظ رکھنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے تھا، افسوس کہ نہیں ہوسکا اور بعض مضامین باوجود تلاش بسیار کے نہیں مل پائے؛ لیکن جو کچھ مضامین دستیاب ہوئے، اس کے لئے عزیزی مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی سلمہ شکریہ کے مستحق

ہیں، انھوں نے بڑی محنت سے جن مضامین کی زیراکس کاپی محفوظ تھی، ان کو تاریخ کے لحاظ سے مرتب کیا، پھر جو مضامین نہیں مل سکے، ان کے لئے مختلف جگہ سے اخبارات جمع کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک مضامین کو اکٹھا بھی کرلیا، اس کے بعد چند ہی مضامین ہیں، جو حاصل نہیں کئے جاسکے، پھر انھوں نے ان مضامین کو موضوع کی مناسبت سے الگ الگ مجموعوں کی شکل دی، جن میں سے ایک اس وقت آپ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان سے دین اور علم دین کا زیادہ سے زیادہ کام لے اور اس حقیر مجموعہ کو شکوک وشبہات کے ان کانٹوں کو نکالنے میں مفید ومؤثر بنائے، جو مغرب کی جانب سے بوئے جارہے ہیں، وہ مغرب جو اونٹ کو نگلتا اور مچھر کو چھانتا ہے اور جو شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر برسانے کا عادی ہے۔

وباللہ التوفیق وهو المستعان .

۲۲؍رجب ۱۴۲۵ھ
۷؍ستمبر ۲۰۰۴ء

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرض مرتب

اس دنیائے بے ثبات میں حق و باطل اور خیر و شر کا معرکہ ہمیشہ سے گرم رہا ہے، جب بھی حق نے اپنی چادر رحمت کو پھیلایا، باطل نے اس کا پیچھا کیا، انبیاء کرام کی تاریخ اس معرکہ سے بھری پڑی ہے، کہ جب بھی کسی نبی نے راہِ حق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، لوگوں نے اس کا انکار کیا اور غلط فہمیاں پھیلا کر قبول حق سے لوگوں کو باز رکھا، اسلامی تاریخ کو بھی اس طرح کی کشمکش کا سامنا رہا ہے؛ چنانچہ آج بھی غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کی نمائندہ تحریکیں زیادہ منظم اور منضبط طور پر اپنی تخریبی کارروائیوں میں دن ورات مشغول ہیں اور جہاں مستشرقین نے مغرب میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں اور بے جا اعتراضات پھیلانے کا سہرا اپنے سر لیا ہے، وہیں ایشائی ممالک میں بھی ان کے زیر اثر بہت سی تنظیمیں اس سلسلہ میں سرگرم عمل ہیں، ہندوستان کے پس منظر میں وشو ہندو پریشد اور آر، ایس، ایس اس سلسلہ میں جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ اہل علم کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔

ان اسلام مخالف غلط فہمیوں کو ہوا دینے میں مغربی تہذیب و ثقافت کا خاصا رول رہا ہے؛ کیوں کہ مغربی تہذیب جس راہِ حیات کی حامل ہے، وہ اسلام کی مذہبی قدروں اور انسانی فطرتِ سلیمہ کے مغائر ہے، پردہ، طلاق، تعداد ازدواج، عورتوں کے حقوق اور دائرہ کار ان موضوعات میں سے ہے، جو اس وقت اسلام کے خلاف مغرب کی یلغار کا خاص موضوع ہے، ان کی سوچ میں تضاد اور دو عملی بھی ہے، وہ ایک طرف عورتوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے مقابلہ آواز بھی بلند کرتی ہیں اور دوسری طرف عورتوں کی عصمت ریزی پر عائد ہونے والی سزاؤں پر احتجاج سے بھی گریز نہیں کرتیں اور قرآن نے جو اس سلسلہ میں زنا کی سزا متعین کی ہے، اسے عقل انسانی کے خلاف اور انسانی تکریم کے مغائر سمجھتی ہیں۔

آج جب یوں بھی میڈیا نے اسلام اور مسلمان مخالف جذبات کو ہوا دینا اپنا خاص مشغلہ بنا رکھا ہے، ان حالات میں اگر کوئی غلط فہمی ان کے ہاتھ آجائے تو اسے وہ اپنا کمال سمجھتے ہیں اور اس کی نشر و اشاعت میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیتے ہیں، ظاہر ہے ان غلط فہمیوں کا ازالہ علماء کی ایک اہم ذمہ داری ہے، جس کے لئے ان کے اندر علمی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانہ کے اندازِ فکر اور مسائل کو مصالح شریعت اور عقل انسانی سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی صلاحیت درکار ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کو اللہ تعالیٰ نے جہاں فقہ اسلامی میں مہارت اور شانِ امتیاز عطا کیا ہے، وہیں احکامِ شریعت کی مصلحتوں اور فطرتِ انسانی اور عقل سلیم سے ان کی ہم آہنگی پر بھی ان کی گہری نظر ہے، انھوں نے اپنی توجہات کا مرکز ان غلط فہمیوں کو بھی بنایا ہے اور اسلام کے خلاف اُٹھائے جانے والی غلط فہمیوں کا شریعتِ اسلامی اور انسانی عقل سلیم کے تناظر میں مثبت اور دلچسپ انداز میں جواب دیا ہے اور جہاد، تعدد ازدواج، پردہ، طلاق، ذبح حیوان، یونیفارم سول کوڈ، تبدیلی مذہب جیسے اہم موضوعات ـــــ جن کے بارے میں عام طور پر غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ـــــ پر مدلل اور بصیرت مندانہ گفتگو کی ہے، تقریباً چھ سالوں سے آپ ہندوستان کے کثیر الاشاعت اُردو روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن ''مینارۂ نور'' میں ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے ہر ہفتہ سماجی، سیاسی، نئے مسائل اور اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں، جیسے موضوعات پر اپنا مضمون سپردِ قلم کرتے ہیں، زبان و بیان کی سلاست و شگفتگی اور رعنائی کے سبب، نیز عام فہم ہونے کی وجہ سے یہ مضامین عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں؛ اس لئے عام دنوں کے مقابلہ جمعہ ایڈیشن خاصی زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے، یہ مجموعہ روزنامہ 'منصف' میں شائع شدہ ان ہی مضامین کا گلدستہ ہے، احقر نے روزنامہ منصف کی فائلوں سے ان مضامین کو جمع کیا، جو یقیناً احقر کے لئے باعث سعادت ہے، جس سے عملی زندگی میں احقر نے بہت ہی فائدہ بھی محسوس کیا اور اب افادۂ

عام کی غرض سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، اس مجموعہ میں مولانا مدظلہ کا ۲۴؍آیتیں نامی رسالہ بھی شامل ہے، جو اصل میں وی، ایچ، پی والوں کی طرف سے قرآن مجید کی جن ۲۴؍آیتوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، اس کا جواب ہے، جو روزنامہ منصف میں ہی پہلی بار سات قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ہندی اور گجراتی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ یہ کتاب اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کا سبب بنے، اس کا نفع زیادہ سے زیادہ عام ہو اور یہ حقیر کوشش مصنفِ کتاب حضرت الاستاذ مدظلہ کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذخیرہ آخرت بنے۔

۲۲؍رجب ۱۴۲۵ھ

۸؍ستمبر ۲۰۰۴ء

(ڈپلوما ان انگلش: المعہد العالی الاسلامی، حیدر آباد)

❁ ❁ ❁

لاتبدیل لکلمات اللہ!

حال ہی میں وی۔ ایچ۔ پی لیڈر گری راج کشور کا نہایت ہی مذموم، غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان آیا ہے کہ قرآن وحدیث کے مضامین میں "تبدیلی" ہونی چاہئے اور بقول ان کے جن آیات واحادیث میں غیر مسلموں سے "نفرت" کی تعلیم دی گئی ہے، اُن کو نکال دینا چاہئے، یہ بیان نامعقول بھی ہے اور ناشائستہ بھی، ناشائستہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی مآخذ پر حملہ کرنے کے مترادف ہے، نامعقول اس لئے کہ کسی بھی تحریر وبیان میں صاحب تحریر ہی کو تبدیلی کا حق حاصل ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کوئی بات کہے اور دوسرا شخص اس بات کو واپس لے لے، اس سے قطع نظر کہ مسلمان قرآن کو اللہ کا کلامِ حق ترجمان اور حدیث کو منشاءِ ربانی کا بیان سمجھتے ہیں، خالص عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ نہایت ہی نامعقول بات ہوگی؛ لیکن اس قسم کے غیر دانشمندانہ مطالبات مسلمانوں کے لئے کوئی اچنبھے کی چیز نہیں ہیں۔

جس عہد میں قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت بھی مشرکین نے یہی مطالبہ کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہی جواب دلایا گیا تھا کہ ہماری کیا مجال کہ ہم قرآن کو بدل دیں، یا ہم اپنی طرف سے کوئی بات لے آئیں، ارشاد ہے:

> جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، جو واضح ہیں، تو جن لوگوں کو (آخرت میں) ہماری ملاقات کا یقین نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کردو، آپ فرمادیں: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں؟ میں تو صرف ان احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری

طرف وحی کی جاتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں،
تو مجھے برے دن کے عذاب کا خوف ہے۔(یونس:۱۵)

غور کیجئے! کہ وی، ایچ، پی نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ کس قدر مشرکین مکہ کے مطالبہ کے مطابق ہے، زمانہ مختلف ہے، لب ولہجہ میں فرق ہے، زبان وبیان کا اختلاف ہے؛ لیکن فکرونظر اور قلب وذہن کے فساد میں کیسی یکسانیت ہے: "کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ "(البقرة:۱۱۸)اور ظاہر ہے کہ آج بھی اُمتِ مسلمہ اس کا وہی جواب دے گی، جو اس کے پیغمبر نے دیا تھا، کہ یہ ہماری تصنیف یا ہمارے خیالات نہیں ہیں؛ بلکہ یہ احکامِ خداوندی ہیں، ہماری مجال نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی کریں، اگر ہم نے اس میں ایک شوشہ کی تبدیلی بھی گوارا کی تو آخرت کے عذاب سے نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اور یہ کچھ مشرکین مکہ ہی پر موقوف نہیں؛ بلکہ ہر عہد میں گمراہ، خدا بیزار اور حقیقت ناشناس لوگ ایسی نامعقول اور ناشائستہ باتیں کہتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل کا واقعہ تو واضح طور پر ذکر کیا ہے، کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے توراۃ لے کر آئے، تو یہود (جن کی پوری تاریخ اللہ کے احکام سے سرکشی وسرتابی، انبیاء ورسل کے ساتھ استہزاء وتمسخر اور ایذاء رسانی، نیز ظلم وجور سے عبارت ہے) نے اس کے احکام کو ماننے سے انکار کردیا، ان کا مطالبہ تھا کہ اسے آسان کیا جائے اور اس میں جو سخت احکام آگئے ہیں، انھیں بدل دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سرکشی کو دیکھتے ہوئے ان پر کوہِ طور کو اُٹھالیا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو احکام دیئے ہیں، انھیں مضبوطی سے تھامو اور اسے یاد رکھو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے پیس دیے جاؤ گے: "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَافِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "(البقرة:۱۶۳)تب جا کر انھوں نے سرِ تسلیم جھکایا اور احکامِ الٰہی کو قبول کیا۔

انسان جیسے خود فانی ہے، اس کے خیالات وافکار بھی فانی اور ناپائیدار ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر اور فطرت کائنات کا خالق ومالک ہے،

اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل برابر ہے، اس کا کوئی حکم عدل کے خلاف اور واقعہ کے مغائر نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا کوئی قانون توازن اور اعتدال سے خالی ہوسکتا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی کی بات سوچنا بھی بے وقوفی اور نادانی ہے، قرآن نے اس بات کو بہت واضح طور پر کہا ہے:

> آپ کے رب کی بات پوری ہوگئی، سچائی اور عدل کے اعتبار سے، کوئی نہیں جو اس کے احکام کو بدل دے، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے، جو لوگ زمین میں ہیں، اگر آپ ان کی اکثریت کی بات ماننے لگیں، تو وہ تو آپ کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں گے، وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور محض اٹکل لگاتے ہیں۔ (الانعام: ۱۱۵-۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زبان سے کہلایا کہ کیا اللہ کے سوا میں کسی اور حاکم کو تلاش کر سکتا ہوں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تفصیلی کتاب اُتار دی ہے: ''اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا'' (الانعام: ۱۱۴) یعنی یہ ایسا ناپاک خواب ہے جو قیامت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

یہ کہنا کہ قرآن و حدیث میں نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، کھلا ہوا بہتان اور اتہام ہے، قرآن انسانوں سے نفرت نہیں ؛ بلکہ محبت سکھاتا ہے، قرآن اس بات سے منع کرتا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ دوسرے انسانوں کو ذلیل و حقیر سمجھے، قرآن کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ ہیں اور آدم و حوا ہی سے تمام انسان پیدا ہوئے ہیں، یہ انسانی وحدت کا تصور جہاں مساوات کی بنیاد فراہم کرتا ہے، وہیں ایک خاندان اور ایک کنبہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اُنس و محبت کا برتاؤ بھی سکھاتا ہے، قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم میں فرق کیے بغیر کسی بھی نفسِ انسانی کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا: ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا'' (المائدۃ: ۳۱) اگر اسلام نے غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی ہوتی تو یہ بھی کہا ہوتا کہ مسلمان دوسری قوموں کو اسلام قبول

کرنے پر مجبور کریں؛ لیکن قرآن نے صاف اعلان کیا کہ مذہب کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر و اکراہ درست نہیں: ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ''۔ (البقرۃ:۲۵۶)

اسلام تو امن و امان اور صلح و آشتی کا مذہب ہے اور قرآن و حدیث میں قدم قدم پر اس کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو غیر مسلم مصالحانہ رویہ اختیار کریں اور تمہارے ساتھ صلح و آشتی کی زندگی گذارنا چاہیں، تم بھی ان کے ساتھ صلح کا راستہ اختیار کرو: ''وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ''۔ (الانفال:۶۱)

قرآن نے مسلمانوں سے برسرپیکار غیر مسلموں سے مقابلہ کی تلقین کرتے ہوئے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا، جن سے مسلمانوں کا صلح و امن کا معاہدہ ہو؛ چنانچہ ارشاد ہے :

> ان لوگوں سے قتال نہ کرو جو ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی قوم سے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرما دیتا، پھر وہ تم سے جنگ کرتے، اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے گریزاں ہیں اور تم سے صلح چاہتے ہیں، تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف جنگ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ (النساء:۹۰)

کتنا واضح حکم ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں، ان کے حقوق کے غاصب نہ ہوں اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کی راہ نہ اختیار کرتے ہوں، ان سے نہ جنگ و جدال کی اجازت ہے اور نہ نفرت و بیگانگی کی گنجائش ، ہاں! جو لوگ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی سوداگری کرتے ہوں، ان سے یقیناً جہاد کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے؛ بلکہ دنیا کے تمام مہذب قوانین میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

گری راج کشور کے بیان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بیان میں نہ صرف

اسلام کی؛ بلکہ ہندو مذہب کی بھی توہین کی ہے، انھوں نے اپنے طور پر اس بات کا ذمہ لیا ہے کہ وہ ہندو مذہبی کتابوں میں تبدیلی کے لئے تیار ہیں، اولاً تو کشور صاحب کوئی مذہبی شخصیت نہیں ہیں؛ اس لئے ان کو اپنے یا دوسروں کے مذاہب کے معاملہ میں اظہار خیال سے احتیاط کرنی چاہئے، مذہب کا تعلق عقیدہ اور جذبات سے ہے، یہ سیاست کا میدان نہیں ہے، جس میں ہر ناکردنی اور ہر ناگفتنی کو جائز کرلیا گیا ہے، دوسرے خود ہندو مذہب کے لئے ان کا بیان کس قدر اہانت آمیز ہے، کہ وہ اپنے آپ کو اس میں ترمیم وتبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں، کاش! ہندو مذہبی رہنما اس حقیقت پر توجہ دیں اور اس کا نوٹس لیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسے ناشائستہ بیان پر بھی اشتعال سے بچیں، اس طرح کی باتیں کہنا ان لوگوں کا مزاج ہوتا ہے جو فکر ونظر اور استدلال کے معرکہ میں شکست خوردہ ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ فریق مخالف کو مشتعل کر کے حقائق کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹادیں، اگر ہم ایسی باتوں پر بے برداشت ہو جائیں، تو یہ ان ہی کا تعاون اور ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل ہوگی؛ اس لئے ہمیں پوری سمجھ داری اور دانش مندی سے کام لینا چاہئے، علم واستدلال کی زبان میں ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینا چاہئے اور واضح کر دینا چاہئے کہ نہ ہم اپنے مذہب کے لئے ایسی باتوں کو گوارا کر سکتے ہیں اور نہ ہم دوسرے مذاہب کے بارے میں ایسا مطالبہ کرتے ہیں، ہم تمام مذاہب کے احترام اور بقاءِ باہم کے اُصول پر کاربند ہیں اور رہیں گے۔

(۲/اگست ۲۰۰۲ء)

قرآن مجید اور دہشت گردی

قرآن مجید جس عہد اور جس سماج میں نازل ہوا، اس کا سب سے تکلیف دِہ پہلو لاقانونیت، بدامنی اور غارتگری تھا، لاقانونیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، عرب کے گرد و پیش جو حکومتیں قائم تھیں، وہ نسلی برتری اور کہتری پر یقین رکھتی تھیں اور جو انسانی سماج پیدائشی عظمت اور تحقیر کے تصور پر قائم ہو ظاہر ہے کہ وہاں عدل وانصاف کا قائم ہونا ممکن نہیں ایسے ماحول میں اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا، اس کتاب میں جو سب سے پہلی آیت نازلِ ہوئی اس میں علم اور قلم کی اہمیت کو بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ تمام انسان کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے، اس میں انسانی وحدت کی طرف اشارہ تھا، علم انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے اور انسانی مساوات کے تصور سے عدل کا جذبہ اُبھرتا ہے اور تکریمِ انسانیت کا عقیدہ پروان چڑھتا ہے، اسی لئے ایک ایسا ملک جو امن وامان سے یکسر محروم تھا اور جہاں ظلم و جور اور دہشت گردی نے قانون کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اسلام نے اس کو امن و سلامتی سے ہمکنار کیا، انسانی اُخوت کا سبق پڑھایا اور رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ایک خاتون تنہا اونٹنی پر سوار ہو کر صنعاء یمن سے شام تک کا سفر کرے گی۔

اس نے اپنے متبعین کے لئے دو ایسی تعبیرات اختیار کیں جن کے معنی ہی ''امن وامان'' اور ''صلح و سلامتی'' کے ہیں، یعنی ''مومن اور مسلم'' مومن کے معنی امن دینے والے کے ہے اور مسلم کے معنی صلح اور دوسروں کی سلامتی کا لحاظ رکھنے والے کے، اس کتاب کی ابتداء ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہوئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ، اور آپ ﷺ کے مہربان ہونے کا ذکر ہے اور پہلی سورت کی پہلی آیت میں ہی خدا کو ''تمام کائنات کا رب'' قرار دیا گیا ہے، رب

کا لفظ بے پناہ شفقت اور ممتا کو ظاہر کرتا ہے اور تمام عالم کا رب کہہ کر پوری کائنات کو رشتۂ اُخوت میں باندھ دیا گیا ہے اور ایسی آفاقیت کا تصور دیا گیا ہے کہ جس میں پوری انسانیت ایک کنبہ اور ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے، غرض کہ قرآن مجید امن وامان، انسانی اُخوت اور آفاقیت کا علمبردار ہے؛ لیکن بدقسمتی سے سورج پر تھوکنے کی کوشش کی جارہی ہے اور بعض تنگ نظر حضرات یہ کہنے کی جسارت کر رہے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ نقص ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کے پڑھنے والوں میں دہشت گردی کا رجحان پیدا ہوتا ہے، یہ ایسی بہتان تراشی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس نے سرسری طور بھی قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہوگا وہ ہرگز اس سے متاثر نہیں ہوسکتا، کہ یہ دن کو رات اور برف کو آگ کہنے کے مترادف ہے!

عربی زبان میں دہشت گردی کو ''ارھاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن نے مسلمانوں کو یقیناً اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ان کے پاس ایسی طاقت موجود رہنی چاہئے کہ ان کے دشمنوں کو ظلم وجور کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو اور وہ مرعوب رہیں، اس کو قرآن نے ''قوت مرہبہ'' سے تعبیر کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (الانفال:۶۰)

ان کے لئے جس قدر ممکن ہو طاقت اور گھوڑے تیار کر کے رکھو؛ تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ اور اپنے دشمن اور دوسرے لوگ جنھیں تم نہیں جانتے؛ لیکن اللہ انھیں جانتا ہے، مرعوب رکھ سکو۔

قرآن کے اس بیان سے واضح ہے کہ طاقت دشمنوں کو مرعوب رکھنے اور ان کو ظلم وجور سے باز رکھنے کے لئے ہے، نہ کہ بے قصور لوگوں کو نشانہ بنانے اور تباہی وبربادی پھیلانے کے لئے۔

قرآن کے احکام جہاد سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ وہ بے قصور، کسی بھی غیر مسلم پر

حملہ کرنے اور اس کو ہلاک کر دینے کی اجازت دیتا ہے اور اس کے لئے اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں کفار کو قتل کرنے کا عمومی حکم ہے، یہ محض غلط فہمی ہے، اس آیت کا تعلق مشرکین مکہ سے ہے، وہ مستقل طور پر مسلمانوں سے برسر جنگ تھے اور مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی صلح کی کوششوں کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے؛ چنانچہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں اور جن لوگوں نے ان کو گھر سے بے گھر اور شہر سے شہر بدر نہیں کیا تھا، قرآن ان کے ساتھ حسن سلوک اور عدل واحسان کا حکم دیتا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنة:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک اور انصاف سے نہیں روکتے، جو تم سے دین کے معاملہ میں برسر پیکار نہیں ہیں اور جنھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

دہشت گردی میں بنیادی طور پر اس بات پر توجہ نہیں دی جاتی کہ اصل ظالم کون ہے؟ بلکہ اس کے متعلقین میں جو بھی ہاتھ آ جائے اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اسلام اس کو قطعاً غیر اُصولی اور غیر انسانی حرکت قرار دیا ہے، قرآن نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا بوجھ اور اس کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جا سکتی: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"۔ (الفاطر:۱۸)

قرآن نے ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (المائدۃ:۳۱)

قرآن نے ان اسباب کو بھی روکنے کی کوشش کی ہے جو دہشت گردی کا موجب بنتے ہیں، زیادہ تر دہشت گردی کا سبب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ دوسروں کو جبراً اپنے مذہب وعقیدہ

کا متبع بنانا چاہتے ہیں، عیسائیوں کی مذہبی تاریخ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کردیا کہ دین کے معاملہ میں جبر واکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے: ''لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) اس لئے اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کوئی گروہ دوسروں کے مذہبی مقتداؤں اور پیشواؤں کو بُرا بھلا کہے، کہ اس سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں: ''لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ''۔ (الانعام:۱۰۷)

کسی معاشرہ میں دہشت گردی کے پنپنے کا اصل سبب ظلم وناانصافی ہے، جو گروہ مظلوم ہوتا ہے، اگر وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کر پاتا ہے اور انصاف کے حصول سے محروم رہتا ہے، تو اس میں منتقمانہ جذبات پرورش پاتے ہیں، اور جب وہ دیکھتا ہے کہ قانونی راستے بند ہیں، تو غیر قانونی راستہ اختیار کرلیتا ہے، اس لئے دہشت گردی کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ظلم و جور کا دروازہ بند کیا جائے، اور عدل وانصاف کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ نافذ کیا جائے؛ تاکہ دہشت گردی پر ابھارنے والے عوامل باقی نہ رہیں، اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے اور اس کی بڑی تاکید کی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں: ''اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ '' (النحل:۹۰) قرآن نے تاکید کی ہے کہ کسی قوم سے عداوت بھی تم کو اس کے ساتھ ظلم وناانصافی پر کمربستہ نہ کردے اور جادۂ عدل سے ہٹانے نہ پائے۔ (المائدۃ:۸)

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت شدت کے ساتھ دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے؛ حالاں کہ خود مسلمان ملکی اور عالمی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی حالتِ زار ناقابل بیان ہے، مسلمان اگر اپنے ملک میں بھی خود اپنی خواہش اور مرضی سے اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو تہذیبی تصادم اور شدت پسندی کا نام دے کر مداخلت کی راہ ہموار کی جاتی ہے اور ان سے وہی کچھ کہا جاتا ہے، جو انبیاء کی اقوام ان سے کہا کرتی تھیں، مثلاً حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا :

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا . (الاعراف:۸۸)

حضرت شعیب کی قوم میں سے تکبر پر آمادہ گروہ نے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھ کو اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے شہر سے نکال کر ہی رہیں گے، یا تو تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔

آج ہندوستان میں فرقہ پرستوں کی طرف سے نعرہ لگایا جاتا ہے ''کہاں جائے گا مسلمان؟ پاکستان یا قبرستان!'' حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا، کیا یہ نعرہ اس سے مختلف ہے؟ قریب قریب یہی صورت حال مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے مختلف علاقوں میں ہے، اعداء اسلام اور طاغوتی طاقتیں اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتیں جب تک مسلمان اپنے ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت سے دستبردار نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ اصحاب ایمان کے لئے یہ قطعاً ناقابل قبول ہے، قرآن نے یہود و نصاریٰ کی نفسیات اور اسلام کے تئیں ان کے بغض و عداوت اور مزاج و مذاق کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے :

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ . (البقرۃ:۱۲۰)

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف اصل ناراضگی اسی کی ہے کہ یہ مغرب کی مادر پدر آزاد ثقافت کے سامنے سرنگوں کیوں نہیں ہوتے؟ یہ اخلاقی اقدار اور شرم و حیاء کے علمبردار کیوں بنے پھرتے ہیں؟ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان مشکل حالات میں صبر و استقامت سے کام لیں، اور مغرب و مشرق کی مشترکہ دہشت گردی اور انسانیت سوزی سے خوف زدہ نہ ہوں کہ یہ ایک آندھی ہے جو گذر جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہ کی استقامت کا کیا خوب ذکر فرمایا ہے کہ انھیں جس قدر ڈرایا جاتا اسی قدر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا

جاتا تھا:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا. (آل عمران:۱۷۳)

صحابہ سے لوگوں نے کہا کہ (مخالفین نے) بہت سارے لوگ تمہارے مقابلہ میں جمع کر لئے ہیں، تم ان سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہی ہو گیا۔

ایمان کی علامت یہی ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کی راہ میں جس قدر ابتلائیں اور آزمائشیں آئیں، عداوتوں کے طوفان اٹھیں، مخالفتوں کی لہریں موجزن ہوں، خوف ودہشت کا ماحول پیدا کیا جائے، حوصلہ شکن حالات کا سامنا ہو، اسی قدر ان کی ہمتیں بلند ہوتی جائیں، ان کے حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں اور مخلوق کا خوف ان پر غالب نہ ہونے پائے، اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے تئیں دہشت گردی کا جو پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن جیسی عظیم کتاب کو بھی نشانۂ تنقید بنایا جا رہا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان ہمت ہار جائیں، وہ مغرب کی ریشہ دوانیوں کی سامنے سرنگوں ہو جائیں اور اسلام کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر رہ جائیں، پس ان حالات میں مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا اور صبر واستقامت کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۲۸ر دسمبر ۲۰۰۱ء)

۲۴ آیتیں

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، یہ انسانیت کے لیے ابدی پیغام اور زندہ دستور العمل ہے، یہ بیک وقت دماغ کو بھی مطمئن کرتی ہے اور بربط دل کو بھی چھیڑتی ہے، یہ ایک انقلاب انگیز کتاب ہے، جیسے سورج کی تمازت میں کبھی کمی نہیں آسکتی اور سمندر کی وسعتوں کو کم نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اس کتاب کی اثر انگیزی، اس کی تاثیر، دلوں کو زیروزبر کردینے کی صلاحیت اور فکر ونظر پر چھا جانے کی طاقت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوسکتی، یہ رَواں دَواں زندگی میں انسان کی رہنمائی کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، اس لئے اس کی آب وتاب میں کوئی فرق نہیں آسکتا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، (الحجر: ۹) جو اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن مجید قیامت تک اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہے گا۔

دنیا میں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں، انسانی زندگی نے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، آج کوئی ہندو، بدھسٹ یا عیسائی اپنی تجارت، کاروبار، نظامِ حکومت، طریقۂ عدل وانصاف، ازدواجی زندگی، خاندانی تعلقات، مختلف قوموں کے باہمی روابط اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں اپنی مذہبی کتابوں سے رجوع نہیں کرتا، نہ اپنے مذہبی علماء سے احکام ومسائل معلوم کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ بعض قومیں نحس وبرکت وغیرہ کے سلسلہ میں جو توہمات ہیں، ان کے لیے مذہبی شخصیتوں سے رجوع ہوتے ہیں اور کچھ عبادتی رسوم کو اپنی عبادت گاہوں میں انجام دے لیتے ہیں، عام لوگ ان کتابوں کو نہ پڑھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ کچھ مخصوص لوگ ہی اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے اہل ہیں، اس لیے ان قوموں کی زندگی میں مذہب کا ہمہ گیر تصور نہیں پایا جاتا اور وہ زندگی کے عام مسائل میں اپنی خواہش کے متبع ہیں، نہ کوئی حلال ہے نہ حرام، نہ جائز، نہ ناجائز اور نہ مکروہ نہ مستحب۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اُمت مسلمہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور کوتاہ عملیوں کے باوجود آج بھی اپنے مذہب سے مربوط ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بیسیوں دارالافتاء ہیں، جن کے پاس روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں فتاویٰ کی ڈاک آتی ہے اور لوگ زندگی کے نوع بنوع مسائل کے بارے میں حکمِ شرعی دریافت کرتے ہیں، کسی جبر و دباؤ کے بغیر اپنے سینکڑوں نزاعات کو شرعی پنچایت اور دارالقضاء ہی میں لے جاتے ہیں اور مسلمان چاہے زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گذارے، اسی چیز نے اسے الحاد و بد دینی کے اس طوفان میں بھی دین سے مربوط رکھا ہے اور وہ اس لادینی ثقافت کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہیں، جس کے سامنے آج تمام قومیں اپنی شکست تسلیم کر چکی ہیں، یہ سب قرآن مجید کا فیض ہے، یہ وہ چیز ہے جس نے حق اور سچائی کے دشمنوں کو قرآن مجید کے خلاف کھڑا کر دیا ہے؛ لیکن یہ بات کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ حذف کر دیا جائے، کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ مطالبہ تو خود نزولِ قرآن کے زمانہ میں بھی رہا؛ لیکن جیسے ان معاندین کی خواہش ناکام و نامراد ہوئی، آج جو لوگ قرآن مجید کے خلاف زبان کھول کر سورج پر تھوکنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی اس بے جا خواہش اور مطالبہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔

ہندوستان میں حقیقت پسند ہندو علماء نے ہمیشہ قرآن مجید کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا ہے، گاندھی جی اور ونوبا بھاوے مذہبی شخصیت کے حامل تھے، گاندھی جی قرآن مجید سے بہت متاثر تھے اور اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے، یہی حال ونوبا جی کا تھا، انھوں نے تو قرآن کی منتخب آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی ''روح القرآن'' کے نام سے مرتب کی ہے، ہندوستان میں طباعت و اشاعت کی موجودہ سہولتوں اور پریس کی کثرت کے دور سے پہلے قرآن مجید کی طباعت میں سب سے نمایاں کام 'منشی نولکشور لکھنو' کا ہے، وہ صحت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قرآن مجید طبع کیا کرتے تھے اور طباعت کے لئے سنگی تختیاں تیار کرتے تھے، نیز انھیں احتراماً دوسری زیر طباعت کتابوں اور ان کی تختیوں سے اوپر رکھا کرتے تھے، یہ ان

ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنھوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

قرآن مجید کے بارے میں ہندو علماء کے تأثرات

قرآن مجید کے بارے میں بابا بھوپندر ناتھ باسو فرماتے ہیں :

> تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاک روب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندانی مسلمانوں کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

بابو بپن چندر پال کہتے ہیں :

> قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات، پات کا امتیاز موجود نہیں ہے، نہ کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

مشہور قائد مسز سروجنی نائیڈو کا یہ بیان کس قدر حقیقت پسندانہ ہے :

> قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے، دنیا اس کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کا ارشاد ہے :

> مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تأمل نہیں ہے۔(سہ روزہ دعوت: ۱۳ رمئی ۱۹۸۸ء، ص:۷۶)

قرآن مجید کے ہندو مترجمین وناشرین

قرآن مجید سے اسی تعلق اور عقیدت کا اثر ہے کہ مختلف ہندو اہل علم نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یا قرآن کی منتخب آیات کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، ونوبا بھاوے کی ''روح القرآن'' کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہندی کے مشہور شاعر بھارتیندو ہرش چندر نے بھی قرآن کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو رسالہ ''ہرش چندر'' میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا

تھا، لکھنؤ کے نند کمار اوستھی نے بھی قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، آریہ سماجیوں کی طرف سے بھی وید کے منتروں سے تقابل کرتے ہوئے قرآنی آیات کا انتخاب مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کے سابق کیبنٹ سکریٹری ونود چند پانڈے نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا ہے، انھیں اعتراف ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ وحی ہے، سردار جگجوت سنگھ کی فرمائش پر کنہیا لال لکھداری نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، جو چار سو پندرہ صفحات پر دھرم سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا، اس ترجمہ میں شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

بنگال کے ایک ہندو عالم گریش چندر سنگھ نے ۱۸۸۱ء میں قرآن مجید کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا، ۱۹۲۶ء میں بنگلہ بولنے والے مسلم علماء نے اس ترجمہ کو مستند قرار دیا، پنڈت کیلاش چندر برہست نے جناب امام الدین رام نگری کے ساتھ مل کر مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کے ترجمہ کو ہندی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں رامپور سے شائع ہوا اور اس کے صرف دو ہی پارے منظر عام پر آسکے، جناب پران ناتھ نے اپنی گجراتی تالیف ''قلزم سروپ'' میں قرآن اور وید کے متن کا انتخاب پیش کیا ہے، دھن پرکاش ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی نے قرآن مجید کا منظوم ہندی ترجمہ ''پوتر قرآن درشن'' کے نام سے کیا ہے، جسے ''الوک پرکاش'' نے شائع کیا ہے اور فروری ۲۰۰۰ء کے کتابی میلہ میں اسے نمائش وفروخت کے لئے بھی رکھا گیا تھا، شیخ محمد یوسف کا ہندی ترجمہ قرآن جس شخصیت نے شائع کیا، وہ ہیں پنڈت دولت رام شرما، یہ ترجمہ اسٹار پریس بازار ہال امرتسر سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔ (ملخص از دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کا حصہ، ص: ۱۵۸-۱۵۵)

یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنھوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

اب یہ بے چارے وی، ایچ، پی والے جو سیاست کے لیے مذہب اور دھرم کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں اور اپنی زہر آلود تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ انسانوں کو بانٹنے اور دلوں کو تقسیم کرنے کا کام کر رہے ہیں، ان ہی لوگوں نے سیدھے سادھے، سادہ لوح ہندو بھائیوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بونے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد پیدا کرنے کی غرض

سے قرآن مجید کی ۲۴ آیتوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ قرآن کریم غیر مسلموں کو قتل کرنے، ان کا دشمن ہونے اور انھیں دوست نہ بنانے کی تعلیم دیتا ہے، اس لئے مسلمان کبھی بھی غیر مسلموں کے حق میں مہربان اور رحم دل نہیں ہوسکتے۔

اس پروپگنڈے کی حقیقت یہ ہے کہ انھیں آگے پیچھے کے مضمون سے کاٹ کر یا جن غیر مسلموں سے عہد نبوت کے مسلمانوں کا سابقہ تھا، ان کو نظر انداز کرکے اور ان آیات کو ان کے نازل ہونے کے پس منظر کو بیان کئے بغیر پیش کیا جارہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی بھی بات کو اگر اس کے پس منظر سے ہٹادیا جائے، یا اس کو آگے یا پیچھے کی عبارتوں سے کاٹ کر پیش کیا جائے، تو اچھی سے اچھی بات کا بھی غلط مفہوم نکالا جاسکتا ہے، اسی پس منظر میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان آیات کے بارے میں صحیح صورت حال پیش کردی جائے۔

بحیثیت مجموعی یہ آیات تین طرح کی ہیں: دس آیات جہاد سے متعلق ہیں، چھ آیات غیر مسلموں سے تعلق و دوستی رکھنے نہ رکھنے اور ان کے دوستی کے لائق ہونے اور نہ ہونے سے متعلق ہیں اور آٹھ آیتیں غیر مسلموں پر عذاب سے متعلق ہیں، جن آیات کو زیادہ تر پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ جہاد سے متعلق آیتیں ہیں، اس لئے پہلے ان ہی آیات پر گفتگو کی جاتی ہے :

جہاد سے متعلق آیات

(۱) وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا. (النساء:۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کفر کررہے ہیں تم بھی کفر کرو؛ تاکہ تم ایک جیسے ہو جاؤ، تو تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ، جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کرجائیں، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں، تو انھیں جہاں کہیں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست

اور مددگار نہ بناؤ۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچائی تھی ، یہاں تک کہ ان کے قتل کے دَر پے ہو گئے تو مسلمانوں کو مجبور ہو کر ترکِ وطن کرنا پڑا اور انھوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی ، پھر یہاں بھی مسلمانوں کا چین وسکون انھیں پسند نہیں آیا اور انھوں نے بار بار مدینہ پر اپنی یلغار جاری رکھی ، ظاہر ہے جو لوگ مسلمانوں کی جان کے در پے ہیں ، تو اپنی مدافعت کے طور پر وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل تھا ، کہ وہ ان کی زیادتیوں کا جواب دیں ، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے تبدیلیٔ مذہب اور ارتداد سے کم کسی اور بات پر رضا مند نہیں تھے ، جو ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

پھر اس سے اگلی آیات کو دیکھا جائے تو بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۔ (النساء:۹۰)

سوائے ایسے لوگوں کے جو ان سے جا ملیں ، جن کے اور تمہارے درمیان عہد (معاہدۂ امن) ہو ، یا وہ تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں نہ اپنی قوم سے ؛ حالاں کہ اگر اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کر دیتے ، پھر وہ تم لوگوں سے جنگ کرتے ، تو اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں جنگ نہ کریں اور صلح پیش کریں ، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

دیکھئے ! اس آیت نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اس سے پہلی آیت میں قتال کا حکم ان

لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں ، جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں ، یا مسلمانوں کے حلیف کسی غیر مسلم گروہ کے حلیف ہوں، یا غیر جانبدار ہوں، نہ مسلمانوں سے جنگ چاہتے ہوں اور نہ ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کی حالت میں ہوں، تو ان تینوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کے لیے قتال درست نہیں ؛ بلکہ قرآن نے صاف طریقہ پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ صلح و امن کا راستہ اختیار کریں، مسلمانوں کو ضرور ہی ان کے اس رویہ کا جواب صلح اور امن سے دینا چاہئے اور کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہئے۔

دوسری آیت

(۲) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ . (انفال:۶۵)

اے نبی! ایمان والوں کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دوسو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو ایک ہزار منکرین پر بھاری رہیں گے؛ کیوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی ؛ بلکہ یہ پوری سورت ہی زیادہ تر غزوۂ بدر کے واقعات اور اس واقعہ سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل ہے، غزوۂ بدر ان حالات میں ہوئی کہ مسلمان ظلماً مکہ سے نکال دیئے گئے تھے، بہت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قریب ترین اعزہ کو جبراً مکہ میں روک لیا گیا تھا، اہل مکہ کے مقابلہ مسلمان تعداد میں کم تھے، اسلحہ اور دوسرے وسائل کے اعتبار سے بھی مکہ کے حملہ آوروں کا پلڑہ بھاری تھا، اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی کمی پر نظر نہ رکھیں ؛ بلکہ اپنے مقصد پر نگاہ رکھیں، کہ مکہ کے لوگ تو بن سمجھے بوجھے محض اکسانے پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ایک خاص مشن کے تحت ہے، اس لیے اگر تم کم بھی ہو تو زیادہ لوگوں پر غالب آسکتے ہو، اب غور

کیجئے، کہ اس میں کن غیر مسلموں سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے، ان غیر مسلموں کے خلاف جو نہ تھمنے والے تلاطم کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے اور ان کے جان و مال کے درپے تھے، اگر مسلمانوں کی طرف سے پہل ہوتی، تو یہ جنگ بدر کے بجائے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) مکہ کے قریب ہوئی ہوتی، تو کیا حملہ آوروں کے لئے مقابلہ پر ابھارنا کوئی ناواجبی بات ہے؟ اگر ہمارے ملک پر دشمن حملہ آور ہوں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہوگا کہ ہم اہل وطن کو ان سے مقابلہ کی ترغیب دیں؟ غور کیجئے کہ ظلم کرنا مذموم ہے یا ظلم کا جواب دینا، یہ ایسی بات ہے جسے معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔

تیسری آیت

(۳) فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (التوبۃ:۵)

جب حرمت والے مہینے گذر جائیں، تو تم ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ، قتل کرو، انھیں پکڑو، گھیرو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں، تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

اس آیت کے مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ان اہل مکہ کے بارے میں ہے جو حرام مہینوں کا احترام کرتے تھے، جو بہت سے مسلمانوں کے قاتل تھے، بہت سے مہاجرین کے رشتہ داروں کو انھوں نے روک رکھا تھا، جہاں کہیں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا، اسے گرفتار کر لیتے تھے اور اسے قتل کر کے یا قاتلوں کے ہاتھ بیچ کر ہی دَم لیتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت خبیب ﷜ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جنھیں گرفتار کر کے اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کیا گیا

اور انھوں نے غزوۂ بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے مورث کے بدلہ نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ انھیں شہید کر دیا، انھیں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم بھی ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکتے ہو۔

اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیتیں آرہی ہیں، اگر انھیں پڑھ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مشرکین کا ایک خاص گروہ مراد ہے نہ کہ تمام مشرکین؛ چنانچہ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

> أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ . (التوبۃ:۱۳)
>
> کیا تم ایسے لوگوں سے قتال نہیں کروگے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دیئے، رسول کو جلاوطن کرنے کی ٹھان لی اور انھوں نے تمہارے مقابلہ میں خود ہی پہل کی ہے؟ کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

اس آیت نے بات صاف کر دی کہ پہلے جن مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، مسلمانوں کو وطن سے بے وطن کرنے پر کمربستہ رہے اور نقصان پہنچانے اور حملہ کرنے میں پہل کی؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے اوپر (آیت نمبر:۵) میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، ان کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ اس سے یہی عہد شکنی کرنے والے مشرکین مراد ہیں: ''المراد من المشركين الناكثون'' (روح المعانی:۶/۴۷) — پھر سورۂ توبہ کی اس دوسری آیت (آیت نمبر:۱۳) نے اس بات کو واضح کر دیا کہ قرآن نے بطور جواب اور مدافعت کے مشرکین سے قتال کی بات کہی ہے؛ کیوں کہ پہل ان ہی کی طرف سے تھی، یہ آیت اور آگے آنے والی آیت بھی دراصل فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، مشرکین مکہ نے ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے اولاً تو مسلمانوں کو

ان کے وطن 'مکہ' سے نکالا، پھر تین جنگیں ان پر مسلط کیں، ہجرت کے پہلے سال غزوۂ بدر، دوسرے سال غزوۂ احداور پانچویں سال غزوۂ خندق کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ سے بھی اُجاڑ دیا جائے، پھر ہجرت کے چھٹے سال اہل مکہ ہی کی شرائط پر صلح حدیبیہ ہوئی اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر انھوں نے اس صلح کی بھی دھجی اُڑا دی، اب بتایئے کہ ایسے لوگوں کے خلاف اگر مزاحمت کی دعوت نہ دی جائے تو کیا ان کے راستہ میں پھولوں کی سیج بچھانے کو کہا جائے گا؟

چوتھی آیت

(۴) قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ. (التوبۃ:۱۴)

ان سے قتال کرو، اللہ تعالیٰ انھیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا، رسوا کرے گا، تمہاری ان کے مقابلہ میں مدد کرے گا اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔

یہ سورۂ توبہ کی ۱۴ویں آیت ہے کہ جس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر آیا ہے، جنھوں نے عہد شکنی کی تھی اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کے مرتکب ہوئے تھے، انھیں کے بارے میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور تمہاری مدد کرے گا اور اہل مکہ کی زیادتی کی وجہ سے تمھیں جو دُکھ پہنچا ہے، اس کی تلافی کرے گا اور ظلم پر آدمی کا آزردہ خاطر ہونا ایک فطری چیز ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں تمہارے لئے تسکین خاطر کا سامان کرے گا، ظاہر ہے کہ اس آیت میں ظالموں سے بدلہ لینے کا ذکر ہے، جو عین مطابق انصاف ہے۔

مشہور مفسر امام مجاہدؒ نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کا تعلق بنوبکر اور بنوخزاعہ کی لڑائی سے ہے، یہ دونوں ہی قبیلے مشرک تھے؛ لیکن فرق یہ تھا کہ بنوبکر اہل مکہ کے حلیف تھے اور بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے؛ جب حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ناجنگ معاہدہ ہوا،

تو اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے حلیف قبائل پر بھی اس کا اطلاق ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی زیادتی نہیں کریں گے؛ لیکن ہوا یوں کہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کردیا، یہاں تک کہ حرمِ مکہ میں جہاں اسلام سے پہلے بھی لوگ اپنے جانی دشمنوں اور اعزہ واقرباء کے قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، بنوخزاعہ کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس عہد شکنی میں اہل مکہ بھی پوری طرح شریک وسہیم رہے، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے ذریعہ تم ان بدعہدی کرنے والوں پر غالب ہوگے اور ان کے ظلم وزیادتی کی وجہ سے فطری طور پر جو آتش انتقام تمہارے سینہ میں بھڑک رہی ہے، اللہ اسے بجھائیں گے اور تمہارے دلوں کو ٹھنڈا کریں گے۔ (دیکھئے تفسیر قرطبی: ۸/۸۷،۸۶)

اب غور کیجئے! کہ جن لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو اور خود ہی حملہ کرنے میں پہل بھی کی ہو، کیا ان کے خلاف جوابی کارروائی کرنا ناانصافی کی بات ہے اور کیا قرآن کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ تم اپنا اور اپنے حلیفوں کا قتل عام دیکھتے رہو، مگر ہاتھ پر ہاتھ دیئے بیٹھے رہو، اپنی طرف سے کوئی جواب نہ دو؟؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے جو ظالموں کے مقابلہ خدا کی طرف سے مظلوموں کی مدد بات کہی ہے، یہ کوئی عجوبہ نہیں؛ بلکہ ہر مذہب میں حق اور سچائی پر قائم رہنے والوں کو اہل باطل اور ظالموں کے مقابلہ خداوندی فتح ونصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے، مثلاً رگوید میں خدا سے اس طرح دُعائیں کی جاتی ہیں:

- اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلادے، جن کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔ (۵:۱۲/۱)
- تو آریوں اور دسیوں کے درمیان امتیاز کر جو اُدھرمی ہیں، ان کو سزا دے اور انھیں اس کے حوالہ کردے جس کی گھاس (دیوتاؤں کے نذرانہ کے لئے) کی رکھی ہے۔ (۸:۵۱/۱)
- پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سردھروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی

حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔ (۱۱:۵۴/۱)

بائبل نے مشرکین کی نسبت سے جو لب ولہجہ اختیار کیا ہے، اسے ان اقتباسات میں دیکھا جا سکتا ہے :

> بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہہ! جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آبسو؛ کیوں کہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو۔ (۳۳:۵۰-۵۳)

> اور جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالہ کر دے تو انھیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو کوئی ان سے عہد کیجیو اور نہ ان پر رحم کریو، تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو ڈھا دو، ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔ (۷:۲-۵)

غرض کہ ظالموں کے مقابلہ مظلوموں کے ساتھ اللہ کی مدد ہونا اور ظلم کو روکنے کے لئے ظالموں کا پنجہ تھامنا ایک ایسی بات ہے، جو تمام مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے؛ کیوں کہ اگر خدا بھی ظالموں ہی کا طرفدار ہو تو پھر کون سا ایوانِ انصاف ہوگا جہاں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملے گی اور مظلوموں کی تسکین خاطر کا سامان ہوگا؟

پانچویں آیت

(۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ . (التوبۃ:۱۲۳)

اے ایمان والو! تمہارے آس پاس جو کفار ہیں، ان سے جنگ کرو اور وہ تمہارے

اندر سختی (مضبوطی) پائیں اور جان لو کہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ان کافروں سے جنگ کے لئے کہا گیا ہے جو ان کے قرب وجوار میں تھے، یعنی اہل مکہ اور ان کے حلیف؛ کیوں کہ یہی مدینہ کے قریب کافروں کی آبادیاں تھیں اور اہل مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ ظاہر ہے، اگر مطلقاً کافروں کے مارنے کا حکم ہوتا تو قریب و دور کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مدینہ، یمن اور شام کے درمیان رہگذر کا درجہ رکھتا تھا اور مختلف غیر مسلم قافلے مدینہ کے قرب وجوار سے گذرتے رہتے تھے، اگر یہ حکم مطلقاً ان سے متعلق ہوتا تو دور کے غیر مسلموں پر بھی حملہ کرنے کو کہا جاتا؛ لیکن یہاں قرآن نے ایسا حکم نہ دیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کا منشاء ان مشرکین سے جنگ کرنا تھا جو بار بار مسلمانوں پر یلغار کرتے رہتے تھے، نہ رشتہ کا پاس ولحاظ کرتے تھے، نہ صلح اور معاہدہ کا لحاظ؛ چنانچہ ابن زیدؒ نے یہی کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب تھے: ''المراد بهذه الآية وقت نزولها العرب''. (تفسیر قرطبی:۸/۲۹۷)

پھر اس آیت میں جو ''غلظۃ'' کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی سختی کے بھی آتے ہیں اور طاقت ومضبوطی کے بھی، یہاں اصل میں یہی طاقت ومضبوطی کا معنی مراد ہے: ''اى شدة وقوة وحمية'' (حوالہ سابق: ۲۸۹) پس مقصد یہ ہے کہ جو مشرکین تم سے برسر جنگ ہیں وہ تم کو طاقتور محسوس کریں، مرعوب رہیں اور تم کو روند جانے کی جرأت نہ کریں، ظاہر ہے کہ کسی بھی قوم کو یقیناً دوسروں پر تو ظلم نہیں کرنا چاہئے؛ لیکن اپنے آپ کو ایسا طاقتور ضرور رکھنا چاہئے کہ دوسرے اس کو لقمۂ تر نہ سمجھ لیں، یہ بالکل معقول اور قرینۂ انصاف ہے، مثلاً ہم ہندوستان کے رہنے والے اپنے دلیش کے بارے میں جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم دوسروں پر زیادتی تو نہیں کریں گے؛ لیکن ہم اپنے آپ کو یقیناً ایسا خود مکتفی بنا کر رکھیں گے کہ کسی کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہو، اگر ہم ایسا کہیں تو کیا یہ کوئی غلط بات ہوگی؟

چھٹی آیت

(٦) إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ

لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۔ (التوبہ:۱۱۱)

بے شک اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان و مال اس کے بدلہ خرید لیا ہے کہ ان کے لئے جنت ہے، وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں، تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں، اسی پر سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی معاملت پر جو تم نے کی ہے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے، اس پر (ہماری طرف سے) سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی معاملت پر جو تم نے کی ہے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ جو مسلمان ظالموں کے خلاف سر ہتھیلی پر لے کر نکل آئیں اور اس راہ میں اپنی جان و مال کی بھی فکر نہ کریں، ان کو اللہ جنت سے نوازیں گے۔

قرآن کے اس ارشاد میں کون سی بات خلاف انصاف ہے؟ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اپنے دیش کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہئے، ہندو مذہب کی تاریخ میں گیتا نے جس جنگ کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ، اس میں کرشن جی، ارجن کو یہی صلاح دیتے ہیں کہ وہ اسے حق و باطل کی جنگ سمجھ کر کوروؤں کے خلاف صف آرا ہوں اور اس پر پانڈوؤں کے بادشاہ ارجن سے خدا کی مدد کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں منوجی کی ہدایات کی خاص اہمیت ہے، ان کا بیان ہے :

روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش سے

اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے وہ
مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں۔(۸۹/۷)

دیکھا آپ نے! قرآن نے تو اللہ کے راستہ میں جوابی جنگ پر جنت کا وعدہ کیا ہے؛ لیکن منو جی محض دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے اور ملک گیری کی غرض سے جنگ کرنے والوں کو بھی جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، قرآن کے اس ارشاد پر تو داد دینی چاہئے، کہ اس نے ظالموں کے مقابلہ خود سپردگی کے بجائے، آخری حد تک جرأت وحوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی ہے، کہ اگر مظلوموں میں یہ حوصلہ وہمت اور جوش وجذبہ نہ ہو، تو ظالموں کا پنجۂ استبداد سخت سے سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور دنیا فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔

ساتویں آیت

(۷) مَلْعُونِيْنَ ، أَيْنَمَا ثُقِفُوْا أُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلاً . (الاحزاب:۶۱)

پھٹکارے ہوئے، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑ لئے جائیں گے اور ضرور قتل کردیے جائیں گے۔

یہ بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو وی، ایچ، پی نے قرآن مجید اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کا عنوان بنایا ہے، اس آیت کا اصل منشاء کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے اس سے پہلی اور بعد کی آیت کے ساتھ اس کا ترجمہ دیکھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

لَئِـن لَّمْ يَنْتَـهِ الْمُـنَافِقُوْنَ وَالَّـذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِـهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُوْنَ فِيْ الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَا إِلَّا قَلِيْلاً . (الاحزاب:۶۰)

منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور جو لوگ مدینہ میں افواہ اُڑاتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے تمہیں اُٹھائیں گے، پھر وہ اس شہر میں آپ کے ساتھ کچھ ہی دنوں رہ سکیں گے۔

مَلْعُوْنِیْنَ ، اَیْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلاً ۔ (الاحزاب:۶۱)

ایسے لوگوں پر پھٹکار ہے، یہ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً ۔ (الاحزاب:۶۲)

ان سے پہلے مجرمین کے لئے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور تم اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

یہ آیات بلکہ تقریباً یہ پوری سورت بنیادی طور پر پانچ ہجری کے واقعات، غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنوقریظہ سے متعلق ہے، غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے پڑوسیوں نے ان کے ساتھ ناقابل عفو دغا سے کام لیا تھا، مسلمانوں کا یہودیوں سے یہ معاہدہ تھا کہ مدینہ پر جب بھی کوئی حملہ ہوگا تو ہم لوگ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے، صورتِ حال یہ تھی کہ اہل مکہ نے اس جنگ میں بلا کسی اشتعال اور سبب کے نہ صرف خود حملہ کیا؛ بلکہ اپنے دوسرے حلیف قبائل کو بھی لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے، افرادی وسائل اور اسلحہ کے اعتبار سے مظلوم مسلمانوں اور حملہ آوروں کے درمیان اتنا فرق تھا کہ مسلمان جنگی تدبیر کے طور پر خندقیں کھودنے پر مجبور ہو گئے، اس موقع سے یہود مسلمانوں کی مدد تو کیا کرتے اور حسب معاہدہ مدینہ کی حفاظت میں کیا حصہ لیتے کہ وہ غیر جانبدار بھی نہ رہ سکے اور ان مشرکین کے ساتھ ہو لئے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے؛ لیکن ان کی ساری ہمدردیاں مسلمانوں کے دشمنوں سے تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا ایمان و یقین اور حوصلہ و ہمت ہی تھی، یہ طرح طرح کی افواہیں اُڑا کر مسلمانوں کو خوف میں مبتلا کرنا چاہتے تھے؛ تا کہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور یہ نفسیاتی طور پر کمزور ہو جائیں، یہی دونوں طبقے ہیں جن کو ''منافقین'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے کے درپے بھی ہوتے تھے اور شریف مسلمان خواتین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اُڑایا کرتے تھے، ایسی

افواہوں سے انسان نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی گروہوں کے بارے میں قرآن مجید نے کہا کہ ان کا ایسے پڑوس اور بغلی دشمنوں کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں؛ کیوں کہ دوست نما دشمن انسان کے لئے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، کوئی صاحب انصاف دیکھے کہ جو لوگ بظاہر کسی قوم کے ساتھ رہ کر یا کسی ملک کے شہری بن کر اسی قوم و ملک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان کے دشمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں اور برے وقتوں میں سارے عہد و پیماں کو فراموش کر کے دشمنوں کے دوش بدوش کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا قتل اور پھانسی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟؟

پھر قرآن مجید نے ان پر پھٹکار بھیجتے ہوئے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ان پر ہلہ بول دیں؛ حالاں کہ اگر قرآن نے ایسا کہا ہوتا تو بے جا نہیں ہوتا؛ لیکن یہاں حکم دینے کے بجائے صرف پیشین گوئی کی گئی ہے اور بار بار بے وفائی کرنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہوئے انتباہ دیا گیا ہے، کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ان کا انجام دنیا میں بھی ہلاکت و بربادی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی سنت یہی رہی ہے، یہ تحمل و بردباری قابل لحاظ ہے، اگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہوتا کہ تم کوئی مہلت دیے بغیر ان بغلی دشمنوں کا قلع قمع کردو، تب بھی یہ کوئی خلاف انصاف بات نہیں ہوتی؛ لیکن ایسی بدعہدیوں اور جفاشعاریوں کے باوجود سنبھلنے کا مزید موقع دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو قتال کا حکم دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی سنت بیان کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وی، ایچ، پی کے لوگ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ہم لوگ اس ملک کے شہری ہیں اور اس زمین سے محبت رکھتے ہیں، اگر اس ملک میں رہنے والے اور اس سے ہر طرح کا فائدہ اُٹھانے والے دشمن ملکوں کے ساتھ مل کر ملک کے خلاف سازشیں تیار کریں، جاسوسی کریں اور دشمنوں کے ساتھ جا ملیں تو آخر ان کی کیا سزا ہوگی؟ کیا انھیں گرفتار کرنا یا انھیں سزائے موت دینا خلاف انصاف امر ہوگا؟ اور کیا آج دنیا کے مہذب قوانین میں ایسے شخص کے لئے بعینہٖ یہی سزا نہیں رکھی گئی ہے؟؟

کیا بہتر ہو کہ جناب اشوک سنگھل صاحب ان کلمات کو دیکھیں جو ہندو مذہبی کتابوں

میں مخالفین اور دشمنوں کے بارے میں ہیں، بطورِ نمونہ اتھروید کے چند منتر یہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں :

- ❖ تمہاری گردنیں توڑ دے اے پشاچو! اور تمہاری پسلیاں چور چور کردے، اے یاتو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ رہیں، اے متراوارونا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے؛ بلکہ وہ سب جو پھٹ کر اکٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ (۲:۳۲:۶)
- ❖ ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بے کار کردیں، اور اس طرح اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔ (۳:۶۶:۶)
- ❖ یاتو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لئے اٹھیں توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انھیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضاء کو تین ٹکڑے کردے۔ (۸:۳:۶-۷-۱۰)
- ❖ اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کردے، اے دیوتا! آ جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں، انھیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کردے، جلا ڈال، ذبح کردے، ہمارے پاس دفع کر اور ان بندۂ شکم راکشسوں کو ٹکرے ٹکرے کردے۔ (۳:۴:۱، رگ وید ۱:۸۷:۵:۱)

یہ محض بطورِ نمونہ چند مثالیں دی گئی ہیں، ورنہ دنیا میں جتنے مذاہب موجود ہیں، ان کے صحیفے ـــــ (اس سے قطع نظر کہ وہ تحریف و تبدیلی سے محفوظ ہوں یا تحریف کا شکار ہو چکے ہوں) ـــــ دشمنانِ حق کے خلاف جہاد کی ترغیب کی تعلیمات سے بھری پڑی ہیں؛ لیکن قرآن مجید کا منشاء بہرحال یہ نہیں ہے کہ جو غیر مسلم سامنے آئے مسلمان اسے تہہ تیغ کردیں؛ بلکہ ان آیات میں وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار اور ان کو نیست و نابود کردینے کے درپے تھے۔

آٹھویں آیت

(۸) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۔ (التحریم:۹)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ انتہائی بدترین ٹھکانہ ہے۔

ان آیات کا پس منظر بھی وہی ہے جس کا پہلے بار بار ذکر آچکا ہے، دراصل اسلام میں غیر مسلموں کے تین گروہ کئے گئے ہیں: ایک وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں ہوں، دوسرے وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ "بقائے باہم" کے معاہدہ کے تحت رہتے ہوں، جیسا کہ آج کے جمہوری ممالک ہیں، پہلے گروہ کو "ذمی" اور دوسرے کو "معاہد" کہتے ہیں، ان دونوں کی جان و مال کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانا ناجائز اور سخت گناہ ہے، تیسرے قسم کے وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں، ان سے قتال کا حکم ہے اور یہ آیات انھیں کے سلسلہ میں ہے — اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جب آپ پر کوئی شخص حملہ کرے تو آپ اپنی مدافعت کریں، تمام مذاہب اور قوانین میں انسان کو اپنی مدافعت اور حملہ آوروں کے خلاف اقدام کی اجازت دی گئی ہے، جہاں تک ایسے ظالموں سے جنگ کی ترغیب دینے کی بات ہے تو یہ — جیسا کہ عرض کیا گیا — تمام ہی مذاہب میں موجود ہے۔

کرشن جی کا ہندو مذہب میں جو اہم مقام ہے عامی سے عامی ہندو بھی اس سے واقف ہے؛ لیکن ارجن — جو کوروں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا — کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے انھوں نے کیسی کیسی ترغیب دی، دنیا اور آخرت کی فلاح دکھائی اور حیات و موت کے فلسفے بیان کیے، گیتا ان رزمیہ مضامین سے پُر ہے۔

مثلاً کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں :

> ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے، جو تیرے لئے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے؛

لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کر کے پاپ جمع کرے گا؛ بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے۔ (۲:۳۳-۳۴)

غور کیجئے! کہ قرآن نے تو حملہ آوروں کی مدافعت کی ترغیب دی ہے؛ لیکن کرشن جی ارجن کو اقدامی حملہ کی ترغیب دیتے ہیں، اور کرشن جی کے دوسرے مواعظ جو گیتا میں مذکور ہیں، ان سے یہ بات جھلکتی ہے کہ اس کا مقصد اصل میں کشور کشائی، غلبہ وعزت اور ملک و مال کا حصول تھا نہ کہ ظالم کے ظلم کا سدِ باب ـــــ تو ایک طرف اس بے مقصد جنگ کی ترغیب کو تو برا نہیں سمجھا جائے اور دوسری طرف جارح کے خلاف اقدام کرنے کو بھی زیادتی سمجھا جائے، یہ کس قدر خلافِ انصاف بات ہے!

مالِ غنیمت سے متعلق دو آیتیں

(۹) فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ . (الانفال:۶۹)

جو مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اسے پاکیزہ اور حلال سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ معاف کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

(۱۰) وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا . (الفتح:۲۰)

اللہ نے تم سے بہت سارے مالِ غنیمت کا وعدہ کیا ہے، جسے تم پاؤ گے فوری طور پر تو فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اُٹھنے سے روک دیئے؛ تا کہ یہ مومنوں کے لئے

ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

دونوں آیتوں میں مالِ غنیمت کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ وی۔ایچ۔پی کے پمفلٹ میں 'لوٹ کے مال' سے کیا گیا ہے اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کا جو بھی مال لوٹ لیں، وہ ان کے لئے جائز اور حلال ہے — جیسا کہ بار بار واضح کیا جاچکا ہے — یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے، یہ آیات ہر غیر مسلم سے متعلق نہیں ہیں؛ بلکہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، کہ اگر مسلمان ان پر فتح پائیں اور جنگجو حضرات قید کر لئے جائیں، تو ان کے مال کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں اُصول یہ بیان کیا گیا کہ وہ مالِ غنیمت ہوگا، عربی زبان میں مشقت کے بغیر کسی چیز کے حاصل ہونے کو "غنم" ("غ" پر پیش یا زبر) کہتے ہیں، (القاموس المحیط: ۱۴۷۶) چوں کہ جنگ کے حاصل ہونے والے مال میں تجارت یا زراعت کی مشقت نہیں اُٹھائی جاتی، اس لئے اس کو "مالِ غنیمت" کہتے ہیں، غنیمت کا ترجمہ "لوٹ کے مال" سے قطعاً درست نہیں، لوٹ تو ایک غیر قانونی طریقہ ہے، اسلام میں یہ حکم ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو تو جہاں تک ممکن ہو باغات اور کھیتیوں کو تاخت و تاراج نہ کیا جائے، مکانات منہدم نہ کئے جائیں، اپنے طور پر شکست خوردہ لوگوں کا مال لے کر استعمال نہیں کیا جائے، ایک غزوہ کے موقع سے فوجیوں نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ذبح کر کے پکانے لگے، رسول اللہ ﷺ نے اس پر بہت خفگی ظاہر فرمائی اور دیگیں الٹوا دیں۔

مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ مفتوحین کے مال حکومت کے پاس جمع کئے جائیں، اس میں سے پانچواں حصہ حکومت کے خزانہ میں محفوظ کر دیا جائے اور اسے رعایا کی بھلائی کے لئے خرچ کیا جائے، یہ رقم مسلمان رعایا پر بھی خرچ ہوگی اور غیر مسلم رعایا پر بھی، اس زمانہ میں فوجیوں کے لئے الگ "تنخواہ" نہیں ہوا کرتی تھی اور ان میں جنگ میں حاصل ہونے والے مال کے بقیہ چار حصے تقسیم کر دیے جاتے تھے، بعض صورتوں میں حکومت اپنے اختیار

تمیزی اور عوامی مصلحت سے کسی مال کو روک بھی سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی مفتوحہ اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی؛ بلکہ بیت المال کی ملکیت میں باقی رکھا، بہر حال تقسیم کے بعد جو مال جس کے حصہ میں پڑے گا، وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مالِ غنیمت ہر غیر مسلم کے مال کو نہیں کہیں گے؛ بلکہ دشمن ملک کے حاصل شدہ مال کو مالِ غنیمت کہا جائے گا اور ایسا بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ میں جو آئے وہ اس پر قابض ہو جائے؛ بلکہ قانونی طریقہ پر ہی کوئی شخص اس مال کا مالک ہو سکتا ہے۔

اب اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مالِ غنیمت کا تصور دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین اور مذاہب میں رہا ہے، اسلام سے پہلے عرب کے قریب ایرانیوں اور رومیوں کی حکومت تھی، ایرانیوں کے یہاں بھی یہی اُصول تھا کہ وہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کر لیتے تھے، رومی تورات کے قانون کو مانتے تھے، یہودی بھی اسی قانون پر عقیدہ رکھتے ہیں، اب دیکھئے کہ بائبل میں مالِ غنیمت کی بابت کیا کہا گیا ہے:

> اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دیوے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی ساری لوٹ اپنے لئے لے اور تو اپنے دشمن کی اسی لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے، کھائیو۔ (استثناء: ۲۰: ۱۲-۱۴)

توریت میں جا بجا مفتوحین کو لوٹنے کا ذکر ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ درازیٔ کلام کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر ''گنتی'' اور ''استثناء'' نامی صحائف کو پڑھا جا سکتا ہے۔

اب خود ہمارے ہندو بھائی ایک نظر اپنی مذہبی کتابوں پر ڈالیں، رگ وید میں ہے:

> اے اگنی! تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امراء بڑی عمریں پائیں، ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں، اے اگنی! ہم تیری مدد

سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔(۴:۱:۷۴:۵،۹)

یجروید میں ہے :

یہ اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام و آسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتے بھگائے چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے۔(۸:۴۴)

سام وید میں ہے :

اے چابک دست بہادرو! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہوکر ہزار دو ہزار مالِ غنیمت لوٹ، اے سرگرم کار مگھون! پرشوق دعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں۔(۲:۴:۱۲:۳)

اتھروید میں کہا گیا ہے :

دشمن خالی ہاتھ ہو جائے، ہم ان کے اعضاء کو مفلوج کر دیں اور اس طرح اے ذوالجلال سپہ سالار اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں سینکڑوں کی طرح سے بانٹ لیں۔(۶:۶۶:۳)

پنڈت کشیم کرن داس ترویدی جی نے اس اشلوک کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے :

فاتح بہادر دشمنوں کو فتح کر کے سپہ سالار کی ہدایت کے مطابق حکومت کا حصہ نکال کر ان کے مال دولت کو تقسیم کر لیں۔

(قرآن مجید پر اعتراضات: ۱۷ بحوالہ ہندی ترجمہ: کشیم کرن داس)

اتھروید میں ایک اور اشلوک اس طرح ہے :

اے سپہ سالار! اپنے بہادروں میں طاقتور شخص کو زرہ پہنا دے اور دشمنوں میں ہرن کی طرح بزدلی پیدا کر دے، دشمن الٹے منھ

چلا جائے، زمین ہماری طرف آجائے۔(۶:۶۷:۳)

''منوسمرتی'' ہندومذہب میں قانون کی کتاب کے درجہ میں ہے اور اسی قانون پر ہندو سماج کی اور نظامِ حکومت کی اساس ہے، منوجی فرماتے ہیں :

رتھ، گھوڑے، ہاتھی، چھتر، مال و دولت، جانور، عورت، گڑ، نمک، مادی چیزیں، تانبا، پیتل وغیرہ چیزیں ان میں جس چیز کو جو جیت کر لاتا ہے، وہ اسی کا ہوتا ہے۔(منوسمرتی:۷:۹۵،۹۶)

آج بھی جب کوئی ملک دوسرے ملک پر فتحیاب ہوتا ہے تو مفتوحہ علاقوں میں جو چیز فاتحین کو ہاتھ آتی ہے، وہ اسے اپنی صوابدید سے تقسیم کرتے یا استعمال کرتے ہیں؛ لیکن اسلام میں یہ ضروری نہیں کہ لامحالہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کر ہی لیا جائے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلم حکومت ان چیزوں کو مفتوحین کی ملکیت میں رہنے دیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ غزوۂ خیبر کے موقع پر کیا تھا۔

جزیہ

(۱۱) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ . (التوبۃ:۲۹)

جو کتاب والے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں ٹھہراتے ہیں اور دین حق کو اختیار نہیں کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ رعیت بن کر جزیہ دینے لگیں۔

اس میں وی، ایچ، پی والوں نے ''حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ''

کا ترجمہ کیا ہے: ''ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دینے لگیں''؛ حالاں کہ یہاں ''صاغرون'' سے مراد فاتحین کے اقتدار کو تسلیم کرنا ہے، یعنی مفتوح فاتح کے مقابلے اپنے رعایا ہونے کی حیثیت کا اعتراف کرلے، جیسا کہ آج بھی ہتھیار ڈالنے والے ممالک اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں، اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں ہے، جیسا کہ وی، ایچ، پی کے پروپیگنڈہ باز ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے، جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لئے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس جزیہ کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالت کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، (دیکھئے: ہدایہ: ۳۱۸/۴) اس لئے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۱۲ ردرہم، متوسط آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۲۴ راور زیادہ آمدنی والوں کے لئے ۴۸ ر درہم، (بیہقی: ۳۲۹/۹، حدیث نمبر: ۱۸۶۸۵، باب الزیادۃ علی الدینار بالصلح) ۱۲ ر درہم ۳ ر تولہ سے کچھ کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ ر درہم ۲۶۵ روپیہ سے کچھ کم وبیش ہے، آپ حضرات غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکوریٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے تو ہم شکر گذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے

اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور نارواداری کا عنوان دیا گیا ہے۔

مشرکین ناپاک ہیں؟

(۱۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ . (التوبۃ:۲۸)

اے ایمان والو! مشرکین تو بے شک ناپاک ہیں، سو اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں اگر تم کو مفلس کا اندیشہ ہو سو اللہ تمہیں اگر چاہے گا، اپنے فضل سے (ان سے) بے نیاز کردے گا، اللہ خوب جاننے والا ہے، بڑا حکمت والا ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں چند نکات ملحوظ رکھے جانے چاہئیں :

(۱) یہاں مشرک سے صرف بت پرست (مورتی پوجک) مراد نہیں ہیں، جیسا کہ وی، ایچ، پی والوں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے؛ بلکہ وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی ذات یا اس کی مخصوص صفات واختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائیں، خواہ وہ بت کا پرستار ہو، یا کسی پیغمبر کو خدا کا درجہ دیتا ہو، یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو خدا کی قدرت واختیار میں ساجھے دار سمجھتا ہو، جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؛ لیکن انھوں نے خدانخواستہ غیر اللہ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہو اور رسول اور اولیاءؒ کی ذات میں وہ اختیارات مانتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، تو وہ بھی مشرک کا مصداق ہیں۔

(۲) مشرکین کو ''ناپاک'' کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، ان کے کپڑے ناپاک ہیں، یا ان کا جھوٹا ناپاک ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، خود ان کی دعوت قبول فرمائی ہے، مسجدِ نبویؐ میں ان کو ٹھہرایا ہے، اپنے بستر پر انھیں بٹھایا

اور سلایا ہے، اگر انھیں جسمانی اعتبار سے ناپاک سمجھا جاتا تو کس طرح آپ ﷺ ایسا عمل فرماتے، اس لئے یہاں عقیدہ اور فکر کی ناپاکی مراد ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ناکام عزائم رکھتا ہے، یا آپ کہتے ہیں کہ فلاں دہشت گردوں کے ناپاک منصوبے ناپاک کردیئے گئے، یہاں ناپاکی سے عمل اور سوچ کی غلط اور مبنی برخطا ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے، گویا اس آیت میں شرک کے نہایت غلط اور خلاف واقعہ عمل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی صرف اسلام ہی نے نہیں کی ہے، بلکہ یہ تمام ہی مذاہب کی اصل تعلیمات ہیں، بائبل میں جگہ جگہ شرک کی مذمت آئی ہے اور ہمارے عیسائی بھائی جو آج تین کے مجموعہ (Trinity) کو خدا مانتے ہیں، ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے بائبل کا کوئی صریح فقرہ موجود نہیں ہے، اس لئے وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ تین مل کر ایک ہی ہیں، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی خدا کے بارے میں بہ تاکید وحدانیت کا ذکر ہے، شرک کی نفی ہے، کہا گیا ہے کہ خدا جسم والا نہیں ہے، وہ تنہا پورے عالم کا احاطہ لئے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''ستیا رتھ پرکاش'' میں بت پرستی کی تردید میں ہندو مذہبی کتابوں کے جو حوالے نقل کئے ہیں، وہ بہت ہی چشم کشا ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل ہندو مذہب توحید ہے نہ کہ شرک، اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ویدوں کے چند حوالے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

- وہ محیط، پاک اور جسم سے خالی ہے۔ (یجروید: ۴۰:۸)
- میں افضل ترین قوت ونعمت کا منبع، سورج کی طرح تمام عالم کو منور کرتا ہوں، میں نہ کبھی مغلوب ہوتا ہوں اور نہ مرتا ہوں، یہ تمام عالم جو نعمتوں کا مخزن ہے اس کا خالق میں ہوں، تم مجھے ہی اس دنیا کا خالق اور مبتدا سمجھو، اے اہل علم! تم نعمت وحشمت کے حصول کے لیے کوشاں رہ کر علم وغیرہ نعمتوں کے لیے مجھ ہی سے التجا کرو، میری رفاقت سے کبھی روگرداں نہ ہو۔ (رگ وید: ۵:۴۸:۱۰)

رگ وید ہی کے یہ ارشادات کس قدر بصیرت مندانہ اور عقیدۂ توحید کے بارے میں واضح ہیں :

❖ اے بنی نوع انسان! میری حقیقی حمد وثنا، راست گوئی ہے، ایسی حمد کرنے والے انسان کو میں ازلی علوم وغیرہ نعمتیں عطا کرتا ہوں ...... اس لئے عالم میں جو اشیاء موجود ہیں، ان کا خالق اور قیوم میں ہوں، اس لئے تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کی عبادت مت کرو اور نہ کسی کو میری جگہ معبود مانو اور جانو۔ (اتھر وید: ۱۰/۴۹/۱:۱)

پنڈت سرسوتی جی نے کینو پنشد (۱:۶) کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

جسے آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا؛ بلکہ آنکھ جس کی قدرت سے دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسے ہی تم خدا سمجھو، آنکھ سے دکھلائی جانے والی جن چیزوں کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ خدا نہیں ہیں۔

ہندو مذہب کی اہم معتبر کتابوں کی عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا، یہی اصل ہندو دھرم ہے، تو مشرکوں کو ناپاک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو ہندو کہے اور اصل مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو یہودی کہے اور اصل یہودی مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو عیسائی کہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو، وہ اپنے خیال وعقیدہ کے اعتبار سے ناپاک ہیں۔

(۴) جو لوگ کسی دھرم کا نام لیتے ہوں اور اس کی اصل تعلیم پر عمل نہ کرتے ہوں ان کو ہر مذہب میں عقیدہ کے بگاڑ کے اعتبار سے خراب نام دیئے گئے ہیں، جن لوگوں نے بائبل کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے خوب واقف ہیں کہ اس کتاب میں بہت سے مواقع پر شرک کرنے والے کو کسبی، فاحشہ، زانی، بدکار وغیرہ کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، دھرم پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان فرق ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی زیادہ سخت لب ولہجہ میں ملتا

ہے "دسیو" اور "داس" کے نام سے ہندوستان کے اصل کالے باشندوں کو ویدوں میں یاد کیا جاتا ہے، جو آریہ لوگوں کے مذہب پر نہیں تھے، اس قوم کے بارے میں ویدوں کے کلمات ملاحظہ کیجئے :

- ❖ ہمارے گرد وہ دسیو ہیں جن کا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج۔ (رگ وید:۱۰:۲۲:۲:۸)
- ❖ اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادوٹونے تک کو مغلوب کرلیا۔ (رگ وید:۷:۴۹:۴)

تو اپنے ہتھیار سے ننگے دسیوں کو قتل کرتا ہے۔ (رگ وید:۵:۲۹:۱)

کہیں ان لوگوں کو "سیاہ رو" مخلوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، (رگ وید:۶:۲۱) کہیں انھیں "گھن کھائے درخت" کہا جاتا ہے، (رگ وید:۸:۴:۶) کہیں "کالے غولوں" سے تعبیر کیا جاتا ہے، (سام وید:۴:۲:۴:۱۱) ویدوں میں اُدھری لوگوں کے لئے حریص راکشش اور خبیث دشمن وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں۔

اب انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کہ قرآن نے تو ایک جگہ مشرکین کو ناپاک کہا ہے؛ لیکن ویدیں اس مذہب کے مخالفین کو خبیث، بیل جیسے جبڑے والے ننگے، سیاہ رو، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، بدذات، پاپی، حریص، راکشش وغیرہ کے الفاظ بے تکلف کہتی ہیں؛ بلکہ اتھروید میں آدھری لوگوں کے لیے بعینہٖ "ناپاک" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے :

> یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لئے اٹھیں، توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انھیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس "پلید" کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال۔ (اتھروید:۸:۳:۶-۷-۱۰)

(۵) یہ تو وہ القاب ہیں جو ادھری لوگوں کو دیئے گئے ہیں؛ لیکن منوجی کی تعلیمات

میں عقیدۂ وفکر کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ نسل وخاندان کی بنیاد پر شودروں کو نہایت ذلیل وحقیر القاب دیئے گئے ہیں اور ان کے بارے میں وہ احکام دیئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شودر جسمانی طور پر پیشاب، پائخانہ کی طرح ناپاک اور قابل اجتناب ہیں، اس سلسلہ میں میں ہندو مآخذ میں اتنا کچھ ہے کہ اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک رسالہ بھی ناکافی ہے، چند نمونے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

- ہاتھی، گھوڑے، شودر قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تینڈوے اور سور (پنر جنم کے) وہ ادنیٰ درجے ہیں، جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔ (منوسمرتی:۴۳:۱۲)
- شودر کا کھانا نہ کھائے۔ (منوسمرتی:۲۱۱:۴)
- شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے نرک (دوزخ) میں چلا جاتا ہے۔ (منوسمرتی ۱۷:۳)
- اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک اُپاس کرے (بھوکا رہے) اور اگر جان بوجھ کر کھالے تو اس کا کفارہ وہی ادا کرے جو حیض، پائخانہ، یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لیے مقرر ہے۔ (منوسمرتی:۲۲۲:۴)
- غذا سور کی بد بو سے، کتے کی نظر سے اور شودر کے چھونے سے گندی ہو جاتی ہے۔ (منوسمرتی:۲۹۱:۳)

ان تصریحات سے جو نہ صرف منوشاستر میں ہیں؛ بلکہ ایسی بعض عبارتیں ویدوں میں بھی موجود ہیں، اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے ایک طبقہ کو ہندو مذہب کے موجودہ مآخذ کی روایت کے مطابق کس نظر سے دیکھا گیا ہے؟

تاہم مجھے یقین ہے کہ اصل ہندو مذہبی کتابوں میں ایسی ظلم و زیادتی کی باتیں اور غیر انسانی تصورات نہیں ہوں گے، یہ مذہب کی اصل کتابوں میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہوگا، ہمیں ہندو مذہب میں ذکر کیے جانے والے بزرگوں اور علماء کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ انھوں نے ایسی غیر انسانی باتیں کہی ہوں گی؛ بلکہ یقیناً ایسی غلط باتیں کچھ لوگوں نے دوسروں کے استحصال اور اپنی مقصد براری کے لئے ان کی طرف منسوب کردی

ہوں گی۔

غیر مسلموں سے دوستی

اس پمفلٹ میں ان آیات کو بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، جن میں کفار کی عداوت اور ان سے دوستی نہیں رکھنے کا ذکر ہے، وہ آیات اس طرح ہیں :

(۱۳) وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ۔ (النساء:۱۰۱)

اور جب تم ملک میں سفر کرو تو تم پر حرج نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو ستاویں گے، بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

(۱۴) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ ۔ (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا، وہ انھیں میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے ہیں۔

(۱۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۔ (المائدہ:۵۷)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) مل چکی ہے اور وہ ایسے ہیں کہ انھوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا

ہے، ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اگر تم ایمان والے ہو۔

(۱۶) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ . (التوبۃ:۲۳)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلہ کفر کو پسند کریں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔

پہلی آیت (النساء:۱۰۱) میں بھی اہل مکہ کا بیان ہے کہ یہ تمہارے کھلے ہوئے اور سخت دشمن ہیں، کہیں مسلمان کسی مرحلہ پر دھوکہ نہ کھا جائیں اور ان کی دوست نما دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں، یہ آیت بھی انھیں مشرکین مکہ سے متعلق ہے۔

چنانچہ اس آیت کے بعد ''نمازِ خوف'' کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، (نساء:۱۰۲) کہ جب جنگ کی حالت ہو اور دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہوں، اس وقت مسلمانوں کو کس طرح نماز ادا کرنی چاہیے؟ کیوں کہ اہل مکہ سے اس وقت پے در پے معرکے درپیش تھے، یہ آیت تمام غیر مسلموں سے متعلق نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل اس کی واضح دلیل ہے، آپ ﷺ نے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا، بنوخزاعہ کافر تھے؛ لیکن مسلمانوں کے حلیف اور دوست تھے، اس طرح کے معاہدے آپ ﷺ نے بعض اور غیر مسلم قبائل سے بھی کیے ہیں، اگر کفار سے مطلقاً دوستی کی اجازت نہ ہوتی اور وہ سب کے سب دشمن قرار دیے جاتے، تو آپ ﷺ نے کیسے ان غیر مسلم قبائل کو اپنا حلیف بنایا ہوتا؟

دوسری اور تیسری آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمان بار بار یہودیوں سے معاہدہ کرتے تھے اور یہودی اس وعدہ کی خلاف ورزی کرتے تھے، یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں تو انھوں نے اہل مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیخ و بن اکھاڑ دینے کی کوشش کی، یہودی حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو متہم کرتے تھے اور ولد الزنا ٹھہراتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگاتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لعنت بھیجتے تھے، قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر جو تہمتیں لگائی جاتی تھیں، اس کی تردید کی؛ لیکن ہوا یہ کہ وہ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو تقویت پہنچاتے اور اسلام کی دعوت کو قبول کرتے، اپنے پیغمبر کو گالی دینے والے یہودیوں کے ساتھ مل بیٹھے، اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ انھیں اپنا رازدار نہ بنائیں؛ کیوں کہ ایسے شدید اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں یہود و نصاریٰ اور کفار مکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، عقیدۂ و مذہب کے تضاد کی وجہ سے مسلمان انھیں اپنا رازدار بنا کر کہیں نقصان نہ اُٹھالیں۔

پانچویں آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ بہ مقابلہ خونی رشتہ کی محبت کے مذاہب اور عقیدہ کا تعلق زیادہ اہم ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایمان لے آیا ہو، اس کے آباء و اجداد، بھائی بہن کفر کی حالت میں ہوں، تو ایسا نہ ہو کہ اپنے اعزہ اور اقارب کی محبت اور ان کا تعلق اسے حق کی راہ سے منحرف کردے؛ کیوں کہ جہاں حق اور ناحق کا مقابلہ ہو اور دو ایسی باتوں کا ٹکراؤ ہو جن میں ایک طرف حق اور سچائی ہو اور دوسری طرف رشتۂ قرابت، تو سچائی کو رشتوں پر ترجیح دینی چاہئے، یہ تو اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے اور ہر قوم کے لئے ہے کہ جس چیز کو وہ حق اور انصاف سمجھتی ہو اسے دوسرے تمام تعلقات پر غالب رکھے، اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو غیر مسلم اقرباء ہوں ان سے مسلمانوں کو نفرت کرنی چاہئے، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ آپ ﷺ نے ہر حال میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے غیر مسلم کی عیادت کی ہے، مکہ میں قحط پڑا تو آپ ﷺ نے کفار مکہ کے لئے امداد بھجوائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک عزیز کے لئے ریشمی عباء بھیجی، بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی والدہ ان کے مسلمان ہونے پر ناراض تھیں اور انھوں نے احتجاجاً کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا، آپ ﷺ نے انھیں نصیحت کی کہ اسلام پر قائم رہنا بھی ہے؛ لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی نہ ہو، اگر غیر مسلم رشتہ داروں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہوتی، تو

مسلمانوں نے اس طرح حسن سلوک کیوں کیا ہوتا ؟ اصل یہ ہے کہ موالات سے ہر طرح کی دوستی اور تعلق مراد نہیں ہے؛ بلکہ ایسی دوستی مراد ہے جو انسان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہونے لگے اور کسی گروہ کی راز دارانہ باتیں جن کا دوسروں تک پہنچنا اس گروہ کے لئے ضرر کا باعث بن سکتا ہو، پہنچنے نہ دے، ایسے گہرے تعلق کو اصل میں "موالات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلق کے مختلف درجات ہیں، ان کو ایک ممتاز صاحب علم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تعلقات چار طرح کے ہوسکتے ہیں : مدارات، مواساۃ، معاملات اور موالات، مدارات : دوستانہ برتاؤ اور خوش خلقی کا نام ہے، یہ غیر مسلموں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بلکہ انھیں اس کا حکم دیا گیا ہے، مواساۃ: غمگساری و نفع رسانی اور مالی تعاون سے عبارت ہے، غیر مسلموں کے ساتھ بھی مواساۃ کا حکم دیا گیا ہے، تیسرے معاملات، یعنی مالی کاروبار جیسے تجارت، ملازمت وغیرہ، اس میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں، چوتھا درجہ موالات کا ہے، موالات سے مراد ایسی دوستی ہے کہ آدمی دوسرے کی تہذیبی و تمدنی اثرات کو قبول کرنے لگے اور اپنے راز ہائے سربستہ کو دوسروں تک پہنچائے جس سے اسے مضرت بھی پہنچ سکتی ہے، قرآن نے اسی درجہ تعلق "موالات" سے منع کیا ہے: " لا تجعلوا خاصتکم وبطانتکم منھم "(تفسیر قرطبی:۲/۲۷/۳۰)
اسی ممانعت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق نہیں ہوسکتا، وہ ایک دوسرے سے میراث کے حق دار نہیں ہوتے۔

پس دو باتیں ان آیات کے بارے میں ذہن میں رکھنے کی ہیں: اول یہ کہ یہ آیات بھی ان کفار کے پس منظر میں ہیں جن سے اس وقت مسلمانوں کا سابقہ تھا، دوسرے اس میں ہر طرح کی دوستی کی ممانعت نہیں ہے؛ بلکہ ایسی دوستی کی ممانعت ہے جس میں مسلمان اپنی تہذیبی اور تمدنی قدروں سے محروم ہو جائیں، وہ دوسری قوموں کے ساتھ تہذیبی اور فکری اعتبار سے جذب ہونے لگیں، یا جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہے ان تک اپنے ایسے راز و اسرار کو پہنچانے لگیں جو پوری قوم کے لئے نقصان دہ اور مضرت رساں ہوں —— میں سمجھتا ہوں کہ کوئی

بھی قوم اگر اپنی تہذیب کی حفاظت اور بچاؤ کی کوشش کرتی ہے، تو یہ کوئی مذموم و ناپسندیدہ بات نہیں، آج تو تمام تہذیبی اکائیوں کے لیے عالمی سطح پر اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے، کہ اپنے تمدن کی حفاظت کریں اور اسے کھونے نہ پائیں، خود ہمارے اس ملک میں چھوٹی تہذیبی اکائیوں کی رعایت سے بعض ریاستوں میں خصوصی قوانین ہیں، وہاں دوسرے لوگ زمینیں بھی نہیں خرید سکتے، نیز ملکی قوانین کی جگہ بعض امور میں ان کے روایتی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لئے یہ کسی گروہ کے خلاف نفرت کی تعلیم نہیں؛ بلکہ مسلمانوں کو مختلف مذہبی اکائیوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی ثقافت کو برقرار رکھنے اور اپنے مذہبی اقدار پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم ہے۔

اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ خود ہندو مذہب میں جو لوگ ادھرمی اور ہندو مذہب پر ایمان نہ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، ان کے لئے عام طور پر ''دشمن'' ہی کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، بلکہ اس طرح ان کا ذکر کیا جاتا ہے، جیسے ان کا نام ہی دشمن ہو، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

- ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، ہم تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کر کے۔ (رگ وید:۲:۱۱:۱۹)
- اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوشحال ہوں۔ (رگ وید:۶:۸:۱۳)
- دشمنوں کے قتل کرنے والے اور تیرا! دسیوں کو ہلاک کرنے والے!۔ (رگ وید:۱۰:۸۳:۳)
- تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر...... قتل کیے جاؤ دشمنوں کو کچلے جاؤ۔ (رگ وید:۱۰:۸۴:۲-۳)
- اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے۔ (اتھروید:۳:۴:۱-۲)

غرض کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ان لوگوں کو جو اس مذہب کو نہ مانتے ہوں یا جن کو آریہ نسلی اعتبار سے حقیر جانتے ہوں، انھیں عام طور پر ''دشمن'' ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، شودروں کا بدقسمت گروہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اگر دوستی اور دشمنی کے پیمانے میں رکھ کر ان کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو حقارت کے علاوہ ان سے نفرت

کا اظہار بھی ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اونچی ذات کے لوگوں کو ان لوگوں سے بے تعلق رہنا چاہئے اور ان سے ہرگز دوستی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہئے، مثلاً منوجی شودروں کے بارے میں ہدایت کرتے ہیں :

❖ وہ کسی برادری سے خارج کئے ہوئے شخص یا چنڈال کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔ (منوسمرتی:۴:۷۹)

واضح ہو کہ "چنڈال" سے مراد وہ شخص ہے جو شودر مرد اور برہمن عورت کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو۔

❖ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (منوسمرتی:۴:۸۱)

❖ چنڈ اور سپاس لوگوں کی رہائش بستی کے باہر ہونی چاہئے۔ (منوسمرتی:۱۰:۵۱)

❖ براہمن شودر سے کبھی دان نہ لے۔ (منوسمرتی:۱۱:۲۴)

یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ منوسمرتی تو ایسی تعلیمات سے پُر ہیں اور ان کو اتنا قابل اجتناب سمجھا گیا ہے کہ :

❖ اگر براہمن کسی بلی یا نیولے یا چوہے یا مینڈک یا کتے یا چھپکلی یا اُلو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔ (منوسمرتی:۱۱:۱۳۲)

غور فرمائیے کہ نسل و مذہب کی بنیاد پر ایک طبقہ کے ساتھ کیسی نفرت وعداوت کو رَوا رکھا گیا ہے اور کس کس طرح لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے؟؟

غیر مسلم اور ہدایت

(۱۷) وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ . (التوبہ:۳۷)

اللہ کافر لوگوں کو صحیح راستہ نہیں دکھاتا۔

یہ آیت کا صرف آخری ٹکڑا ہے، پوری آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جائے تو خود بخود غلط فہمی دور ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بات بتائی کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت سے ہی

سال کے بارہ مہینے ہیں، یعنی ۱۲ مہینوں میں سورج کے گرد زمین کی گردش پوری ہوتی ہے، ان میں سے چار مہینے ''حرام'' ہیں، یہ چار مہینوں کے حرام ہونے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی عربوں میں چلا آرہا تھا، ان مہینوں کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جنگ کی مکمل ممانعت ہے، عرب کے خطہ میں جہاں کوئی قانونی حکومت نہیں تھی، ان مہینوں کا احترام لوگوں کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا؛ کیوں کہ ان ہی مہینوں میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر سکتے تھے، یہ چار مہینے تھے: رجب، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔

لیکن صورت حال یہ تھی کہ جب وہ ان مہینوں میں سے کسی مہینہ میں جنگ کے لئے مناسب موقع پاتے تو مہینے کو بدل دیتے، مثلاً کہتے کہ اس سال ذوقعدہ کی جگہ صفر ہے اور صفر کی جگہ ذوقعدہ، اسی طرح کبھی مہینہ بڑھا دیتے اور بارہ مہینوں کی جگہ تیرہ مہینوں کا سال قرار دیتے، کبھی مہینہ گھٹا کر ۱۱ مہینوں کا سال کر دیتے، قرآن مجید نے ان کے اس رویہ پر تنقید کی اور فرمایا:

إِنَّمَا النَّسِيْئُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُوْنَهُ عَامًا لِّيُوَاطِؤُوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ . (توبہ: ۳۷)

بے شک نسی (مہینوں کا اپنی جگہ سے ہٹا دینا) کفر میں زیادتی ہے، اس کے ذریعہ کفر کرنے والے گمراہ کیے جاتے ہیں، وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں؛ تاکہ ان مہینوں کی جنھیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے، گنتی پوری کر لیں، پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں انھیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

غرض کہ اہل مکہ کے جانتے بوجھتے اس غلط روش کو اختیار کرنے کی قرآن نے مذمت کی ہے؛ کیوں کہ اس کے ذریعہ عوام کو گمراہ کیا جاتا تھا، مثلاً کسی چیز پر سالانہ سود مقرر ہوا ہے

اور آپس میں مشورہ کر کے دس مہینے کا سال قرار دے دیا، تو اب دس ہی ماہ میں وہ پورا سود بیچارے بھولے بھالے عوام سے وصول کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، اسی طرح کسی کو ایک سال کے لئے مزدوری پر رکھا اور اجرت سالانہ متعین کی، اب بارہ کے بجائے چودہ ماہ کا سال مقرر کر لیا اور دو مہینہ زیادہ اس سے خدمت لے لی، اس طرح پر عوام کو بے وقوف بنانے کا حیلہ تھا، اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ کچھ کافروں ہی کو اس نام پر گمراہ کیا جاتا ہے اور دھوکہ میں ڈالا جاتا ہے، پھر اہل مکہ میں سے ان مجرم پیشہ لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ چوں کہ دانستہ طور پر غلطی پر مصر ہیں، اس لئے ان کو ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

پس یہ بات کافروں کے ایک خاص گروہ کے بارے میں ہے، ورنہ قرآن تو چاہتا ہی ہے کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ بھی ہدایت کے راستہ پر آئیں، اسی لئے قرآن نے اپنا تعارف ہی یہ کرایا ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لئے ہدایت ہے: "هُدًى لِّلنَّاسِ" (البقرہ:۲) اور اس اُمت کو حق اور سچائی کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، تو اگر قرآن کا یہ تصور ہوتا کہ کسی غیر مسلم کو وہ راستہ مل ہی نہیں سکتا جس کو اسلام صحیح راستہ سمجھتا ہے اور ہدایت قرار دیتا ہے، تو کیوں کر اُمتِ مسلمہ کو انسانیت کی دعوت کے لئے مامور کیا جاتا؟

عیسائیوں میں آپسی عداوت

(۱۸) فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۔ (المائدۃ:۱۴)

پھر ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے اور اللہ جلد انھیں بتا دے گا جو کچھ کہ وہ کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، پوری آیت اس طرح ہے :

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۔ (المائدۃ:۱۴)

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا، جو کچھ انھیں نصیحت کی گئی، اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے، تو ہم نے ان میں قیامت تک کے لئے باہم بغض وعداوت پیدا کردی اور عنقریب اللہ انھیں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں، ان کے بارے میں بتائیں گے۔

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں :

اول یہ کہ یہ ارشاد ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں، نہ کہ تمام غیر مسلموں سے متعلق، دوسرے قرآن نے ہمیں بتایا کہ ان سے حضرت عیسیٰ ﷺ نے عہد لیا تھا کہ آپ کے بعد جو نبی آئے گا، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ، وہ ان پر ایمان لائیں گے؛ (صف:٦) لیکن انھوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا؛ حالاں کہ عیسائیوں نے اور خاص کر سینٹ پال نے عیسائی عقائد کو پوری طرح ردّ وبدل کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے آمیزشیں کردی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود انجیل میں ابھی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی طرف اشارے موجود ہیں، یہاں صرف حضرت عیسیٰ ﷺ کے دو ارشادات نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں :

❖ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کروگے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (یوحنا:۱۴:۱۶)

❖ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے؛ کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا؛ لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (یوحنا:۱۶:۷،۸)

حضرت عیسیٰ ﷺ کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ نے ہی نبوت کا دعویٰ فرمایا، قرآن نے آپ ﷺ کو "خاتم النبیین" یعنی ابد تک کی نبوت کا حامل قرار دیا اور آپ ﷺ نے دنیا پر واضح

کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے معاندین میں کون راست باز ہے اور گنہگار؟ اس طرح عیسائیوں کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تعلیم کے مطابق آپ ﷺ پر ایمان لانا ضروری تھا؛ لیکن انھوں نے ایمان نہ لاکر اس عہد کی خلاف ورزی کی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی قوموں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بعض عذاب نازل کرتے ہیں، جن میں سے ایک ان کے درمیان باہمی اختلاف وافتراق کا پیدا ہو جانا بھی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اُمت مسلمہ کے بارے میں بھی فرمایا کہ اس اُمت پر کوئی اجتماعی عذاب تو نازل نہیں ہوگا؛ لیکن آپسی اختلاف وافتراق کا عذاب ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے نازل ہوگا اور مسلمان عملاً آج اس سے گذر رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان سخت اختلاف کی کیفیت باقی رہے گی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں جتنے زیادہ مذہبی فرقے ہیں، شاید ہی کسی اور مذہب میں ہوں اور مذہبی اختلاف کی بنیاد پر عیسائی فرقوں نے ایک دوسرے کو جس طرح بے تحاشا قتل اور زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے، مشکل سے مذاہب کی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال ملے گی، کلیسائی نظام کے زمانۂ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، جن میں تین لاکھ چالیس ہزار کا تعلق صرف اسپین سے تھا اور ان میں بتیس ہزار وہ لوگ ہیں جو زندہ جلا دیئے گئے، پھر عیسائی حکومتوں کی باہمی منافرت دیکھئے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم دراصل ان ہی کی باہمی رقابتوں کے نتیجہ میں ہوئیں، جن میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن گئے، یہ قرآن کی ایک پیشین گوئی ہے اور ایسی پیشین گوئی ہے جو انسانیت کے مشاہدہ میں ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل اعتراض، یا مسلمانوں کو کسی فرقہ کے خلاف بھڑکانے والی ہو۔

اس پمفلٹ میں چھ آیتیں وہ ذکر کی گئی ہیں جن میں کفر کرنے والوں کے لئے آخرت کی سزاؤں کا ذکر ہے، یہ آیات اس طرح ہیں :

غیر مسلم اور عذابِ آخرت

(۱۹) إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوْداً غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوْا الْعَذَابَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَزِيْزاً حَكِيْما . (النساء:٥٦)

بے شک جن لوگوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا، ہم انھیں دوزخ میں داخل کریں گے، جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم انھیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے؛ تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں، بے شک اللہ طاقت والا حکمت والا ہے۔

(۲۰) وَعَدَ اللهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيْمٌ . (التوبة:٦٨)

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی انھیں بس ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لئے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔

(۲۱) إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِن دُوْنِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ . (الانبیاء:٩٨)

یقیناً تم اور اللہ کے سوا جنھیں تم پوجتے ہو، وہ دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم لوگ اس میں اترو گے۔

(۲۲) فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَاباً شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ . (حم السجدة:٢٧)

تو یقیناً ہم کفر کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو ان کے برے کاموں کا بدلہ دیں گے۔

اس سے پہلے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان لوگوں کے بارے میں فرمائی ہے، جو قرآن مجید پڑھنے کے وقت شور وغل کرتے تھے اور لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے تھے۔

(۲۳) ذٰلِکَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ . (حم السجدۃ:۲۸)

یہ بدلہ ہے اللہ کے دشمنوں کا، آگ، اسی میں ان کا ہمیشہ کا گھر ہے، اس کے بدلہ میں کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

(۲۴) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ . (السجدۃ:۲۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاددہانی کرائی جائے، پھر بھی وہ اس سے منھ پھیر لے، یقیناً ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والوں، اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں اور غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے والوں کے لئے عذاب کا ذکر ہے، یہ بات وی، ایچ، پی کے بھائیوں کو بہت ناگوار خاطر ہے، دنیا کی معمولی حکومتیں بھی اپنے مخالفین کو سزائیں دیتی ہیں، وی، ایچ، پی اور بجرنگ دل والے بہت سے بے قصور لوگوں کو صرف اس لئے تکلیفیں دینا، زندہ جلانا اور نیست ونابود کردینا درست سمجھتے ہیں، کہ وہ ان کے ہم مذہب نہیں ہیں؛ لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خدا اتنا عاجز، بے حس اور بے شعور ہو کہ چاہے کوئی اس کا فرماں بردار ہو یا نافرمان، کوئی اس کے سامنے سر جھکائے یا اس کو برا بھلا کہے، کوئی اس کے حق میں دوسرے کو شریک ٹھہرائے؛ لیکن خدا کوئی حرکت نہ کرے، وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کئے رہے اور ظلم و بدی کرنے والوں کو نہ دنیا میں کچھ کہے اور نہ مرنے کے بعد، یہ کیسی نامعقول اور ناانصافی کی بات ہے؟ خدا کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ پورا پورا انصاف کرے اور اچھے اور بروں کو ان کے عمل کی جزاوسزا دے،

دنیا کے تمام ہی مذاہب میں جزا وسزا کے قانون کو مانا گیا ہے اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان کو اچھے عمل کرنے چاہئیں ؛ تا کہ وہ خدا کے عذاب سے بچ سکے ، ہندو مذہب میں بعض اعمال پر سورگ اور بعض اعمال پر نرک کی جو پیشین گوئی ہے وہ آخر کیا ہے؟ یہ جو شری کرشن جی ، ارجن کو ترغیب دیتے ہیں کہ تم کوروں پر حملہ کرو، اس سے تمہارے لئے سورگ کا دروازہ کھل جائے گا اور منو جی کہتے ہیں کہ برہمن شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بھی بٹھا لے تو بیچارہ نرک میں چلا جائے گا ، یہ سورگ اور نرگ کیا ثواب وعذاب سے عبارت نہیں ہے؟ ہندو مذہبی علماء آج جس پنر جنم کے قائل ہیں، اس کے مطابق ایک انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آئندہ کتا اور سوّر بن سکتا ہے، یہ بھی دھرم کی خلاف ورزی پر خدا کی طرف سے عذاب ہی تو ہے؛ اس لئے ان آیات پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں ؛ بلکہ اگر خدا نافرمانوں کی گرفت نہیں کرتا ، تو یہ خدا کی شان اور انصاف کے خلاف بات ہوتی ، اگر نافرمانوں کے لئے کوئی سزا نہ ہوتی تو وید میں یہ دُعاء سکھائی نہ جاتی کہ وید مخالفوں کو ہلاک کردے ۔ (اتھروید: ۲۰:۱۰۵:۱)

ہاں ! اگر ان آیات میں اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کو اُکسایا گیا ہو؛ تا کہ وہ خدا کی عدالت کا انتظار نہ کریں ؛ بلکہ خود ہی انھیں سزائیں دے دیں ، تو اس سے اشکال پیدا ہوسکتا تھا؛ لیکن قرآن نے یہ اُصول بتایا کہ دنیا میں ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق عمل کرے گا ، مسلمان دوسری قوموں پر داروغہ نہیں ، کہ وہ انھیں اپنی رائے پر عمل کرنے کے لیے مجبور کریں: ''لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ '' (الغاشیہ:۲۲) لیکن اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم، انھیں خود ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا، قرآن نے بار بار دوزخ میں آگ کی سزا کا ذکر کیا ہے؛ لیکن دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو آگ میں جلانے کی سزا دے اور فرمایا کہ ایسی سزا دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے ، غرض کہ دنیا کا قانون اور ہے اور آخرت کا قانون اور ، اور اگر اللہ آخرت میں بھی ظالم ومظلوم اور فرماں بردار و نافرمان کا فرق نہ کرے تو پھر وہ خدا کہلانے کا مستحق بھی ہے؟

❁ ❁ ❁

اسلام — صلح و آشتی کا مذہب

قارئین جب اس تحریر کو پڑھیں گے تو جناب جنرل پرویز مشرف ہندوستان سے واپس ہو چکے ہوں گے، پرویز صاحب پڑوسی ملک کے خود ساختہ صدر ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان پر "کارگل" جنگ تھوپنے کے پس پردہ اصل شخصیت ان ہی کی ہے؛ لیکن اس وقت وہ صلح و امن کے نقیب بن کر آئے ہیں اور انھوں نے متضاد قسم کی باتیں کہی ہیں، پاکستان کے اٹل موقف کو دہرایا بھی ہے اور لچکدار رویہ اختیار کرنے کی بات بھی کہی ہے، یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے ملک نے ایک حد تک ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ان کا گرم جوش خیر مقدم کیا ہے اور ایک میزبان کی حیثیت سے اپنے مہمان کے اعزاز و اکرام کا پورا پورا خیال رکھا ہے، اب وقت ہی بتائے گا کہ یہ ملاقات کس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے اور دونوں ملکوں کو امن کی نعمت نصیب ہو پاتی ہے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ہند و پاک اور فی الحال دو حصوں میں بٹا ہوا کشمیر ہر جگہ لوگ امن کے پیاسے ہیں اور دُعاء کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے درمیان صلح و صفائی کی صورت نکل آئے؛ تاکہ بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے ملنا آسان ہو سکے، اور ملک کے کثیر معاشی مسائل جو بے معنی جنگ و جدال پر خرچ ہو رہے ہیں، غربت دور کرنے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ ہوں، اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً یہ اس خطہ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی، یہ دونوں ممالک اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح کے لئے خرچ کر سکیں گے، اور مغربی ممالک کی محکومیت اور غلامی سے بھی انھیں نجات حاصل ہوگی۔

افسوس کہ بعض فرقہ پرست اور امن دشمن عناصر ان مواقع پر امن اور صلح کو قوت پہنچانے کے بجائے ان کو غیر حقیقت پسندانہ اور خلاف واقعہ پروپیگنڈہ کے لئے استعمال کرتے ہیں؛ چنانچہ اس وقت بھی یہ غلط تاثر پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد اور کٹر پسند

مذہب ہے، جو دوسری قوموں کے ساتھ صلح، میل جول اور بقاء باہم کے اُصول پر اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے اور مسلمان اپنے قومی مزاج کے اعتبار سے ہی شدت پسند ہیں؛ حالاں کہ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ اور نادرست ہے۔

اسلام ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہی صلح کے ہیں، قرآن نے بار بار صلح و آشتی کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے اور صلح کے بعد پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے، قرآن نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا :

> اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو تجھ کو اللہ کافی ہے ، اللہ ہی نے تجھ کو اپنی مدد کے ذریعہ اور مسلمان کے ذریعہ طاقت پہنچائی ہے۔ (الانفال:۶۱-۶۲)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ صلح کرنا چاہیں اور امن و آشتی کے خواہاں ہوں ، مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ ان کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں؛ بلکہ اس آیت میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ اگر صلح میں فریق مخالف کی طرف سے اندیشے اور خدشات ہوں تب بھی ممکن حد تک صلح کی راہ اختیار کرنی چاہئے اور اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں اور صلح و امن کے رویے پر قائم ہوں، ان سے جہاد جائز نہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

> ......اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں؛ چنانچہ تم سے جنگ نہ کریں اور صلح کی پیشکش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ (النساء:۹۰)

یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو اور وہاں مسلمان شہریوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو، تو اخلاقی اور سیاسی طور پر تو ضرور اس کے سد باب کی کوشش کرنی چاہئے؛ لیکن قرآن کہتا ہے کہ مسلمان حکومت کو ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق نہیں؛ چنانچہ قرآن کا بیان ہے :

> جو لوگ ایمان لائے اور (مسلم ملک کو) ہجرت نہیں کی، تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے آجائیں اور اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں، تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ انھیں دیکھ رہا ہے۔ (الانفال:۷۲)

اسلام نہ صرف مسلمانوں کو صلح کا حکم دیتا ہے؛ بلکہ خیر اُمت کی حیثیت سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حسبِ ضرورت مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں، سوائے اس کے کہ صدقہ کا حکم دیا جائے یا بھلائی کا، یا لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے، (النساء:۱۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھالے، (البقرۃ:۲۲۴) صلح بہر حال خیر کی چیز ہے، خواہ افراد کے درمیان ہو یا قوموں کے درمیان: "اَلصُّلْحُ خَيْرٌ" (النساء : ۱۲۸) اور کیوں نہ ہو، کہ اسلام زمین میں قتل و خوں ریزی کو ناپسند کرتا ہے: "وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" (الاعراف:۵۶) بلکہ اگر کسی ملک یا قوم کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہوں، اس وقت بھی ان کے ساتھ بہتر رویہ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ آج کے دشمن کل کے دوست ہو جائیں، (الممتحنہ:۷) جیسے قرآن مجید میں بار بار صلح و آشتی کی تعلیم دی گئی ہے اور بے سبب جنگ و جدال کو منع فرمایا گیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی صلح کرنے اور کرانے کی بڑی ترغیبات منقول ہیں، حضرت ابو ایوب انصاری ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: "اے ابو ایوب! کیا میں تجھے ایسا صدقہ نہ بتاؤں، جسے

اللہ اور اس کے رسول پسند فرماتے ہیں؟ اور وہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں باہم بغض و فساد پیدا ہو جائے تو تم ان کے درمیان صلح کراؤ'' (مجمع الزوائد: ۷۹/۸) رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمسایہ قوموں کے ساتھ امن و آشتی اور صلح و امان کی واضح مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نبوت سے پہلے حلف الفضول میں شریک ہوئے، جس کا مقصد مظلوموں کی بلا امتیاز نسل و قوم مدد کرنا تھا، آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی مجھے اس کی طرف دعوت دے تو میں اسے قبول کروں گا۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۱/۲)

جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور نسلی اکائیوں کے درمیان باہمی امن، مذہبی آزادی، ایک دوسرے کے احترام اور مدینہ کی مشترک مدافعت کے سلسلہ میں تحریری معاہدہ فرمایا اور اس پر تمام فریقوں کا دستخط لیا گیا، اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سیرت کا ایک اہم عنوان ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کیا اور اہل مکہ کی شرطوں پر کیا اور جب تک خود اہل مکہ کی طرف سے کھلی ہوئی بد عہدی پیش نہ آگئی، آپ اس معاہدہ پر قائم و ثابت قدم رہے۔

* پھر جو معاہدہ ہو جائے اس پر قائم رہنا بھی شرعاً واجب ہے، یہ بات کہ ایک طرف صلح کی میز پر بیٹھیں اور دوسری طرف اسی فریق کے خلاف اندرونی ریشہ دوانیاں بھی جاری رکھیں، کسی طرح درست نہیں، قرآن نے عہد و پیمان کی پابندی پر بہت زور دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں سوال ہوگا: ''وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ، اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا '' (بنی اسرائیل: ۳۴) اہل ایمان کی علامت بتائی گئی ہے کہ وہ امانتوں اور عہد و پیمان کی نگہداشت کرتے ہیں، (مومنون: ۸) رسول اللہ ﷺ نے اسے نفاق قرار دیا ہے کہ آدمی عہد کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے: ''اذا عاهد غدر'' (بخاری، باب علامۃ المنافق) اللہ تعالیٰ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ اگر کسی ایسی حکومت کی جانب سے اس کے مسلمان شہریوں پر زیادتی ہو، جن سے صلح ہو چکی ہے، تو وہاں مسلمانوں کو اپنا ہاتھ روکے رکھنا ہوگا۔ (الانفال: ۷۲)

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو برت کر دکھایا ہے، صلح حدیبیہ کے فوراً بعد آپ ﷺ نے

چاہا کہ حضرت ابوجندل ﷺ کو اس دفعہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے؛ لیکن اہل مکہ تیار نہیں ہوئے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ملال خاطر کے ساتھ انھیں واپس فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ہم ان سے معاہدہ کر چکے ہیں، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے اور ہمارے دین میں معاہدہ میں خلاف ورزی کی گنجائش نہیں: ''ولا یصلح لنا فی دیننا الغدر'' (سیرت ابن ہشام: ۳/۲۷۴) اسی طرح حضرت ابوبصیر ﷺ جب مکہ سے مدینہ آگئے تو آپ ﷺ نے انھیں بھی واپس فرمادیا، (بخاری، کتاب الشروط فی الجھاد والمصالحہ مع اہل الحرب) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد کی پابندی اسلام کی نظر میں کس قدر اہم اور ضروری ہے، بین قومی معاہدات کی خلاف ورزی کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمنوں کو مسلط فرمادیتے ہیں: ''ماغدر قوم بالعھد الاسلط اللہ علیھم العدو''۔ (موطا امام مالک، باب ماجاء فی الوفاء بالامان)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و آشتی، صلح و سلامتی اور انسانی اخوت و بھائی چارگی کا مذہب ہے، جو نہ صرف صلح کو پسند کرتا ہے؛ بلکہ چاہتا ہے کہ مسلمان صلح میں پیش قدمی کریں، اور حسبِ موقع ضرورت پڑے تو اس کے لئے اپنے جذبات و مفادات کی ایک گونہ قربانی بھی دیں اور نہ صرف خود صلح کریں؛ بلکہ دوسری قوموں کے درمیان بھی صلح کے نقیب اور نمائندہ بن کر سامنے آئیں اور جن شرطوں پر صلح ہو، ان کے پابند و پاس دار رہیں!

(۱۰ رجولائی ۲۰۰۱ء)

اسلام کا تصور جہاد

عام طور پر سب سے زیادہ جو مسئلہ غیر مسلموں کے تئیں اسلام کے رویہ کے بارے میں لوگوں کو کھٹکتا ہے اور بڑے زور وشور کے ساتھ اس کا نام لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، وہ ہے اسلام کا تصور جہاد! ـــــ آج کے میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے جہاد کو دہشت گردی اور لوٹ وغارت گری کے ہم معنی بنا دیا ہے؛ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، جہاد ظلم نہیں؛ بلکہ ظلم کو روکنے کی کوشش ہے، یہ ظالموں کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کی جدو جہد کا نام ہے: ''اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا '' (الحج:۳۹) جہاد کا مقصد ملک گیری وکشور کشائی اور دوسری قوموں کو مغلوب اور ذلیل کرنا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے: ''اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ ''۔ (النساء:۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ جہاں اخلاق کی تلوار اور پند وموعظت کا ہتھیار نہیں چلتا، وہاں جنگ ضروری ہو جاتی ہے، اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ ہر جگہ کار گر نہیں ہوتا، ہمارے ملک میں مختلف ریا[illegible]ں اس وقت علاحدگی پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے، مختلف پڑوسی ملکوں سے بھی ہماری سرحدوں کو خطرات ہیں، کیا ان حالات میں ملک کا کوئی بھی خواہ اور محب وطن شہری اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ ملک اپنی دفاعی تیاریوں کو نظر انداز کر دے اور دشمنوں کے حملے سے نمٹنے کے لئے خود کو تیار نہیں رکھے؟

غور کیا جائے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی گذرا ہے جس نے جنگ کو بالکل ممنوع قرار دیا ہو، یہودیوں کے یہاں جنگ کا بہت بے رحمانہ تصور ملتا ہے، بائبل میں ہے :

جب تم یردن سے پار ہو کر زمین ''کنعان'' میں داخل ہو تو ان سب

> کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے بھگا دو اور ان کی مورتیں فنا کر دو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں، خارج کر دو اور وہاں آبسو۔ (استثناء: ۳۳:۵۰،۵۴)

بائبل نے جنگی اعتبار سے غیر اسرائیلیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک وہ علاقہ جن کو یہودی عقیدہ کے مطابق خدا نے اسرائیل کی میراث میں دیا ہوا ہے، اس علاقہ کا جنگی قانون یہ ہے کہ مردوں اور شادی شدہ عورتوں کو قتل کر دیا جائے، صرف کنواری لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنے تصرف میں لے لیا جائے اور دوسرا علاقہ وہ ہے جو بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں ہے، یہاں مردوں، عورتوں اور بچوں یہاں تک کہ ان کے جانوروں کو بھی تہہ تیغ کر دیا جائے۔

عیسائی حضرات خیال کرتے ہیں کہ ان کا مذہب جنگ و جدال کا مذہب نہیں ہے، گو آج پوری دنیا میں عیسائی اقوام ہی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کی اصل ذمہ دار ہیں؛ لیکن مذہبی اعتبار سے بھی عیسائی حضرات یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے:

> یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا، صلح کرانے نہیں؛ بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ (متی: ۱۰:۳۴،۳۶)
>
> ایک موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدیں۔ (لوقا: ۲۲:۳۶)

ہندو مذہب اپنے آپ کو اہنسا اور عدم تشدد کا مذہب کہتا ہے، گاندھی جی کا خیال ہے کہ ہندو مذہب کا سب سے بڑا حسن یہی ہے؛ لیکن ہندو مذہب کی تاریخ جنگوں سے پُر ہے، ''رامائن'' شری رام جی کے حالات اور رام اور راون کی بھیانک جنگ کی کہانی ہے، ''گیتا'' جس کو ہندو بھائیوں کے یہاں بڑا تقدس حاصل ہے اور جس کو خود گاندھی جی اپنی ماں کہا کرتے تھے، وہ تمام تر کوروؤں اور پانڈوؤں کی داستانِ جنگ ہے، ہندوؤں کے عقائد میں ایک

''آواگمن'' بھی ہے، جس کے تحت ایک شخص موت کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، اس کے پیش نظر شری کرشن جی، ارجن سے کہتے ہیں کہ روح کے لئے جسم کی حیثیت کپڑے کی ہے، گویا قتل انسانی پرانا کپڑا اپھاڑ کر نیا کپڑا پہنانے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بُری بات نہیں، شری کرشن جی مزید کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو آخر اسے مار ڈالنے میں کیا قباحت ہے؟ ظاہر ہے ان تعلیمات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ ہندو مذہب میں جنگ کا تصور نہیں ہے۔

اسلام نے بھی یقیناً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے؛ لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ جو بھی غیر مسلم سامنے نظر آئے اس کی گردن ماردیں؛ بلکہ قرآن وحدیث کے ارشادات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: ذمی، معاہد اور حربی۔

مسلم ملک کے غیر مسلم شہریوں کو ''ذمی'' کہتے ہیں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ذمی کہنے میں ان کی تحقیر و تذلیل ہے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، ذمہ کے معنی عربی زبان میں ''عہد'' کے ہیں اور ذمی وہ ہے جس سے مسلمانوں کا عہد ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طریقہ پر رہیں گے اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت بھی کریں گے، گویا ان کو ذمی کہہ کر مسلمانوں کو ان کے تئیں ذمہ داریوں کو یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ ان کی حفاظت اور حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں، ذمی کی جان و مال، عزت وآبرو اور عام انسانی حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔

غیر مسلموں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''معاہدین'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہد ہو، یہ معاہدین بھی ذمی ہی کے حکم میں ہیں، ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کا اور یہ بھی جائز نہیں کہ ان سے طے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی جائے۔

غیر مسلموں کی تیسری قسم وہ ہے جن کو ''حربی'' کہا جاتا ہے یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہدہ نہ ہو اور وہ

مسلمانوں کے برسر پیکار رہتے ہوں، جو اسلام اور انسانیت کے لئے غارت گر بنے ہوئے ہوں، اسلام صرف ایسے ہی لوگوں کے خلاف تلوار اُٹھانے کی اجازت دیتا ہے؛ لیکن اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غالباً سب سے پہلے جنگ کے مہذب اور شائستہ قوانین دیئے اور آپ ﷺ نے اپنے فوجیوں کو نہایت اہمیت کے ساتھ ان اُصولوں کا پابند رہنے کی تاکید فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: چرچ اور مذہبی عبادت گاہوں کے متعلقین کو قتل نہ کیا جائے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو جنگ کے درمیان نشانہ نہ بنایا جائے، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ مقتولین کا ''مُثلہ'' کیا جائے اور ان کے اعضاء کاٹ دیئے جائیں، اس سے بھی منع فرمایا کہ کسی کو باندھ کر اسے نشانہ بنایا جائے، کسی کو نذرِ آتش کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوائے خدا کے کسی کو آگ میں جلانے کا حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں شدید ضرورت کے بغیر آتشیں اور نیوکلیر ہتھیاروں کا استعمال درست نہیں؛ کیوں کہ یہ آتشیں ہتھیار ہیں اور اس کی زد میں فوجیوں کے ساتھ وہ پُر امن شہری بھی آجاتے ہیں، جو جنگ میں شریک نہیں ہیں، جنگ کے موقع پر لوٹ مار اور چھینا جھپٹی ایک عام بات ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کو بھی منع فرمایا، آپ ﷺ نے فوجیوں کے لئے چلنے پھرنے کے بھی آداب بتائے، شور و ہنگامہ کو منع کیا، اس طرح چلنے اور منزل پر پڑاؤ ڈالنے کی تلقین کی کہ مسافر دقت محسوس نہ کریں، راہ گیروں کو نقصان پہنچانے اور ڈرانے دھمکانے سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے سفارتی آداب کی بھی پوری پوری رعایت فرمائی، مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن حارث حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا، واقعہ ہے کہ دنیا کو سب سے پہلے جنگ کے درمیان تہذیب و شائستگی، انسانی احترام اور احترامِ آدمیت کا سبق نبی عربی ﷺ نے دیا اور یہ جو کچھ آج مشرق و مغرب میں قانونِ جنگ کا شور ہے اور جس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی خود ترقی یافتہ قوموں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے، یہ سب آپ ﷺ ہی کی مبارک تعلیمات کی بازگشت ہے۔

یہ تو وہ احکامِ جنگ ہیں جو عین جنگ کے درمیان اپنے دشمنوں کے ساتھ برتنے کے

ہیں ؛ لیکن اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح مند کرے تو آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ سلوک کی تعلیم دی اور عفو و درگذر کا راستہ اختیار کرنے کو فرمایا، اس سلسلہ میں فتح مکہ کا واقعہ اپنی مثال آپ ہے، اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر کیا کچھ مظالم نہیں ڈھائے؟ لیکن جب اللہ نے مسلمانوں کو فتح و سربلندی سے نوازا اور اہل مکہ کو ہزیمت ہوئی، تو آپ ﷺ نے انتقام لینے کے بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا، ارشاد ہوا: ''لا تثریب علیکم الیوم'' آپ ﷺ نے عفو و درگذر ہی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ آگے بڑھ کر ان کی عزت نفس اور تکریم کا بھی خیال رکھا، سردار قریش ابوسفیان کے بارے میں فرمایا: جو ان کے گھر میں پناہ لے لے وہ مامون ہے: ''من دخل دار أبی سفیان فھو آمن''۔ (مسلم، کتاب الجہاد باب فتح مکۃ)

غزوۂ بدر میں ستر قیدی بنائے گئے، تو آپ ﷺ نے ان کو اس شان و اعزاز کے ساتھ رخصت فرمایا کہ ان کے لئے جوڑے بھی سلائے، آپ ﷺ نے ان قیدیوں کو صحابہ پر تقسیم فرما دیا تھا اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے، غزوۂ حنین کے موقع پر چھ ہزار دشمنوں کو گرفتار کیا گیا؛ لیکن آپ ﷺ نے بغیر کچھ لئے ہوئے ان سب کو رہا کر دیا —— غور کیجئے! ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ حسن سلوک اور انسانیت پروری ہے، دوسری طرف یورپ کی شرافت اور انسانیت دوستی کا حال یہ ہے کہ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے پس منظر میں اس بات کا ذکر مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوات اور جہاد کے ذریعہ جو عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اس میں کس قدر کم جانی نقصان ہوا، آپ ﷺ کے کل غزوات و سرایا کی تعداد بیاسی ہے، جن میں مسلمان شہداء کی تعداد دو سو انسٹھ اور غیر مسلم مہلوکین کی تعداد سات سو انسٹھ ہے، اس طرح کل مہلوکین دس سو اٹھارہ ہیں، گویا فی جنگ مقتولین کا اوسط گیارہ سے کچھ زیادہ ہے۔

اب آپ اس کا تقابل ان انسانی ہلاکتوں سے کیجئے جو دوسری قوموں میں پیش آئی ہیں،

ہندو تاریخ کے مطابق صرف مہابھارت کی جنگ میں لاکھوں لوگ کام آ گئے، عیسائی دنیا میں کلیسائی نظام کے زمانۂ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کیے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، ان میں ۳۲ ہزار وہ بدقسمت ہیں جو زندہ جلا دیئے گئے، بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو بلا امتیاز مرد و زن، بچے بوڑھے ستر ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے؛ لیکن پھر اسی بیت المقدس پر جب دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو سلطان عادل صلاح الدین ایوبیؒ نے عفو عام کا اعلان کر دیا اور عیسائی چوں کہ یہودیوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تھے، اس لئے دونوں کی آبادیاں بھی الگ کر دی گئیں، پہلی جنگِ عظیم کے مہلوکین کی تعداد محتاط اندازہ کے مطابق ۷۴ لاکھ کے قریب پہنچی ہے۔

غور فرمایئے کہ جو لوگ تہذیب و تمدن کے مدعی ہیں اور اپنے آپ کو انسانیت کا علمبردار تصور کرتے ہیں، انھوں نے کس کس طرح انسانیت کی دھجیاں اُڑائی ہیں! ان وضاحتوں سے آپ کو یقیناً اس پروپیگنڈے کی حقیقت کا بھی اندازہ ہوا ہوگا، جو اسلام کے تصور جہاد اور پیغمبر اسلام کے عملی جہاد کے بارے میں آج پوری دنیا میں جاری و ساری ہے، افسوس کہ ہم مسلمان اپنی غفلت شعاری اور کوتاہ عملی کی وجہ سے دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی انسانیت نوازی کا پہلو پیش کرنے سے قاصر ہیں!

(۱۳؍ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جہاد — حقیقت اور فسانہ

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جو بات اس سے بار بار کہی جاتی اور اس کے سامنے دہرائی جاتی ہے وہ اس کا یقین کر لیتا ہے، خواہ وہ بات کتنی ہی خلافِ واقعہ کیوں نہ ہو، اس کی ایک مثال اس وقت ''جہاد'' کے عنوان سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں بھی ہیں، مغربی ملکوں نے اپنی ظلم وزیادتی پر پردہ رکھنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو ''دہشت گردی'' (Terrorism) کے ہم معنی قرار دے دیا ہے اور پوری دنیا میں اسلام کے خلاف دہشت گردی کو عنوان بنا کر مہم چلائی جا رہی ہے، اسرائیل فلسطین کی زمین پر قابض ہے، فلسطینی تارکین کو اپنے گھر واپسی کے حق سے محروم کئے ہوا ہے، اور خود یہودی بستیاں بسا رہا ہے، اسرائیل کا موجودہ وزیر اعظم ایریل شارون خوں آشام طبیعت کا انسان ہے اور اس نے نہتے عربوں کا قتل عام کیا ہے، اس کے باوجود انھیں دہشت گرد نہیں کہا جاتا اور فلسطینی جب ان مظالم کے خلاف جد وجہد کرتے ہیں تو ان کی مدافعانہ کارروائیوں کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں جن طاقتوں نے علانیہ بابری مسجد کو شہید کیا، عدالتی احکام کی خلاف ورزی کی، بھاگلپور، میرٹھ اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور جو گجرات میں منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کی جان ومال کو تباہ کر رہے ہیں وہ دہشت گرد نہیں کہلاتے اور اگر مسلمانوں کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار ہو تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے، انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کے علاحدگی پسندوں نے شورشیں برپا کیں تو انھیں دہشت گرد نہیں کہا گیا اور انڈونیشیا کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ اس خطہ کو آزاد کر دیں، اسے دہشت گردی نہیں سمجھا گیا، سوڈان میں جنوبی علاقے کے عیسائی آمادۂ بغاوت ہیں، تو اس کو

جنگ آزادی کا نام دیا جاتا ہے، روس سے متعدد عیسائی ریاستوں نے اپنی علاحدگی کا اعلان کیا، تو ان کے اس حق کو تسلیم کیا گیا؛ لیکن چیچنیا میں جب عوامی انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم ملک وجود میں آیا تو اسے دہشت گرد کہا گیا اور پورا مشرق و مغرب مخالفت پر کمربستہ ہوگیا بالآخر قطعاً ظالمانہ طریقہ پر اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا۔

مغرب کی سامراجی طاقتوں نے دہشت گردی کا عجیب پیمانہ مقرر کیا ہے جس میں ایک ہی عمل کہیں ''دہشت گردی'' قرار پاتا ہے اور کہیں ''حق مدافعت'' اور اسلام کو مزید بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو بھی دہشت گردی سے مربوط کر دیا گیا ہے، اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم جہاد کے صحیح مفہوم کو سمجھیں اور ان حالات اور مواقع کو سامنے رکھیں جن میں جہاد کی اجازت دی گئی۔

عربی زبان میں ''جَہد'' (ج کے زبر کے ساتھ) کے معنی طاقت کے ہیں اور جُہد (ج کے پیش کے ساتھ) کے معنی مشقت کے ہیں، جہاد اسلام کی اشاعت و حفاظت کے لئے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے اور اس راہ میں ہونے والی مشقتوں کو انگیز کرنے کا نام ہے، گویا جہاد ایک وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے، جس کا مقصد حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین کی کوشش وکاوش ہے، جہاد کے مختلف وسائل و ذرائع ہیں، زبان و بیان بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنے کو سب سے افضل جہاد قرار دیا: ''أفضل الجهاد كلمة عدل عند السلطان الجائر''۔ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۰۱۱)

جہاد کا ایک ذریعہ اس زمانہ میں قلم بھی ہے؛ بلکہ یہ نہایت مؤثر ذریعہ ہے، کوئی مسلمان اپنا قلم دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے وقف کر دے تو یہ بھی جہاد میں شامل ہے، آج کل دوسرے ذرائع ابلاغ بھی کسی فکر کی ترویج و اشاعت اور اس کے غلبہ کے لئے نہایت مفید اور مؤثر ہیں اور یہ بھی معنوی جہاد میں شامل ہیں۔

جہاد کی آخری اور سب سے مکمل صورت ''جہاد بالسیف'' ہے، یعنی اعداءِ اسلام کے خلاف طاقت کا استعمال؛ لیکن اس کے لئے کچھ شرطیں اور تفصیلات ہیں، ایسا نہیں ہے کہ کسی

مسلمان کی نظر جس غیر مسلم پر پڑ جائے یا جو غیر مسلم اس کی گرفت میں آجائے وہ اس کا کام تمام کر دے، یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے، جہاد کے سلسلہ میں قرآن نے ہمیں واضح طور پر بتایا کہ جو لوگ تم کو مرنے اور مارنے کے درپے ہوں تم بھی ان سے جہاد کرو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ . (البقرۃ:۱۹۰)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں، اول یہ کہ جہاد کا آخری درجہ جسے قرآن مجید میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں، جو مسلمانوں کے ساتھ بہتر رویہ رکھتے ہوں، ان سے قتال کا حق نہیں ہے، ایک اور موقع پر قرآن مجید نے اس حکم کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ارشاد ہے :

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ . (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کرتے ہوں اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالتے ہوں، اللہ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ جہاد کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہوں اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم سے جنگ و جدال کا تہیہ کئے ہوئی ہو، تو اگر ان سے جنگ نہ کی جائے گی تو کیا ان کے لئے پھول کی سیجیں بچھائی جائیں گی؟

اوپر جس آیت کا ذکر ہوا ہے، اس میں دوسری اہم بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اسلام حالتِ جنگ میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان اخلاق اور انسانیت کی حدود کو پھلانگ جائیں، اسی کو قرآن مجید نے ''اعتداء'' یعنی ''زیادتی'' سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ سے اس کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کا مُثلہ کرنا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، مذہبی شخصیتوں کا قتل اور درختوں کو جلانا ہے، (تفسیر ابن کثیر:۱/۲۶۶) رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی انسان کو جلانے کی سزا دی جائے، کہ اس سزا کا حق صرف اللہ کو ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اس ہدایت کو ملحوظ رکھا، انسانوں کو زندہ جلانے کی المناک اور انسانیت سوز صورت یا تو ان عیسائیوں کے یہاں ملتی ہے، جن کی مذہبی عدالتیں عقیدہ سے اختلاف رکھنے والوں کو زندہ نذر آتش کر دیا کرتی تھیں، یورپ کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ کی کتابوں میں بہ کثرت اس کا ذکر آیا ہے دوسرے ہندوستان میں بیوہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جرم بے گناہی میں زبردستی جلا دیا جاتا تھا، جسے ''ستی'' کا نام دیا جاتا تھا، یہی ظالمانہ روایت ہے جس کو ابناء وطن اس وقت گجرات میں دہرا رہے ہیں۔

افسوس کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاد کے وسیع مفہوم کو صرف قتال میں محدود کر دیا ہے اور اسلام کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں رواداری، تحمل، قوتِ برداشت اور دیگر اہل مذہب کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو؛ بلکہ وہ چاہتا ہو کہ ہر ''غیر مسلم'' کو تہہ تیغ کر دے، یہ لفظ جہاد کی نہایت ہی غلط اور خلاف واقعہ توضیح ہے، جو اسلام کے سر ڈال دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی غیر مسلموں کے تین طبقے ہیں، ایک تو وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں آباد ہوں، ان کو ''ذمی'' یا ''اہل ذمہ'' کہا جاتا ہے، دوسرے وہ غیر مسلم جن کے ساتھ اقتدار میں شرکت اور بقاء باہم کے اُصول پر مسلمان ایک ملک میں رہتے ہیں، اس طرح کے غیر مسلموں کے لئے فقہاء کے یہاں ''معاہد'' کی تعبیر ملتی ہے، یعنی وہ شخص جس سے

عہد ہو چکا ہے، ان دونوں سے جہاد نہیں ہے؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی جان و مال کو مسلمانوں ہی کی جان و مال کی طرح قابل احترام قرار دیا ہے: "دمائهم كدمائنا و أموالهم كأموالنا" ہاں اگر یہ مسلمانوں پر زیادتی کریں تو اپنی مدافعت کرنا اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان سے ظلم کا بدلہ لینا جائز ہے اور دنیا کے ہر قانون میں انسان کے لئے اس حق مدافعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

جہاد ان لوگوں سے ہے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ ہو، وہ مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکتے ہوں اور انھیں ان کے وطن سے بے وطن کرنا چاہتے ہوں، جیسا کہ اس وقت اسرائیل فلسطینیوں یا سرب بوسینیائی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف اسلام نے قتال کی اجازت دی ہے اور یہ صرف اسلام کی بات نہیں، دنیا کے تمام مذاہب اور مہذب قوانین میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرے تو اسے مدافعت اور جنگ کی اجازت اور ان سے جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

آج دنیا کی بہت سی قومیں بلا وجہ محض مادی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے دوسری قوموں پر حملہ زن ہو رہی ہیں اور ایسے مہلک اسلحہ استعمال کر رہی ہیں، جن کی ہلاکت خیزیاں حساب و شمار سے باہر ہیں، بلا دلیل و ثبوت اپنے مخالفین کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور بے مقصد جنگیں مسلط کر دی جاتی ہیں؛ لیکن اسے دہشت گردی نہیں کہا جاتا اور مظلوم کی آہ و فغاں کو بھی سرکشی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کس قدر غیر منصفانہ اور نامعقول رویہ ہے؟۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود جہاد کی حقیقت سے واقف ہوں، اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ جہاد کیا ہے؟ جہاد کن قوموں سے ہے؟ اور جہاد کا موقع و محل کیا ہے؟ تاکہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں اور جو زہر لوگوں کے ذہن میں بھی پیوست کیا جا رہا ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ اس کا جواب دے سکیں اور لوگوں کو زہر کا تریاق فراہم کر سکیں، افسوس کہ اسلامی لٹریچر سے بے توجہی اور اسلام کے بارے میں حد درجہ ناآگہی کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم دوسرے کی غلط فہمی تو کیا دور کرتے کہ خود ہی ان پروپیگنڈوں

سے متاثر اور مرعوب ہوئے جاتے ہیں اور خود ہمارا ذہن شکوک وشبہات کی تاریکی میں بے سمت ہوا جاتا ہے، ہمیں ایسے حساس موضوعات پر قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا چاہیے، سلف کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور اصحابِ نظر علماء سے صحیح صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کرنی چاہیے!

(۲۶/اپریل ۲۰۰۲ء)

اسلام ـــــ دین اعتدال

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط وتفریط انسان کے لئے ناگوار خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیزیں بھی اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں یا حدِ ضرورت سے کم ہو جائیں تو انسان کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور انعام خداوندی کے بجائے عذاب آسمانی بن جاتی ہیں، ہوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؛ لیکن جب آندھیاں چلتی ہیں تو یہی حیات بخش ہوا کتنی ہی انسانی آبادیوں کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیتی ہیں، پانی زندگی وحیات کا سرچشمہ ہے؛ لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرے سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد وآباد بستیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں، قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظام کشش (Grawtatianal Syrtem) ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوت کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے گھٹ جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد و قامت بلی اور چوہے کی طرح ہو جائے، اور بڑھ جائے تو انسان اونچے درختوں؛ بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہو جائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہو جائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی اور گھٹ جائے تو زمین پر ناقابل برداشت گرمی ہوگی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے اور یہ ترازو ربّ کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ اپنے

بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں اور افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں عدل کا حکم دیتے ہیں: ''اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالْعَدْلِ '' (النحل:۹۰) عدل کی روح اعتدال ہے اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں؛ بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے، قرآن وحدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار ورفتار، خوشی وغم، سلوک وبرتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط وتفریط ناپسندیدہ ہے اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے اور اس میں اترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم زمین میں اترا کر نہ چلو، کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو: ''وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحاً اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً'' (الاسراء:۳۷) بول چال میں اعتدال چاہئے، نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے، نہ اتنی بلند ہو کہ حد اعتدال سے گذر جائے، قرآن کہتا ہے کہ آواز حسبِ ضرورت پست ہونی چاہئے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے؛ لیکن سب سے ناپسندیدہ: ''وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ''۔ (لقمان:۱۹)

لباس وپوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو، آپ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی؛ لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے، تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آنا چاہئے، غرض کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط، ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بہ تاکید حکم فرمایا، (ترمذی، حدیث نمبر:۲۷۶۳) دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ سے آپ ﷺ کچھ ڈاڑھی تراشا بھی کرتے تھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر:۲۷۶۲)

دُعاء کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو؛ بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دُعاء کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا: ''اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ، اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ '' (الاعراف:۵۵) بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا حق دیا گیا، ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۰۹۸) لیکن چوں کہ ولی کی شرکت کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں: ''لا نكاح الا بولی''۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے؛ لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قاعدۂ قانون اور اُصول کے دائرہ میں ہو اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو: ''وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَاناً فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ '' (الاسراء:۳۳) انفاق اسلام میں کس قدر مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے؛ لیکن قرآن نے یہاں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لو اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود تمہارے لئے حسرت اور لوگوں کی ملامت کا سبب بن جائے: ''وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْماً مَّحْسُوْراً '' (الاسراء:۲۹) ایک صحابی اپنی پوری جائیداد اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے تو آپ ﷺ نے اعتدال کا حکم دیا اور غلو کو منع فرمایا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسلسل روزے رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے، آپ ﷺ کو علم ہوا تو ناپسندیدگی ظاہر کی اور فرمایا: کبھی روزے رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی؛ کیوں کہ تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی اور تمہاری بیوی کا بھی، (بخاری، حدیث نمبر:۱۹۷۷) اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ سے بھی ارشاد فرمائی، (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۳۶۹) اگر کسی شخص کو روزہ رکھنے کی طرف بڑی رغبت ہو تو اسے ''صوم داؤدی'' رکھنے کا حکم دیا گیا، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے کا حکم ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے،

آپ ﷺ نے اس کو روزہ رکھنے کا سب سے معتدل طریقہ قرار دیا: "وھو اعدل الصیام وھو صیام داؤد"۔ (ابوداود، حدیث نمبر: ۲۴۲۷)

حلال و حرام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعتدال کا حکم فرمایا، جہاں اس بات کو منع کیا گیا کہ آدمی حرام کو اپنے لئے حلال کر لے، وہیں یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو، دین میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حلال کو بھی حرام نہ کرلیا جائے: "وَلَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا" (المائدہ:۸۷) جہاد میں دین و ایمان اور نفس و جان کا علانیہ دشمن سامنے ہوتا ہے؛ لیکن اس موقع پر بھی راہِ اعتدال کی رہنمائی کی گئی، کہ جو تم سے برسر جنگ ہو تمہاری جنگ ان ہی لوگوں تک محدود ہونی چاہئے اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے: "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا" (البقرۃ:۱۹۰) انسان جوشِ انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور حدِ اعتدال سے گذر جاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں: "فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ" . (البقرۃ:۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداء اسلام نے تمہیں مسجد حرام سے روک رکھا ہے؛ لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہو جانے کا باعث نہ بنے، (المائدۃ:۲) —— تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ جائز نہیں کہ کسی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی صورت پیدا ہو جائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو راہِ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں، بصارت بھی چھین لیتی ہے اور اسے اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت وعداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہو تو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو قومیں گمراہ ہوئی، ان کی گمراہی کا باعث یہی ہوا، غلو آمیز محبت، یا انکار ونفرت، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے، دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا، دوست اور مرکز عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو اور مبالغے اور تملق وخوشامد کو ناپسند کیا گیا، قرآن مجید کہتا ہے کہ کسی سے عداوت ہو، تو اس کو بھی حد اعتدال سے باہر نہ جانے دے، ممکن ہے کہ کل ہو کر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرما دے: ''عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً'' (الممتحنة:۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اسے مزید واضح فرمایا، حضرت ابو ہریرہ ؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اپنے دوست سے حد اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۹۸) غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب وثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت وناموری کے بام کمال تک پہنچیں، آج وہی اُمت افراط وتفریط، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے، زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا، تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی دونوں کی مثال نہیں ملتی، احترام وعقیدت میں ذرہ کو آفتاب بنانا اور اختلاف وعداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو وجہ انتشار بنانا ہمارا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، ہمارا ایک گروہ حکومت وقت کے اشارہ پر آگ کو پانی کہنے میں بھی نہیں شرماتا، اور ہمارا ایک طبقہ چنگاری جیسے واقعہ پر خود شعلہ بن جاتا ہے، لوگوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ

میں ہماری بے اعتدالی دن رات کا مشاہدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ افراط وتفریط آخرت میں اللہ کی پکڑ اور دنیا میں قوموں کی رسوائی کا سامان ہے اور اعتدال ومیانہ روی آخرت میں سرخ روئی اور دنیا میں کامیابی کی کلید!!

(۸/مارچ ۲۰۰۲ء)

مجسمہ کا انہدام — غور وفکر کے چند پہلو

افغانستان دو ہزار سال پہلے بودھوں کے زیر حکومت تھا، اس وقت بودھوں نے اس خطہ کے مختلف شہروں میں بودھ کے مجسمے تعمیر کئے تھے، پہاڑوں کو تراش کر قصور ومحلات تیار کرنا اور مجسمے بنانا اس عہد کا خاص فن تھا اور غالباً وسط ایشیاء کے علاقہ میں بودھوں نے اس کو بہت فروغ دیا، کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا شہر 'بامیان' کسی زمانہ میں بودھ حکومت کا دارالحکومت تھا؛ چنانچہ اس شہر میں دو نہایت ہی عظیم الشان اور دیوہیکل مجسمے جن کی بلندی ۵۳ اور ۳۸ میٹر ہے، اونچی پہاڑیوں سے تراش کر بنائے گئے تھے، اس وقت طالبان نے پورے ملک افغانستان سے مجسموں کے انہدام اور انھیں بے نام ونشان کر دینے کی کاروائی شروع کی ہے، یہ دونوں مجسمے اس کی زد میں ہیں، اس کارروائی نے پوری دنیا میں ایک آگ سی لگادی ہے، مشرق ومغرب اور شمال وجنوب سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، ہمارا ملک ہندوستان جو اپنے ملک میں ہونے والی بڑی سے بڑی زیادتی کو بھی داخلی مسائل کا نام دے کر دوسروں کے اعتراض کو رد کرنے کا عادی ہے، وہ بھی اس کے خلاف بیان بازی میں پیش پیش ہے اور مسلم ممالک جن کا رویہ ادھر عرصہ سے مسلمانوں کے مسائل میں نہایت ہی بزدلانہ ہوا کرتا ہے، وہ بھی اس موقع پر طالبان کو اپنی ''نصائح'' سے مستفید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے، طالبان کے اس اقدام میں کئی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی طاقتوں کا رویہ کیا عدل پر مبنی ہے، یا ایسے مسائل میں دوہرا رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ دوسرے ہمارا ملک ہندوستان کیا بودھوں سے واقعی محبت رکھتا ہے اور ان کا ہمدرد ہے؟ یا یہ محض بودھوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کرنے کی ایک سازش

ہے؟ تیسرے دوسرے مذاہب کے آثار کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور کیا طالبان کا عمل اسلامی نقطۂ نظر کی واقعی نمائندگی کرتا ہے؟

کوئی حقیقت پسند اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جو رویہ آج طالبان نے بودھ مجسموں کے بارے میں اختیار کیا ہے، مغربی دنیا اس سے کہیں زیادہ سنگین اور ستم انگیز معاملات پر خاموشی اختیار کرتی رہی ہے، اگر ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو، بوسنیا میں بے قصور اور نہتے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ مظالم نہ ڈھائے گئے، بوڑھوں، بچوں کا قتل عام کیا گیا، بوڑھی خواتین سے لے کر نابالغ لڑکیوں تک کی برسرعام آبروریزیاں کی گئیں، کتنی ہی تاریخی مسجدوں کو شہید کر دیا گیا اور یہ سب کچھ امریکہ و برطانیہ جیسے ممالک کی درپردہ مدد کے ذریعہ کیا گیا، صابرہ اور شتیلہ میں اسرائیلیوں نے قتلِ عام کیا، اور ہزاروں عربوں کو ان کے گھر سے جبراً نکال دیا گیا، مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی گئی، دنیا کے مختلف عیسائی ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناقابل بیان مظالم ڈھائے جارہے ہیں، یوباسٹی کیلی فورنیا میں دس لاکھ ڈالر خرچ کر کے ایک مسجد تعمیر کی گئی، جسے ۱۹۹۵ء میں دہشت گرد عیسائی تنظیموں نے جلا کر خاکستر کر دیا، لیکن ان خون ریز اور انسانیت سوز واقعات پر نہ مغرب کا دل بے قرار ہوا، نہ مشرق کی رگِ انسانیت پھڑکی؛ لیکن عجیب بات ہے کہ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والے اور معصوم انسانوں کی لاشوں پر رقص و سرود کی محفلیں جمانے والے آج بے جان مجسموں کے انہدام پر اس قدر گریہ کناں اور مشغول آہ و فغاں ہیں کہ گویا اس سے زیادہ خراب اور تکلیف دہ کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔

روسیوں کے افغانستان سے جانے کے بعد سے پورے ملک افغانستان میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، باہم خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اندیشہ تھا کہ یہ ملک چھوٹی چھوٹی قبائلی ٹکڑیوں میں بکھر کر رہ جائے گا، ان حالات میں طالبان اُٹھے اور انھوں نے ملک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ۹۵ فیصد سے بھی زیادہ علاقوں پر ان کی مستحکم حکومت قائم ہوگئی، انھوں نے ملک کو امن و آشتی اور عدل و انصاف سے ہمکنار کیا اور اس ملک کی وحدت کو برقرار رکھا، ان کی یہ فتح مندی صرف ان کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہیں تھی:

بلکہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ تھی اور امن کے لئے بے قرار عوام ہر جگہ ان کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے، انصاف اور معقولیت کا تقاضہ یہ تھا کہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا اور انھیں عالمی اداروں میں نمائندگی دی جاتی، ایسی صورت میں افغانستان سے دنیا بھر کے روابط برقرار رہتے اور ان سے صلح کی میز پر گفتگو کرنا ممکن ہوتا؛ لیکن جو ممالک آج دور سے آہ وزاری کر رہے ہیں، انھوں نے خود ہی اس دروازہ کو بند کر رکھا ہے جس سے کوئی مصالحانہ گفتگو کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔

ہمارے ملک ہندوستان کے لئے ایک محب وطن کی حیثیت سے صحیح مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے، بابری مسجد جو کئی سو سالہ قدیم مسجد تھی، جس میں نمازوں کا سلسلہ جاری تھا اور جہاں پہلے مندر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، اسے علانیہ شہید کر دیا گیا اور جن بد بختوں نے مسجد کو شہید کیا، وہی آج قومی ہیرو بنے ہوئے ہیں اور اب تک اس ظلم وناانصافی کی تلافی کی طرف کوئی قدم بھی نہیں اُٹھایا گیا تو جو لوگ ایک ایسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کے مجرم ہوں جس میں عبادت کرنے والے لوگ اس ملک بلکہ اس شہر میں بالفعل ابھی موجود ہوں، وہ ایک ایسے مجسمہ کے انہدام پر اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ کہ اس ملک میں اس مذہب سے تعلق رکھنے والا ایک متنفس بھی اب موجود نہیں۔

پھر برادرانِ وطن کو کچھ اپنے دامن کے داغ پر بھی نظر کرنی چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ بودھوں پر ہندوؤں سے بھی بڑھ کر کسی قوم نے مظالم ڈھائے ہیں؟ ہندوستان تو پورا ملک ہی بودھوں کا تھا، ہندوؤں اور آریاؤں نے ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انھیں ہندوستان چھوڑ کر، چین، جاپان، کمبوڈیا، برما اور سری لنکا وغیرہ کے علاقوں کی پناہ لینی پڑی، یہاں تک کہ بعض بودھ مندروں پر آج بھی ہندو فرقہ پرستوں نے قبضہ کر رکھا ہے، اجنتا اور ایلورا کے غار جن میں بودھ خانقاہیں تھیں، وہ بودھوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جور وستم پر گواہ ہیں، کہ بودھ راہب جب ترک وطن پر مجبور ہو گئے تو انھوں نے اپنی ان عظیم الشان خانقاہوں کو مٹی سے بند کر دیا؛ تاکہ وہ ان کے دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، یہ بھی دلیری کی انتہا ہے کہ آپ

نے جس قوم کو غلام بنایا ہے، جن کے لہو سے ہولی کھیلی اور جنھیں ترک وطن پر مجبور کر دیا، آپ ان مظالم پر خود شرمندہ ہونے کے بجائے دوسروں کو زیادتی کا طعنہ دیں، اور اپنے آپ کو اس قوم کے ایک ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کریں، واقعہ ہے کہ ہندوستان جب تک بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کر لے، اس کو یہ بات بالکل زیب نہیں دیتی کہ وہ دوسروں کے مسائل پر اظہار خیال کرے۔

جہاں تک اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو دو باتیں بالکل واضح ہیں: اول یہ کہ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے اور ایک مسلمان کے لئے شرک کسی بھی درجہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتا، جیسے ایک غیرت مند شوہر بیوی کی ہر کمزوری کو سہہ سکتا ہے اور ہر ناز کو برداشت کر سکتا ہے؛ لیکن اس کی بدچلنی کو گوارا نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان کے لئے خدا کے ساتھ شرک کا معاملہ قطعاً ناقابل برداشت ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں شرک کو اسی تمثیل سے سمجھایا ہے، جو قوم پہلے سے شرک میں مبتلا ہو، اس کے لئے نئے خداؤں کو وجود میں لانا یا کسی نئی طاقت کو خدا مان لینے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں؛ کیوں کہ اگر کوئی شخص سو خداؤں کو مانتا ہو تو ۱۰۱ واں خدا اس کے عقیدہ کو متاثر نہیں کرتا؛ بلکہ شاید اس کو خوشی ہی ہو کہ اسے ایک اور بھگوان ہاتھ آگیا ہے، اسی لئے ہندو بھائی یہ پیشکش کرتے رہے ہیں کہ جہاں ہم اور بھگوانوں کی پرستش کرتے ہیں، ہم محمد (ﷺ) کی پرستش کرنے کو بھی تیار ہیں، والعیاذ باللہ ،لیکن جو شخص ایک خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اس ایک کے ماسوا سبھوں کا انکار کرتا ہو، اس کے لئے مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور مختلف آستانوں پر جبین بندگی خم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کر لے، تو وہ مسلمان باقی ہی نہیں رہتا، یہ عقیدۂ توحید اتنا معقول، قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور مدلل ہے کہ جو لوگ شرک کے مرتکب ہیں، وہ بھی تھوڑی سی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد خدا کی وحدت کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں پاتے، یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں تو اس قدر غیرت مند ہو کہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی یا خود اپنی ذرا بھی غلط نسبت کو برداشت نہیں

کرے؛ لیکن اپنے خالق و مالک کے معاملہ میں اس قدر بے غیرت اور تساہل سے عاری، کہ ہر دن نئے خالق و مالک کی اپنے ہاتھوں تخلیق کرتا جائے اور اس مسئلہ پر تفکر و تدبر کے لئے بھی تیار نہ ہو۔

دوسرا اُصول مذہبی رواداری اور دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا ہے، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ اس بات پر قادر تھے کہ یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کرا دیتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، حضرت عمرؓ کے دور میں شام اور فلسطین کا علاقہ فتح ہوا، جہاں عیسائیوں کے بڑے چرچ اور گرجا تھے، حضرت عمرؓ نے انھیں اپنے حال پر رکھا، حضرت عمرؓ جب فتح بیت المقدس کے موقع سے وہاں تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت؛ بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی، تو پھر اسی چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی، کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کر دینے کی کوشش نہ کریں، اس کے بعد متولیان چرچ کی خواہش کے باوجود آپ نے چرچ میں نماز ادا نہیں فرمائی کہ مسلمان جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش کریں گے، حضرت معاویہؓ نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپؓ نے عیسائیوں سے پیشکش کی کہ یہ منہ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں؛ تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جاسکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا تو آپ خاموش ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مفتوحہ علاقوں میں کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، مصر کا علاقہ جہاں اہرامِ مصر واقع ہے اور جن میں فرعون کے مجسمے بھی ہیں، عہد فاروقی ہی میں فتح ہو گیا؛ لیکن مسلمانوں نے عہد شرک کی ان یادگاروں کو منہدم کرنے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ عجائبِ عالم مصر کی زمین پر موجود ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، خود افغانستان کا علاقہ ابتدائی دور ہی میں فتح ہوا ہے اور کم و بیش پونے چودہ سو سال سے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، افغانستان میں توقع ہے کہ بعض صحابہؓ نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہوگا، تابعین تو بہت سے آئے ہوں گے اور اولیاء صالحین تو نہ جانے کتنے پیدا ہوئے ہوں؛

لیکن ان حضرات نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع سے بیت اللہ شریف کے بتوں کو منہدم فرمایا اور مکہ میں جہاں کہیں جو بت تھے، انھیں صاف کرنے کا حکم دیا؛ لیکن یہ ایک استثنائی (Exeptional) واقعہ ہے، مکہ دین توحید یعنی اسلام کا اعتقادی دار الخلافہ ہے، اس لئے ضروری تھا کہ وہاں شرک کے مظاہر باقی نہ رہیں، پھر اس شہر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بسایا تھا اور اس گھر کو خالصتاً ایک اللہ کی عبادت کے لئے اللہ کے ان دو بندوں نے بنایا تھا، اس طرح یہ ابتداء ہی سے توحید کا مرکز تھا، جسے ناروا طریقہ پر بت پرستی کا مرکز بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اس لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ قدم اُٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت طالبان کا یہ اقدام مصلحت وقت کے خلاف اور ان لوگوں کو نفع پہنچانے والا ہے جو مسلمانوں کو دہشت گرد اور شدت پسند بتاتے ہیں اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی نفرت انگیز غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ایسا ملک جو صد فیصد مسلمان ہے اور جہاں ان مجسموں کی پہلے سے بھی کوئی پذیرائی نہیں تھی، وہاں ان کا باقی رہنا چنداں مضر نہیں تھا، ان حالات میں اس رواداری اور وسیع النظری کی راہ کو اختیار کرنا بہتر ہوتا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی تاریخی روایات کے مطابق ہے اور اس طرح کا عمل بسا اوقات ردعمل کو جنم دیتا ہے اور یہ ہرگز بہتر بات نہ ہوگی کہ کوئی مسلمان ناشائستہ ردعمل کا سبب بنے، قرآن نے اسی لئے معبودانِ باطل کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا، کہ اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ بھی جواب میں شان باری تعالی میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے اور بالواسطہ طریقہ پر ہم اس کا سبب بنیں گے۔ (الانعام:۱۰۸)

(۱۶؍ مارچ ۲۰۰۱ء)

کیا کافر کہنا توہین ہے؟

کوئی انسان خود اپنی مرضی اور خواہش سے دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے اور نہ کوئی شخص اپنی خواہش اور مرضی سے دنیا سے واپس ہوتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو انسان کو دنیا میں بھیجتی ہے اور ایک مقررہ وقت کے بعد اسے واپس بلالیتی ہے، یہ کون سی طاقت ہے؟ اس سلسلہ میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب اس فطرت کی کرشمہ سازی ہے جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے، جو لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں اور ملحد و دہریہ ہیں، کائنات کے وجود اور اس کے بقاء کے سلسلہ میں ان کا یہی نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فطرت کو پھر بھی ایک خالق کی ضرورت ہے، جس نے مختلف چیزوں میں الگ الگ صلاحتیں رکھی ہیں، ایسا کیوں ہوا کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ٹھنڈک دیتا ہے؟ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ آگ ٹھنڈی ہوتی اور پانی گرم ہوتا، گلاب کی فطرت میں سرخی اور موتیے کی فطرت میں سفیدی رکھی گئی، بکری ایک مسکین طبیعت جانور ہے اور شیر درندہ صفت، یہ اختلافِ فطرت کیوں ہے؟ پھر اگر زندگی اور موت فطرت کے تابع ہوتی ہر شخص کو ایک متعینہ وقت پر ہی موت آتی، ہر شخص ایک مقررہ وقت پر ہی باپ بنتا؛ لیکن ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس قانونِ فطرت کا بھی کوئی خالق ہے، جس کے سامنے فطرت سرِ تسلیم خم کئے ہوئی ہے اور پل پل اس کے حکم کی تابع دار ہے، اسی اَن دیکھے وجود کا نام ''خدا'' ہے، خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ، خدا کا انکار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ معمولی اور انگلیوں پر قابل شمار رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یقین بجائے خود فطرتِ انسانی کا ایک حصہ ہے، دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں، قریب قریب یہ ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے۔

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات کو بھی ماننے پر مجبور ہیں کہ ان کو اسی طریقہ کو

اپنانا چاہئے جو خدا کی طرف سے ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو؛ کیوں کہ جو کسی مشین کو بناتا اور وجود میں لاتا ہے اسی کی ہدایت کے مطابق وہ چیز استعمال بھی کی جاتی ہے، خدا کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کا نام ''دین'' ہے اور اسی کو لوگ ''مذہب'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دو متضاد چیزیں بیک وقت درست نہیں ہوسکتیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دن ورات ایک ہی ہے، روشنی اور اندھیرا جداگانہ حقیقتیں نہیں ہیں، میٹھا اور نمکین ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں، تو یہ بات یقیناً سچائی کے خلاف ہوگی ، یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کو میٹھا پسند ہو تو نمکین پسند کرنے والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، اگر کسی کو اندھیرا بھاتا ہو تو وہ روشنی پسند کرنے والوں سے الجھے نہیں؛ لیکن یہ کہنا کہ روشنی اور اندھیرا دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، یقیناً ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ بات ہوگی۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل دین ایک ہی ہے، اسی دین کو لے کر پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اس کائنات میں اُترے، اسی کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی، اسی نعرۂ حق کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل نے اپنے اپنے عہد میں بلند فرمایا، ہر قوم اور ہر زبان میں اسی صراطِ مستقیم کی سوغات لے کر انبیاء ورُسل پہنچے، جس کا سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوا: ''إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامُ '' (آل عمران:۱۹)

اس لئے اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا، خدا نے کھانے کے لئے الگ نالی بنائی ہے اور سانس لینے کے لئے الگ نالی ، اگر کوئی شخص سانس کی نالی میں کھانے کا لقمہ رکھ دے، تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، اسی طرح ،نجات کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے، یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، بظاہر ایک اچھا نعرہ معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ تمام دواؤں کا ایک ہی اثر ہوتا ہے۔

جو لوگ مذاہب کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں، وہ دراصل مذہب کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں، جو لوگ ایک خدا کو مانتے ہوں، جو تین خداؤں پر یقین رکھتے ہوں اور جو

تین کروڑ خداؤں کے سامنے سر جھکاتے ہوں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں اور کیوں کر سوچا جاسکتا ہے کہ بیک وقت یہ تمام باتیں درست ہوں گی؟ جن لوگوں نے خدا کی طاقت کو مختلف لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے اور جن کے نزدیک خدا قادر مطلق ہے، اس کی طاقت میں کوئی شریک و سہیم نہیں، یہ دونوں سچائی پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے یہ کہنا کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

ایسی صورت میں ہر مذہب کو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہ کوئی تعبیر اختیار کرنی ہوتی ہے، اس تعبیر کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو دوسرے مذہب پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، ان کے لئے اہانت آمیز لفظ استعمال کیا جائے، جیسے ہندو مذہب کی بعض کتابوں میں غیر ہندو کے لئے "ملیچھ" (ناپاک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کے لئے اہانت آمیز تعبیر ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک تعبیر اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے ہو اور ایک اس کے نہ ماننے والوں کے لئے، جس کا مقصد ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہو، اکثر آسمانی کتب میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو یہودا کی نسبت سے یہودی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے عیسائی کہا گیا اور تورات و انجیل میں اس زمانے کے اس دین حق پر ایمان نہ رکھنے والوں کے لئے "کافر" کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس انکار کو "کفر" کہا گیا۔

یہی تعبیر آخری، مکمل اور محفوظ کتاب ہدایت قرآن مجید میں بھی اختیار کی گئی ہے، جو لوگ اس کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو "مسلم" یا "مومن" کہا گیا، یعنی احکام اسلام کو ماننے والا اور اسلامی تعلیمات پر یقین رکھنے والا اور اس کے انکار کو "کفر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا؛ چنانچہ قرآن مجید میں دین اسلام سے انحراف اور اس انحراف پر یقین رکھنے والوں کے لئے مختلف صیغوں میں "کفر" اور "کافر" کا لفظ ۴۹۴ بار استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ کوئی نئی تعبیر نہیں ہے۔

عربی زبان میں کفر کے اصل معنی چھپانے کے آتے ہیں، اسی لئے رات کے لئے بھی کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ وہ بھی اپنے پردۂ ظلمت میں لوگوں کو چھپاتی ہے، کاشتکار چوں کہ بیج کو زمین کی تہہ میں چھپا دیتا ہے، اس لئے عربی زبان میں کاشتکار کو بھی بعض اوقات کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، (مفردات القرآن :۲/۵۵۹) غالباً اسی مناسبت سے یہ لفظ سمندر اور اندھیرے بادل کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، (القاموس المحیط :۶۰۵) کہ سمندر اپنی تہوں میں کتنی ہی جمادات و نباتات کو چھپائے ہوئے ہے اور گھنا بادل دھوپ اور فضاء میں نپائی جانے والی چیزوں کے لئے حجاب بن جاتا ہے، جو شخص ناشکرا اور جذبۂ شکر سے عاری ہو، وہ گویا اپنے محسن کی طرف سے آنے والی نعمت کو پردۂ خفا میں رکھ دیتا ہے، اس لئے ناشکری کے لئے بھی کفر کی اصطلاح استعمال ہوئی، خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (مفردات القرآن :۲/۵۵۹)

کسی بھی زبان میں ایک لفظ کا جو حقیقی معنی ہوتا ہے وہ براہِ راست اور بالواسطہ مناسبتوں کی وجہ سے نئے نئے پیکر میں ڈھلتا رہتا ہے، ناشکری میں نعمتوں سے جحود وانکار کا معنی پایا جاتا تھا، اس مناسبت سے کافر کا معنی مطلق انکار کرنے والا قرار پایا اور جو لوگ اسلامی عقیدہ اور نظامِ حیات کو نہ مانتے ہوں، ان کے لئے کافر اور ان کی انکاری فکر کے لئے کفر کا لفظ استعمال ہونے لگا: ''واعظم الکفر جحود الوحدانیة أو الشریعة أو النبوة'' (مفردات القرآن :۲/۵۵۹) قرآن مجید میں بھی غیر مسلموں کے لئے کافر کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا، علمائے یہود سے کہا گیا کہ تم اسلام کے اولین منکر نہ بن جاؤ: ''وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ'' (البقرۃ:۴۱) قرآن نے ایک موقع پر حج کو فرض قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو اس کو نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں: ''مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ'' (آل عمران:۹۷) مشرکین مکہ آخرت کے جزاء و سزا کے منکر تھے؛ چنانچہ ان کے انکارِ آخرت کو قرآن میں اس طرح تعبیر کیا گیا: ''وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ''. (یوسف:۳۷)

یہاں کفر کے معنی انکار کرنے اور تسلیم نہ کرنے کے ہی ہیں، قرآن نے قیامت کا نقشہ

کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ اہل دوزخ جب شیطان پر لعنت ملامت کریں گے، تو شیطان نہایت ڈھٹائی سے کہے گا کہ تم نے جو مجھ کو خدا کا شریک ٹھہرایا تھا، میں اس کا انکار کرتا ہوں، اس انکار کو قرآن نے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: ''اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ '' (ابراہیم:۲۲) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے اور سحر کا انکار کرنے والے کے توحید سے منکر ہونے کو لغوی معنی میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے: ''وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ''۔ (الزخرف:۳۰)

دیکھئے یہاں شرک کے انکار کو نہیں؛ بلکہ توحید کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، گویا لغت کی رو سے کفر کے معنی، چھپانے، ناشکری کرنے، انکار کرنے اور نہ ماننے کے ہوئے۔

قرآن نے جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے، وہ اسی معنی میں ہے کہ یہ شخص اسلامی تعلیمات کا انکار کرتا ہے، گویا کافر کے معنی غیر مسلم کے ہوئے، جیسے کوئی شخص ہندو نہ ہو تو اس کو غیر ہندو اور عیسائی نہ ہو تو اس کو غیر عیسائی کہا جاتا ہے، اسی طرح جو شخص اسلام کو نہ مانتا ہو اسے غیر مسلم کہا جائے گا، عربی زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ''کافر'' کا لفظ ہے، یعنی ایسا شخص جو خدا کو ایک نہ مانتا ہو اور اسلامی افکار و معتقدات کا قائل نہ ہو، اس میں نہ کوئی خلاف واقعہ بات ہے، نہ کسی کی اہانت ہے، نہ نفرت و عداوت کا اظہار ہے، اگر کسی غیر مسلم کو مسلمان زبردستی مسلمان کہتے؛ جیسا کہ ہمارے ہندو بھائی ان لوگوں کو بھی ہندو کہنے پر مصر ہیں، جو پوری وضاحت و صراحت اور اصرار کے ساتھ اپنے ہندو ہونے کا انکار کرتے ہیں، تو یہ یقیناً ان کی توہین کی بات ہوتی، پس حقیقت یہ ہے کہ اگر اس لفظ کے معنی پر غور کیا جائے، تو جن لوگوں کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جارہی ہے، ان کے لئے یہ تعبیر محض ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے، نہ کہ یہ عداوت و نفرت پر ابھارنے والی تعبیر ہے۔

پھر غور کیجئے کہ قرآن مجید میں زیادہ تر اہل مکہ کو کافر کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے، اگر اس تعبیر میں توہین اور تمسخر مقصود ہوتا، تو عرب جو اس زبان کے رمز آشنا اور ذوقِ ادب کے حامل تھے، وہ اس پر معترض ہوتے؛ لیکن اہل مکہ کی طرف سے کوئی ایسا احتجاج سامنے نہیں آیا؛

بلکہ خود غیر مسلم اپنے کافر ہونے کا اقرار و اعتراف کرتے تھے اور کہتے تھے، کہ تم جو پیغام لے کر آئے ہو ہم اس سے کفر کرتے ہیں: "اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "۔ (الزخرف:۲۴)

عجب بات ہے کہ اس وقت اسلام کے خلاف مغربی میڈیا اور سنگھ پریوار نے جو بے جا شورش شروع کر رکھی ہے، وہ ایسی تیز آندھی کی طرح ہے، کہ اس میں اُڑنے والے خس وخاشاک کو بھی لوگوں نے گل وثمر سمجھ رکھا ہے اور دنیا آنکھ بند کر کے اس پر آمین کہتی جاتی ہے، سنگھ پریوار کے لوگ تو اپنے تعصب اور جہالت میں اس قسم کی بے معنی باتیں کہتے ہی رہتے ہیں، پچھلے دِنوں بمبئی کی ایک عدالت کا جو فیصلہ سامنے آیا، وہ نہایت حیرت کا باعث ہے، کہ اس لفظ کے اصل معنی ومقصود کو سمجھے اور اس کی مناسب تحقیق کیے بغیر اس کو توہین آمیز اور نفرت انگیز تعبیر قرار دے دیا گیا، کسی مسلمان کو کافر کہنا تو یقیناً اس کی توہین ہے؛ کیوں کہ یہ اس کے دعویٰ اسلام کو جھٹلانے کے مترادف ہے؛ لیکن جو شخص مسلمان نہ ہو، اس کو کافر کہنا ایک سچائی کا اظہار ہے نہ کہ توہین۔

(۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء)

مذہب کی تبدیلی

تمل ناڈو حکومت نے تبدیلیٔ مذہب کے سلسلہ میں جو آرڈی نینس (Ordinance) جاری کیا ہے، وہ فرقہ پرست عناصر کو خوش کرنے کا ایک حربہ اور ہندوستان کے جمہوری اقدار کا علانیہ قتل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج میں ایک عرصہ سے مذہب کی تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے، ہندو مذہب میں بنیادی طور پر کوئی ایسا ٹھوس عقیدہ نہیں پایا جاتا، جس کو ہندو عقیدہ اور آئیڈیالوجی (Ideo Logg) کا نام دیا جاسکے، جو لوگ ''رام'' کو بھگوان اور خدا مانتے ہوں، وہ بھی ہندو ہیں اور جو گ ''راون'' کو خدا قرار دیتے ہوں اور رام کو بُرا بھلا کہتے ہوں وہ بھی ہندو مذہب ہی کے علمبردار ہیں اور نہرو وغیرہ جیسے دانشور جو مورتی پوجا اور دیوی دیوتاؤں کے وجود کو توہم پرستی قرار دیتے ہوں وہ بھی ہندو ہیں، غرض ہندو مذہب ''موم کی ناک'' ہے، اس کی جو صورت چاہو، بنالو، توہم پرستی ہی کے نتیجے میں طبقاتی تقسیم ہندو عقیدہ کا اٹوٹ جزء ہے اور اسی لئے ہندستان میں ہزاروں سال سے دبے کچلے ہوئے لوگوں کا احساس ہے کہ ہندو مذہب دراصل مذہبی قالب میں ''برہمن واد'' کی حفاظت سے عبارت ہے، اس نظام نے صدیوں سے دلت اور پست طبقات کو اپنے طاقتور پنجہ میں دبا رکھا ہے، جب بھی انھوں نے انگڑائی لینے کی کوشش کی، نہایت ذہانت کے ساتھ ان پر اپنی گرفت اور مضبوط کردی گئی۔

حالاں کہ ہمارا موجودہ جمہوری ڈھانچہ ذات پات کے تصور کی نفی کرتا ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی برہمنوں کی تعداد تو چار، پانچ فیصد سے زیادہ نہیں، حکومت کے کلیدی عہدوں پر ان کی تعداد ۶۴ فیصد ہے، سیاسی تبدیلیوں سے چہرے بدلتے ہیں؛ لیکن اس حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، آج تک پست اقوام میں کوئی شنکراچاریہ اور مٹھ کا سربراہ نہیں بن سکا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندو قوم میں یہ مسئلہ محض ایک سماجی مسئلہ نہیں؛ بلکہ اس

کی جڑیں عقیدہ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، ان حالات نے دبے کچلے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہندوازم کے اس قید خانے سے اپنے آپ کو باہر نکالیں اور باعزت انسان کی طرح سماج میں زندہ رہیں، اس کے لئے مشہور رہنما امبیڈکر نے بودھ ازم کو قبول کیا؛ لیکن جلد ہی سمجھ دار اور باشعور لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ شراب کو آب سمجھنے کے مترادف ہے، بدھسٹ سماج کو ہندو سماج نے اس طرح جذب کر لیا ہے کہ گویا یہ قید خانہ کی ایک کوٹھری سے نکل کر دوسری کوٹھری میں داخل ہونا ہے، وہی سماج، وہی تہذیب، وہی رسوم ورواج، بس خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ، یا کچھ دیوتاؤں کی تبدیلی، یہاں تک کہ دستورِ ہند کے مطابق بھی اس تبدیلیٔ مذہب کے باوجود وہ ہندو ہی شمار کیا جاتا ہے،لوگ یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن مذاہب کی پیدائش اور نشو ونما ہندوستان کی سرزمین میں ہوئی ہے، برہموں نے اپنی ذہانت سے ان کا ایسا ''ہندوکرن'' کر دیا ہے، کہ اب کسی کے لئے ان مذاہب میں سے کسی کو اختیار کرنے کے باوجود ہندو سماج کے مظالم سے نجات پانا اور انصاف حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے بے چین اور بے قرار ذہن وفکر رکھنے والوں کے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں، عیسائیت یا اسلام؟ اس سے کسی حقیقت پسند غیر مسلم کو بھی انکار نہیں کہ اسلام کے عقائد اور اُصول جتنے صاف وشفاف، عقل وفطرت سے ہم آہنگ، متوازن اور انسانی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہیں، کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، اللہ کی وحدت اور انسانوں کی وحدت، یہ اسلام کا انقلابی تصور ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر خدا ایک ہے، اس کا کوئی خاندان، کنبہ نہیں اور کسی انسانی طبقہ سے اس کی قرابت مندی اور رشتہ داری نہیں تو اس سے خود بخود انسانی وحدت اور مساوات کا تصور اُبھرتا ہے، پھر اسلام میں کوئی عقیدہ ''پہیلی'' کی طرح نہیں کہ اس کا سمجھنا اور سمجھانا مشکل تر ہو، جیسا کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ایک میں تین اور تین میں ایک کا تصور (Concept of the Trinity) ہے، یا ''عقیدۂ کفارہ'' (The Atanement) ہے کہ غلطی کوئی کرے اور سزا حضرت مسیح علیہ السلام کو جھیلنی پڑے، اسی لئے مسلمان حالاں کہ اس ملک میں بہت تھوڑی تعداد میں آئے؛ لیکن اس

ملک کے باشندوں نے جو طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ظلم وجور سے دوچار تھے اور دیوتاؤں کی ایک فوج کی پرستش کرتے کرتے عاجز آچکے تھے، انھوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا، افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش اور برما تک جو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے وہ اسلام کی اسی کشش کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس ملک میں جبرا تبدیلیٔ مذہب کرایا ہے؛ لیکن یہ ایسا جھوٹ ہے کہ خود عقل عام اس کو جھٹلاتی ہے، ہندوستان کے جنوبی اور ساحلی علاقوں میں تو اسلام حضرت عمر فاروق ﷺ ہی کے عہد میں آچکا تھا اور نہ صرف پرجا بلکہ بعض راجاؤں نے بھی اسلام قبول کیا تھا، اس وقت یقیناً درۂ خیبر سے کوئی فوجی قافلہ ہندوستان نہیں پہنچا تھا، اس وقت جبر ودباؤ کی کیا گنجائش تھی؟ پھر غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اس ملک کے مختلف حصوں پر کم وبیش آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے، آج جب حکومت کے بغیر ہندو سماج میں تبدیلیٔ مذہب کا طوفان اُٹھا ہوا ہے اور کئی ریاستوں میں آبادی کا توازن بدل چکا ہے، تو اگر اتنا طویل عرصہ جبر ودباؤ سے کام لیا جاتا تو کیا یہ ملک مسلم اکثریت نہیں بن گیا ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ جبر ودباؤ تو الگ چیز ہے، مسلمان حکمرانوں نے تو عام طور پر اسلام کی تبلیغ ودعوت کی طرف بھی توجہ نہیں کی اور اشاعتِ دین کی طرف سے انتہائی تغافل برتا، ورنہ اگر اس سلسلہ میں تھوڑی بھی کوشش کی جاتی تو اسلام میں جو کشش ہے، یہی لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے کافی ہوتی۔

اسلام کے بعد اس ملک کے لوگوں کے لئے زیادہ قابل توجہ مذہب عیسائیت ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے سو سال میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد نے عیسائیت کو قبول کیا ہے، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کئی ریاستوں میں تو عیسائیت اکثریتی مذہب بن گیا، میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ دو ہے، ایک تو مادی وسائل کا استعمال، ہسپتال، درسگاہیں اور معاشی فلاح کے مراکز کے قیام وانتظام نے عیسائیت کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ مقامی آبادی میں اثر ونفوذ حاصل کرے اور ان میں داخل ہو سکے، دوسرے گو عیسائیت ایک عالمی مذہب اور ترقی

یافتہ قوم کا مذہب ہونے کی وجہ سے ہندوازم کے ساتھ مکمل طور پر جذب نہیں کی جاسکتی؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کا کوئی سماجی تشخص نہیں ہے، شادی، بیاہ، سماجی رسم ورواج وغیرہ میں وہ ہندو سماج ہی کا ایک حصہ بن گئے ہیں، ان کے پاس حلال وحرام اور جائز وناجائز کا کوئی مکمل نظامِ حیات نہیں، جو ان پر قیود وحدود عائد کرتا ہو اور اپنے پہلے معمولات سے روکتا ہو، اکثر اوقات تو نام بھی تبدیل نہیں کیے جاتے، بس کچھ تہواروں کا فرق ہوتا ہے، شرک پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے، مورتی کی پرستش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اس لئے جب کوئی ہندو عیسائی مذہب قبول کرتا ہے تو اسے بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس کی عملی زندگی میں تو کوئی انقلاب آتا ہی نہیں اور اسے فکر وعقیدہ کے اعتبار سے بھی کسی غیر معمولی تبدیلی سے گذرنا نہیں پڑتا۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں ایسی دورنگی اور دوعملی کو روا نہیں رکھتا، اسلام قبول کرنے کا مطلب خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ نہیں؛ بلکہ اللہ سے رشتہ جوڑ کر تمام توہمات سے رشتہ توڑنا ہے، اس کی عبادتیں الگ ہیں، اس کے تہوار الگ ہیں، وہ غیر مسلم خاندانوں سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا، وہ ایمان لانے کے بعد اپنے والدین کے ترکہ سے حصہ نہیں پاسکتا، اس کو کھانے، پینے، خریدنے، بیچنے، کمانے غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حلال وحرام کی حدیں قائم کرنی پڑتی ہیں اور حرام سے بچنا پڑتا ہے، دین یقیناً آسان ہے؛ لیکن جو نفس کی ہر خواہش پر لبیک کہنے کا عادی بن چکا ہو، اس کے لئے حق پر گامزن ہونا لوہا کو چنا چبانے کے مترادف ہے، گویا مسلمان ہونے کے بعد انسان ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرتا ہے، اس لئے یہ پھولوں کی سیج نہیں؛ بلکہ کانٹوں کا فرش ہے، اسی بناء پر جو لوگ خدا سے ڈر کر سچائی اور حقیقت کی تلاش کے جذبے سے معمور ہو کر اور عزم وارادہ کی قوت سے مسلح ہو کر قدم اُٹھانا چاہیں، وہی اس راہ پر آسکتے ہیں، کسی بھی شخص کو حقیر، معمولی اور مادی مقاصد کے تحت اس راہ میں آبلہ پائی کا حوصلہ نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ ایک تو ان مشکلات اور دوسری طرف دعوتِ اسلام کے کاموں سے غفلت کی بناء پر آزاد ہندوستان میں عیسائیت کی طرف ہندو سماج کا رجوع زیادہ

ہوا ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جو ہر شخص کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے؛ چنانچہ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ: ۲۵ میں تمام شہریوں کے لئے آزادیٔ ضمیر اور آزادی سے مذاہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق شامل ہے، اس لئے سنگھ پریوار کا ''دھرم پری ورتن'' پر چیں بہ جبیں ہونا یقیناً ہندوستان کے دستور سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے، اپنی بیماری کو دور کرنے کے بجائے ان لوگوں کو بُرا کہنا جو بیماری کو بیماری سمجھتے ہیں، بے وقوفی ہی کہی جاسکتی ہے۔

اسلام نے بھی ضمیر واعتقاد کی آزادی کو تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ واضح ہوچکی ہے؛ لہٰذا دین کے معاملہ میں کوئی جبر ودباؤ نہیں ہے: ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) رسول اللہ ﷺ سے صاف ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، آپ داروغہ نہیں ہیں کہ ان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کردیں: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ '' (الغاشیہ:۲۱-۲۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان ہی مومن ہو جاتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟: ''اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ '' (یونس:۹۹) پیغمبر اسلام ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، آپ پر تو محض یہ ہے کہ پیغامِ ہدایت کو صاف صاف اور کھلے طور پر پہنچا دیں اور بس: ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ '' (النحل:۸۲) آپ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر پر بہ ضد ہیں ان سے کہہ دو کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ لِيَ دِيْنِ '' (الکافرون:۶) ایک اور موقع پر آپ کی زبان سے کہلا گیا کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال: ''لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ '' (الشوریٰ:۱۵)، غرض عقیدہ وضمیر کی آزادی کا قائل اسلام بھی ہے، وہ کسی شخص کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتا، ہاں جہاں اسلامی حکومت ہو اور ایک شخص نے مسلمان ہونے

کی حیثیت سے شہریت قبول کی ہو اور حقوق حاصل کیے ہوں، اس کا اسلام سے کفر کی طرف سفر کرنا نہ صرف روشنی سے تاریکی کی طرف سفر کرنا ہے؛ بلکہ گویا ملک سے بغاوت ہے اور بغاوت کسی بھی سیاسی نظام میں ناقابل برداشت ہے، اسی لئے جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں ارتداد موجب قتل ہے۔

بہر حال تبدیلیٔ مذہب پر ہونے والی یہ بحثیں مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت ہیں کہ ہندو سماج جو پاکیزہ مذہبی تصورات اور عقل انسانی سے ہم آہنگ عقائد سے محروم اور توہمات کے شکنجہ میں قید ہے اور جو روحانی سکون کے لئے مضطرب اور طبقاتی تقسیم کی وجہ سے مظلوم اور ستم رسیدہ ہے، اسلام جیسا صاف ستھرا، پاکیزہ، روحانی اور اخلاقی قدروں سے معمور، عقل وفطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ، انقلاب انگیز اور انسانیت کی اصلاح کے لئے غیر معمولی صلاحیت کا حامل اور اثر انگیز مذہب وعقیدہ کا حامل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے فرائض سے بے اعتنائی برتی اور آج تک بھی ہم کوئی منظم اور منصوبہ بند، دعوتی اور تبلیغی سعی وکاوش نہیں کر رہے ہیں؛ حالاں کہ یہی فریضہ ہے، جو نصرت خداوندی کی کلید اور خدا کے غیبی نظام کے تحت مسلمانوں کی حفاظت وصیانت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

(یکم نومبر ۲۰۰۲ء)

اسلام اور غیر مسلم

اسلام ''سِلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح وسلامتی کے ہیں اور ایمان ''امن'' سے ہے جو ظاہر ہے کہ امن وآشتی کو بتلاتا ہے، گویا صلح وسلامتی اور امن وآشتی اس دین کی خمیر میں داخل ہے، اسلام کی تمام تعلیمات اس کے اس مزاج ومذاق کی آئینہ دار ہیں، اس نے محبت کا سبق سکھایا ہے، اللہ سے محبت، اللہ کے رسول سے محبت، مسلمانوں سے محبت، پوری انسانیت سے محبت اور تمام مخلوقات سے محبت، غرض یہ دین، دین محبت ہے، نہ کہ دین نفرت، یہ مذہب اُخوت کا مذہب ہے نہ کہ عداوت کا، یہ صلح کی دعوت ہے نہ کہ جنگ کی، اس نے اس وقت محبت کی شمع جلائی جب ہر طرف بغض وعناد کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مگر افسوس کہ جو لوگ صدیوں سے نفرت کے سوداگر ہیں، جو شب وروز انسانیت کو ہلاک وبرباد کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری میں مصروف کار ہیں اور جو پوری دنیا میں انسانوں کی تباہی وبربادی کے اسباب کی تجارت کر رہے ہیں اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اور دنیا پر ان کے رعب ودبدبہ کا سبب ووسیلہ ہے، وہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے پروپیگنڈے کر رہے ہیں اور یہ پروپیگنڈہ اس شدومد اور قوت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ مشرق ومغرب گویا اس پر ایمان لا چکا ہے، یہاں تک کہ خود بعض مسلمان بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔

جب بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے، جس میں پروپیگنڈے کی اس آنچ کو تیز کرنے کا موقع ہو، تو ہمارا میڈیا ہرگز اسے ضائع ہونے نہیں دیتا؛ بلکہ نمک مرچ لگا کر اس میں اضافہ ہی کرتا ہے —— اس کی ایک مثال ''طالبان'' سے متعلق حالیہ خبریں ہیں، پہلے یہ خبر آئی کہ طالبان ہندو

اقلیت کو افغانستان سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں، پھر یہ ہوا کہ انھوں نے ہندو اقلیت پر زرد کپڑے پہننے کا لزوم کر دیا ہے، پھر یہ خبر آئی کہ ان کے لئے زرد شناختی کارڈ بنائے گئے ہیں، ان خبروں کو ہمارے ذرائع ابلاغ نے بلا تحقیق؛ بلکہ طالبان کی وضاحت کے باوجود بہ اصرار اتنا پھیلایا کہ اس سے اکثریتی فرقہ میں بجا طور پر اشتعال کی کیفیت پیدا ہوئی، مسلمانوں کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوا، ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے اور اس کا مقصد پوری دنیا میں مسلمانوں کے وقار کو متاثر کرنا اور ہندوستان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے تئیں مخالفانہ جذبات کو ہوا دینا ہے، طالبان کی طرف سے یہ وضاحت آچکی ہے کہ انھوں نے اقلیت پر کسی خاص لباس کا لزوم نہیں کیا ہے؛ بلکہ ان کے لئے محض شناختی کارڈ زرد رنگ کا جاری کیا گیا ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ افغانستان میں مسلمانوں پر نماز با جماعت قانونی طور پر لازم قرار دی گئی ہے، غلط فہمی میں بعض دفعہ افغان پولیس غیر مسلموں کو بھی مسجد جانے کا پابند بناتی تھی، اس پر وہاں کے غیر مسلموں نے حکومت سے خواہش کی کہ ان کے لئے کوئی ایسی شناخت فراہم کی جائے کہ پولیس والے انھیں تنگ نہ کر سکیں، اسی پس منظر میں ان کے لئے زرد شناختی کارڈ جاری کیا گیا ہے؛ تا کہ پولیس کو پہچاننے میں سہولت ہو اور غیر مسلم بھائیوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔

غور کیجئے! کہ طالبان کے اس عمل میں اقلیت کی ایذا اور ضرر رسانی کا جذبہ کارفرما ہے یا ان کی سہولت و آسانی کا؟ مختلف مصلحتوں کے لئے یہ بات مروج ہے کہ مخصوص کارڈ جاری کئے جاتے ہیں، بعض مغربی ملکوں میں شہریت کے کئی درجات ہوتے ہیں اور ہر درجے کے لئے الگ الگ رنگوں کے کارڈ بہ طور شناخت ہوتے ہیں، اس میں تذلیل و تحقیر مقصود نہیں ہوتی، اگر طالبان نے بھی غیر مسلم بھائیوں کی سہولت اور اپنی قانونی مصلحت کے پیش نظر کوئی شناختی کارڈ جاری کیا ہو، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسے کیوں کرنا انصافی کہا جا سکتا ہے؟

اس موقع پر اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کا رویہ کیا ہے؟ — انسانی عزت و تکریم اسلام کی بنیادی فکر میں داخل ہے؛ بلکہ اگر کہا جائے کہ اسلام میں اسی کو عقیدہ کا درجہ حاصل ہے، تو بے جا نہ ہوگا، قرآن نے کہا ہے: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بَنِی آدَمَ '' (بنی اسرائیل:۷۰) کہ اللہ نے بنی آدم کو کرامت وشرف کا تاج پہنایا ہے، قرآن نے انسان کے جسمانی قالب کو سب سے بہترین سانچہ قرار دیا ہے: ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ '' (التین:۴) قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام فرشتہ جیسی عظیم مخلوق کے بھی مسجود تھے اور قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام ہی سے پیدا ہوئے ہیں: '' خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ '' (نسائی:۱) یہ انسانی کرامت کا پہلو بلا امتیاز مذہب تمام انسانوں کے احترام کا تصور عطا کرتا ہے، اس لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بھی تحقیر واہانت کا سلوک روا نہیں۔

اس بات کو آپ ﷺ نے اپنی مختلف تعلیمات کے ذریعہ واضح فرمایا، آپ ﷺ نے جنگ کے دوران نعش کا مثلہ کرنے سے منع فرمادیا، غزوۂ خندق کے موقع سے جب ایک مشرک حملہ آور ہوا اور مارا گیا تو اہل مکہ نے لاش کی قیمت ادا کرنی چاہی؛ لیکن آپ ﷺ نے نفرت وانتقام کی آگ کے عین شباب کے وقت بھی اس کو گوارا نہیں فرمایا کہ انسانی جسم کی قیمت وصول کی جائے، ایک یہودی کا جنازہ گذر رہا تھا آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، صحابہ نے عرض کیا: یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے، آپ نے غیر مسلم بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو خطوط لکھے تو ان کے احترام کا پورا پاس ولحاظ رکھا، بعض مشرکین آپ ﷺ کے یہاں مہمان ہوئے تو آپ ﷺ نے پورا اکرام فرمایا اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا، غرض کہ انسانی تکریم اور احترام کے اعتبار سے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فرق نہیں کیا۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی، ماں باپ، بال بچوں، بھائی بہنوں، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور سفر کے ساتھیوں، مقروضوں اور کمزوروں، بیماروں اور مسافروں وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک کے جو بھی احکام دیئے گئے، ان کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا گیا؛ بلکہ اس سلوک کا حکم تمام انسانوں کے لئے دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ پر قحط کے موقع سے ایک بڑی رقم ان کی اعانت کے لئے عطا فرمائی،

اُم المومنین حضرت صفیہ ﷺ نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے، حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے بکری ذبح کروائی اور پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت فرمائی، واپسی پر دریافت فرمایا کہ کیا یہودی ہمسایہ کو بھی اس میں سے بھیجا گیا؟ جب جواب نفی میں ملا تو خاص طور پر ان کو بکرے کا گوشت بھیجا، حضرت عمر ﷺ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، رسول اللہ ﷺ نے اسیران بدر کو نئے جوڑے پہنا کر رخصت فرمایا، غرض کہ رشتہ، پڑوس، مجبوری وغیرہ کی بناء پر نیز عموی طور پر حسن سلوک کا حکم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے، ویسے ہی غیر مسلم بھائی کے لئے بھی ہے۔

جان اور زندگی کا تحفظ غیر مسلموں کا اسی طرح واجب ہے جس طرح مسلمانوں کا، جو غیر مسلم مسلم ملک میں رہتے ہوں، یا اس ملک میں نہ رہتے ہوں؛ لیکن مسلمانوں کا ان سے معاہدہ ہو، ان کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک اُصول بیان فرمادیا کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں: ''دمائهم كدمائنا واموالهم كاموالنا'' اس لئے جو دیت (خون بہا) مسلمانوں کے لئے ہے، وہی غیر مسلموں کے لئے ہے، جیسے کسی مسلمان کے قتل پر قصاص واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم کے قتل پر بھی قصاص واجب ہے — اسی طرح کسبِ معاش، ملکیت مال اور حفاظت جائداد کے حق میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں، جیسے کسی مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، اسی طرح غیر مسلم کا مال چوری کرنے پر بھی۔

سب سے اہم مسئلہ مذہبی حقوق کا ہے، اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و تشدد کا قائل نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا اكراه فى الدين'' (البقرۃ:۲۵۶) اس رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ نے مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا اور جس کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی تھی، غیر مسلم اپنی عبادت اور اس کے طریقوں میں آزاد ہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عیسائی وفد کو خود مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں اپنے طریقہ پر عبادت کی اجازت دی تھی، اس سے

بڑھ کر رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ مذہبی عبادت گاہوں کے احترام کا بھی اسلام نے پورا لحاظ رکھا ہے، شام اور بیت المقدس کا علاقہ جب فتح ہوا تو وہاں کتنے ہی چرچ تھے، جن کو مسلمانوں نے جوں کا توں باقی رکھا۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں کے جذبات بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا تھا اور وہ جن معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہوں، ان کو بھی بُرا بھلا کہنے کی ممانعت کی گئی: ''وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ''۔ (الانعام:۱۰۸)

معاشرتی اور تمدنی قوانین میں بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، وہ جس چیز کے کھانے کو حلال سمجھتے ہوں، گو اسلام میں اس کا کھانا حرام ہو؛ لیکن ان کو اپنے مذہب کے مطابق کھانے پینے کی اجازت ہے، اس لئے غیر مسلموں کو شراب پینے اور آپس میں شراب و خنزیر کی تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگا، جن خواتین کو قرآن نے محرم قرار دیا ہے اور ان سے کسی قیمت پر نکاح کو روا نہیں رکھا ہے، اگر ان کے مذہب میں ان خواتین سے نکاح کی اجازت ہو، تو انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہوگا، یہی حال دوسرے سماجی و تہذیبی قوانین کا ہے۔

اگر مسلم ممالک میں کبھی غیر مسلم کو اپنے روایتی لباس اور پوشاک میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا مقصد ان کی تحقیر نہیں؛ بلکہ ان کی تہذیب کی حفاظت اور ان کے تشخص کو برقرار رکھنا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے تمدن کو قائم رکھے، اسی لئے مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کی وضع اختیار کرنے اور ان کی تہذیب میں جذب ہونے سے منع فرمایا گیا، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵) تو اگر تاریخ میں کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں، تو اس میں ان کی تحقیر و اہانت نہیں؛ بلکہ ان کا تحفظ اور ان کی تہذیب کے بقا کا سروسامان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نہ صرف عقیدہ و ایمان؛ بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا تشخص چاہتا ہے اور یہ بات کہ مسلمان اپنے وجود کو گم کر دیں، اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں؛

لیکن اس کے ساتھ وہ دوسری قوموں کے تئیں حسن سلوک، رواداری، بقاء باہم کے اُصول پر ایک دوسرے کے بارے میں تحمل، عبادت اور سماجی قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور عدل کا داعی ہے، وہ دین محبت اور دین اُخوت ہے اور اس نے پوری کائنات سے محبت کا درس دیا ہے، وہ انسان کو بحیثیت انسان قابل تکریم سمجھتا ہے اور تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے، رحم دلی اور عدل سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہیں اور ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز اسے ناپسند نہیں۔

(۲۹/جون ۲۰۰۱)

غیر مسلموں سے تعلقات

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور افسوس ہے کہ ہم اس مسئلہ پر محض سیاسی اور مادی نقطۂ نظر سے غور کر رہے ہیں؛ حالاں کہ جب ہم اسلام کو ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات سمجھتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے سوچیں اور دیکھیں کہ اس بارے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

پوری انسانیت — ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی :

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ا . (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اُخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتہ سے ہمارا بھائی

اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اُخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر فرد و بشر سے محبت ہونی چاہئے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیتِ انسان اللہ تعالیٰ نے قابلِ احترام قرار دیا ہے :

وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوع انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازۃ یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کر دیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کر دی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترام انسانیت کے خلاف ہے۔

اسلام بحیثیت انسان کسی غیر مسلم کی توہین و تحقیر کو بھی روا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط

فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لیے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ'' (یوسف:۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جس کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے؛ اس لیے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ'' (الزخرف:۲۴) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے، ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے؛ چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل کیا گیا ہے:

''قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ''۔ (الزخرف:۳۰)

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو ''کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا؛ لیکن انھوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انھوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا:

ولو قال للذمي : يا كافر ! يأثم ان شق عليه . (الأشباہ والنظائر:۲/۲۵۷)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

'ذمی' کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے؛ چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے:

رجل ذمی ، معناه : له عهد . (لسان العرب:۵/۵۹)

مردِ ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم . (النہایۃ:۲/۱۶۸)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ میں غیر مسلموں کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : سماجی تعلقات ، معاشی تعلقات ، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات ، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن و حدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے :

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیادی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ . (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے ، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے ، بے شک اللہ

تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رُک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَ نْفُسِكُمْ ، وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ . (البقرة:۲:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنوقریظہ اور بنونضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (تفسیر قرطبی:۳۳۷/۳) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ

سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہئے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء ؓ نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (ردالمحتار: ۳۰۲/۳، باب المصرف)

حضرت عمر ؓ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمر ؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمر ؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے: "ما انصفناک اکلنا شبیتک ، ثم ناخذ منک الجزیۃ" (نصب الرایۃ: ۴۵۲/۳) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ (دیکھئے الدر المختار علی ہامش ردالمحتار: ۳۰۱/۳)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اُصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں:

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَ أَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا ۔ (نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ . (بنی اسرائیل:۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا . (المائدۃ:۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہیں غیر مسلم —— جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو —— کے قاتل کے بارے میں فرمایا، کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَ اِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ اَرْبَعِيْنَ عَامًا . (بخاری عن عبداللہ بن عمروؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۶)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُر امن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اُصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ”اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ“ (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی

ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱) حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱) امام شافعیؒ نے حضرت علیؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسندِ امام شافعی، السنن البیہقی: ۱۲/۴۳)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (سنن دار قطنی، کتاب الحدود) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابۂ کرامؓ سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔ (دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/۳۶۸-۳۶۹)

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اُصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کے جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا: ''اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'' ۔ (النساء: ۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۵۰)

متعدد صحابہؓ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے :

اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوْ انْتَقَصَهُ اَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ

أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ . (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۵۳)

آگاہ ہوجاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (المغنی لابن قدامہ: ۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت و آبرو اور عفت و عصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلاتفریق مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ .

(الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اُڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور: ۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت و عصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، مطلقاً حرام ہیں، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت و آبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۶۱۷، باب قبول الهدیۃ من المشرکین) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنثور: ۱۸۱/۵) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱۲۳/۱) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز و تکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے، (اعلاء السنن: ۲۸۲/۸، باب ما یفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے۔ (صحیح البخاری حدیث نمبر ۵۶۵۷، باب عیادۃ المشرک)

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

❖ جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

اَخْلَفَ اللّٰهُ خَیْرًا مِّنْهُ وَ اَصْلَحَکَ . (ہندیہ:۳۸۴/۵)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم و تعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم و تعلم بھی درست ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''علم و حکمت مؤمن کی متاع گم شدہ ہے: ''اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ'' (ترمذی، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اسی لئے تعلیم و تعلم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھو نہیں دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ :

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا . (الجامع للترمذی حدیث نمبر:۲۶۹۵)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے سلام کے طریقہ، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھو دیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابو سفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے

قبضہ میں ہی رہنے دیں اوران سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتب احادیث میں ذکر موجود ہے، (صحیح البخاری ،حدیث نمبر:۲۳۲۸، باب معاملة النبی اهل خیبر) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں ؛ چنانچہ حضرت علی ﷺ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتب احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے، (کنز العمال:۲ر۳۲۱) حضرت خباب ﷺ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے: ’’خباب قال کنت رجلاً قیناً فعملت للعاص بن وائل ‘‘۔ (بخاری، حدیث نمبر:۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر:۲۰۶۲)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطۂ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ’’دلیل‘‘ کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطور ’دلیل‘ اُجرت دے کر ساتھ رکھا، (احکام اہل الذمۃ لابن قیم: ۲۰۷) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں: ’’یجوز أن یکون الأجیر ذمیا والمستاجر مسلما بلاخوف ‘‘۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۱۰۵، مادہ: اجارہ)

چنانچہ مسلم عہد حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ ﷺ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اُثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اسی سے فرامین سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضدالدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت و حکمرانی میں ممتاز تھے ؛ بلکہ

مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالات شبلی: ۲/۲۱۷-۲۱۹)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ سیاسی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا؛ چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزور طاقت اپنا حق حاصل کرسکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی پتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کا طلب گار ہوا، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''لَوْ اُدْعِي بِهٖ فِيْ الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ''۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۹۱)

بنو امیہ کے دور میں حضرت حسین ؓ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین ؓ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین ؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہ ؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (سیرت ابن ہشام: ۱/۱۳۵) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اُصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اور ان سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی: ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ '' (یوسف:۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک و سہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی بر انصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اُصولوں پر مبنی ہوں گے، اول ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی بر انصاف ہوں؛ کیوں کہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد، جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ '' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ '' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً

عدل کے خلاف نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدباب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا :

> مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ . (مسلم حدیث نمبر:۴۹)
>
> تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہئے کہ بزور بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے؛ لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے :

> لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ . (النساء:۱۴۸)
>
> اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس

کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں ، (دیکھئے مجمع الزوائد : ۱۲۰/۸ ، باب ماجاء فی أذی الجاری) —— غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے ، ؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو ، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو ؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے ، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں : اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں —— مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں —— دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے ، اعتقادات ، عبادات ، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں ، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو ، جیسے توحید ، رسالت ، آخرت کا یقین وغیرہ۔

'' عبادات '' سے وہ احکام مراد ہیں ، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے ، جیسے : نماز ، روزہ وغیرہ۔

'' احوالِ شخصیہ '' سے مراد Parasnal Law ہے ، اس میں نکاح ، طلاق کے علاوہ میراث ، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات و معاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود و قمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک اور کلیۃً اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لیے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم و سزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کیے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں؛ بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے :

> لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تُشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارىٰ الخ . (الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان)
>
> رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہوسکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان

صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں ــــــ فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے: ''وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰی رَأسِہٖ قَلَنْسُوَۃَ الْمَجُوْسِ کَفَرَ۔ (الملتقط فی الفتاوی الحنفیۃ:۲۲۵)
اسی طرح فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں ''قشقہ'' لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت، یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی ورضامندی کا اظہار اور تائید وتحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إنَّـمَا الرِّضَا بِالْکُفْرِ مُسْتَحْسِنًا کُفْرٌ'' (الملتقط:۲۲۵) کیوں کہ آدمی، جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دو عملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں ''دھوتی'' کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ (دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم:۱/۹۲)
لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (امداد الفتاویٰ:۴/۲۶۸ سوال نمبر:۳۲۵)

اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔ (کفایت المفتی: ۱۶۱/۹)

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام و انصرام سے متعلق اُمور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور و طریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمرؓ نے حساب وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا، (الفاروق مکمل: ۱۳۰/۲) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۹۵/۴)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے امور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اُصولی حکم شریعت اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی اُمور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے

زیادہ کوئی چیز مطلوب و محمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر و تشدد جائز نہیں :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ . (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کر لے، آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے: ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ '' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو آزاد کر دیا۔ (کتاب الاموال:۱/۱۵۴)

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ '' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ '' (الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجدِ نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (احکام الذمۃ:۱/۳۱۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ :

اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔ (احکام اُہل الذمۃ: ۱/۳۱۶)

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔ (حوالۂ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ. (الانعام: ۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج: ۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں — خواہ کسی مذہب کی ہوں — ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید ؓ کے ذریعہ حیرہ

کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج: ۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَواداربھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے ''جہاد'' جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ . (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اول یہ کہ جو لوگ تم سے برسرِ پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں،

بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داود، حدیث نمبر:۲۱۶۴)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ . (محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلاً . (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا . (الانفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پر امن طریقوں سے تو مسلمانوں

کی مدد کی جائے گی اور سیاسی واخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے :

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ . (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بالکل انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ . (الممتحنة:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حیات نبوی ﷺ اور جہاد

رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا:

بوئے خوں آتی ہے، اس قوم کے افسانوں سے

جزیہ کی حقیقت

آج کل وی، ایچ، پی کے لوگ اسلام کو بدنام کرنے کے لئے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اُٹھا رہے ہیں؛ لیکن یہ کوئی نیا اعتراض نہیں ہے، پہلے بھی مستشرقین کی جانب سے اس قسم کے سوالات اُٹھائے جاتے رہے ہیں، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انھیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا؛ اس لئے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کی حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالت

کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سب سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے؛ (دیکھئے: احکام الذمۃ: ۱/۱۴۸، ہدایہ: ۴/۳۶۸، باب الجزیۃ) اس لئے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لئے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لئے سالانہ ۲۴ ر اور زیادہ آمدنی والوں کے لئے ۴۸ درہم، (بیہقی ۹/۳۲۹، حدیث نمبر: ۱۸۶۸۵ باب الزیادۃ علی الدینار بالصلح) ۱۲ ر درہم ۱۳ ر تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ ر درہم ۲۶۵ ر روپے سے کچھ کم وبیش ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکورٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے، تو ہم شکر گزار ہوں گے، یہ اس جزیہ کی حقیقت ہے، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم وزیادتی، تشدد اور نارواداری کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور ناروادار مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم وفراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسکن رحمت ہے۔

إن الدين عند الله الإسلام ، اللّٰهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه .

✿ ✿ ✿

فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟

حالیہ عالمی واقعات کے پس منظر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی بعض کوششوں کا آغاز ہوا ہے اور اس سلسلہ میں وزیر اعظم برطانیہ اور بعض دیگر عالمی قائدین کے بیانات آئے ہیں، نیز ڈائیلاگ بھی منعقد ہوئے، خدا کرے کہ یہ کوششیں اخلاص اور مفاہمت کے جذبہ پر مبنی ہوں اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں عالمی سطح پر پھیلائی گئی ہیں، یہ ان کے دور ہونے کا سبب بنیں۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ کا قائل نہیں ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ ہدایت و گمراہی کو پوری طرح واضح کر دیا ہے: ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) اگر پیغمبر اسلام ﷺ کا منشا اسلام کو تھوپنا ہوتا تو نہ مدینے میں کوئی یہودی باقی ہوتا اور نہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں کوئی مشرک، اسلام کی آمد سے پہلے یہ مزاج تھا کہ سلطنت کا جو مذہب ہوتا تمام لوگ اسی مذہب کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرنے کے پابند ہوتے، اسی لئے روم میں کوئی مشرک اقلیت تھی، نہ ایران میں اہل کتاب کا کوئی گروہ تھا، سرزمین عرب میں جب پیغمبر اسلام کے ذریعہ دین ابراہیمی کو تجدید ہوئی تو اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پیغمبر کے سوا کوئی اور شخص اس طوفان کے مقابلہ تھم نہیں سکتا تھا، یہودیوں کی اس وقت اپنی کوئی مملکت نہیں تھی، اسی لئے وہ بکھرے ہوئے تھے اور نہایت ذلت و نکبت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو مدینہ اور اس کے جوار میں آباد ہو گئے تھے؛ کیوں کہ یہ علاقہ کسی باضابطہ حکومت کی عمل داری میں شامل نہیں تھا۔

مذہب کے معاملہ میں اسلام کی وسیع النظری کی وجہ سے یہ فکر عام ہوئی کہ لوگوں کو کسی

خاص مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے، اسلام نے باضابطہ غیر مسلم اقلیت کے قوانین وضع کیے، ان کے حقوق وواجبات کو قانونی شکل دی اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے سدباب کی تدبیریں کیں، اس سے مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان بقاء باہم کے اُصول پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہوئی، مدینہ تشریف لاتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپ نے جو عہد نامہ مرتب فرمایا وہ اسی اُصول پر مبنی تھا، جس میں بہت صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ تمام باشندوں کو اپنے اپنے دین پر قائم رہنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف سے مدافعت کریں گے، جب تک یہودیوں کی طرف سے بار بار اس عہد کی خلاف ورزی نہ ہوئی اور وہ اہل مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سازش میں شریک نہیں ہوئے، مسلمان اپنے عہد پر قائم رہے۔

اسلام میں اہل ذمہ سے متعلق جو قوانین ہیں، وہ سب اسی بقاء باہم کے اُصول پر مبنی ہیں، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مسلمان ان افکار وخیالات کو قبول کرلیں جس سے ان کے ایمان وعقیدہ پر حرف آئے؛ لیکن اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو حق و ہدایت کی طرف بلانے کی کوشش کریں اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کے عقیدہ وعمل کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کردیں اور دنیا میں انسانی رشتۂ اخوت کے تحت ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھیں، مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ اسے برت کر دکھایا ہے، جب یہود پوری دنیا میں ذلیل ورسوا تھے اور جگہ جگہ سے شہر بدر کئے جا رہے تھے، اس وقت عالم اسلام ہی میں ان کو پناہ ملتی تھی، صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کی اپنے مسلمان مفتوحین کے ساتھ انسانیت سوز زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی رعایا کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کیا اور ان کے سلاطین کا سلوک ہندو اور مسلم رعایا کے ساتھ برابری کا رہا، اگر پوری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے کہ تمام اہل مذاہب کو اپنے اپنے مذہب اور طور وطریقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور اپنی تہذیب وثقافت کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کا حق ہے، تو تہذیبی تصادم کی نوبت نہ آئے، اگر

مذہب یا تہذیب کے حامل افراد اپنی چاہت کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں اور اس بات کے خواہاں ہوں کہ ان کی فکر ہر قوم اور ہر خطہ میں سکۂ رائج الوقت بن جائے تو یقیناً اس سے مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں تصادم کی صورت پیدا ہوگی، اس وقت صورتحال یہی ہے، الجزائر اور ترکی میں جمہوری طریقہ پر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس لئے حق نمائندگی سے محروم کردیا گیا کہ وہ مغربی ثقافت کے مقابلہ اسلامی ثقافت کے علمبردار تھے، اسی اُصول پر سوڈان اور یمن کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں مسلمان اور مسلم مملکتیں ظلم وزیادتی کا ہدف بن رہی ہیں۔

بقاء باہم کے اُصول کا تقاضا ہے کہ تمام انسانیت کے خون کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ایک ہی قیمت لگائی جائے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم بھائیوں کے بارے میں فرمایا: ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں: ''دمائهم کدمائنا واموالهم کاموالنا'' لیکن آج جو لوگ انسانیت کے علمبردار ہیں، کیا وہ پوری انسانیت کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا امریکیوں اور فلسطینیوں کے خون میں فرق نہیں کیا جاتا؟ کیا مشرقی تیمور کے عیسائیوں اور بوسنیا کے مسلمانوں کے تحفظ میں دہرا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا؟ اور کیا افغانستان میں بے قصور لوگوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلی گئی؟ اور آگ کا طوفان نہیں بپا کیا گیا؟ کیا آج مغرب میں کالوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر نہیں رکھا گیا ہے؟ — یہ کیسی انسانیت ہے جو خون اور خون میں فرق کرتی ہے؟ یہ کیسی تہذیب ہے جس کے پاس چمڑے کا رنگ انسان کی قیمت مقرر کرنے کا پیمانہ ہے؟ یہ کیسی جمہوریت ہے جو اسرائیل کو دفاع کے نام پر بے گناہوں کا گھر زمین بوس کرنے کی اجازت دیتی ہے؛ لیکن مسلمانوں کے لئے ان پر روا رکھے جانے والے مظالم کے مقابلہ آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی؟!!

دنیا کی مختلف قوموں میں فاصلے دور کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے دوسری ضروری تدبیر ''کلمۂ سواء'' کی تلاش ہے، ''کلمۂ سوا'' کیا ہے؟ مختلف قوموں

کی مشترک تعلیمات اور متفق علیہ نظریات پر ان کو جمع کرنا، مذہب کی بہت سی باتیں وہ ہیں جو قدر مشترک ہیں؛ کیوں کہ تمام مذاہب کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، مختلف قوموں میں اللہ کی طرف سے انبیاء اور رسل آتے رہے ہیں، یہ سلسلۂ سعادت پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ﷺ تک پایۂ تکمیل کو پہنچا، آپ کی تعلیمات من جانب اللہ محفوظ ہیں؛ کیوں کہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ سے پہلے جو کتابیں اُتریں، ان کتابوں کے حاملین نے ان میں تحریف وتبدیلی پیدا کردی اور اب وہ بے آمیز طریقہ پر دنیا میں موجود نہیں ہیں؛ لیکن چوں کہ ان سب کا اصل سرچشمہ ایک ہی ہے، اس لئے بہت سی صداقتیں پہلی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور ان سچائیوں پر تمام ہی مذاہب کے حاملین یقین رکھتے ہیں، خدا کا تصور، اچھے اور بُرے عمل کا تصور، جزاوسزا کا عقیدہ، انسانیت کے محبت کی تعلیم، انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کے احترام کی تلقین اور اخلاقی بھلائیوں اور برائیوں کا تصور، یہ تمام مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کون مذہب ہے جو ظلم وجور اور ناانصافی کو روا رکھتا ہو؟ کون سا دین ہے جس نے جھوٹ اور تکبر کو سراہا ہو؟ کون مذہبی پیشوا ہے جس نے قتل وخون، دوسروں کی عزت ریزی اور لوٹ مار سے منع نہ کیا ہو؟ اگر اقوامِ عالم ان مشترک تعلیمات کو لے کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں اور اپنی مذہبی تعلیمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانی محبت کی وہ تصویر پیش کریں جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کرۂ فساد، کرۂ امن نہ بن جائے، اور محبت کی شبنم نفرت کے آتش فشاں کو سرد نہ کردے!

قرآن مجید نے اسی کلمہ سواء کی طرف انسانیت کو دعوت دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ . (آل عمران:۶۴)
>
> آپ کہہ دیجئے : اے اہل کتاب ! تم ہمارے اور اپنے درمیان مشترک بات کی طرف آجاؤ۔

قرآن مجید نے اس حقیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کس طبقہ

میں اس دعوت کو قبول کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے اور کس طبقہ میں نہیں؟ چنانچہ فرمایا گیا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ. (المائدة:۸۲)

آپ اہل ایمان کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے اور محبت میں مسلمانوں سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ قومی نفسیات کے اعتبار سے بہ مقابلہ یہود و مشرکین کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ قربت ہے؛ چنانچہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، گو ان میں عیسائی اقوام آلہ کار بن رہی ہیں، مگر اصل میں اس کے پیچھے یہودی دماغ کارفرما ہے، تاہم اسلام نے کلمۂ سواء کی بنیاد پر جو اتحاد کی دعوت دی ہے، وہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں؛ بلکہ یہ دعوت پوری انسانیت کے لئے ہے، یہود جن کی عداوت کو قرآن نے کھول کھول کر بیان کیا ہے، اس آیت میں ان کو بھی اشتراک کی دعوت دی گئی ہے۔

مذاہب اور قومیں اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتیں کہ ایک قوم دوسری قوموں کو نگل جائے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو اپنا لقمۂ تر بنالینا چاہے؛ بلکہ فاصلے اس وقت گھٹیں گے اور اجنبیت کی دیواریں اس وقت چھوٹی ہوں گی جب ہم اسلام کے پیش کئے ہوئے ان دونوں اُصولوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں، بقاء باہم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور مشترکہ تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی قدروں پر قوموں کا باہمی اشتراک و تعاون!

(یکم فروری ۲۰۰۲ء)

❁ ❁ ❁

دہشت گردی کا مسئلہ — حقیقت پسندانہ تجزیہ

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن و سلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے: ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس ''وادی غیر ذی زرع'' میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سر و سامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لاقانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے امن کو اس کی نعمت سے سرفراز فرمایا: ''اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ''۔ (قریش:۴)

دہشت گردی سماج کے امن و امان اور سلامتی کے لئے سمِ قاتل ہے، جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان و مال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت و آبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب و تمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکر مند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے، اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کئے ہیں: ''مومن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے، مومن ''امن'' سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اس طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو سلامتی حاصل ہو،

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوس کے لوگ امن میں رہیں۔ (بخاری:٦)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم وتعدی اور جور وستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو تھامنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے، دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے، جنھوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لیں اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے (۹۰) سال آزادی کی خونچکاں لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوقِ غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے، اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے، تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آئے ہوتے، تو کیا جدوجہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

نہیں اور یقیناً نہیں!! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اُٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آراء ہونا دہشت گردی نہیں ہے؛ بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے، دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو، ہندو تاریخ میں ''کورو'' اور ''پانڈو'' کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے، وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں، اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اُٹھ کھڑا ہونا اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں؛ بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے، قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بُری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں؛ لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے: ''لَا يُحِبُّ اللهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ''۔ (النساء:۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں، امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے؛ حالاں کہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے واسطہ سے ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے، اسرائیل، فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے، مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں؛ حالاں کہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں، جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں، مصر، الاخوان المسلمون کو اور ترکی وہاں کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں اور ممبئی اور سورت میں ظلم و جور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور ردِ عمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا، ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کرسکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے، ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہنا بجائے خود ایک ''اخلاقی دہشت گردی'' ہے اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اُصول مقرر کر

دیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: "جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (الشوریٰ:۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: "لا ضرر ولا ضرار" (موطا امام مالک) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جواباً نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب و محرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سد باب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بناتے ہیں، بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور نا اُمیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں "نکسلائٹ تحریک" اسی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسی احساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکھٹا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو امن کی میز سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، ان اسباب و عوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزور قوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے، عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور لاقانونیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو؛ لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا، اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب و عوامل پر توجہ دی، سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر اُبھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے، اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا:

"مَا الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اِلَّامَتَاعُ الْغُرُوْرِ"۔(الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاع دنیا کی محبت کم ہو جائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین بیٹھ جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگے گا اور یہ احساس اس کو اہل ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اُکسائے گا؛ بلکہ وہ اپنے فقر و افلاس میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ و صدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، نیز محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسن سلوک کی اخلاقی تعلیمات ان کے علاوہ ہیں، یہ وہ احکام ہیں جو اہل دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غرباء کو محرومی کے احساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہیں کی؛ بلکہ صلاحیت اور اہلیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت وسلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا، آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں:"دمائھم کدمائنا و اموالھم کاموالنا" قرآن مجید نے عدل و انصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو نا انصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو:"وَلَا یَجْرِ مَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا"(المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا:"لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ"(القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے:"لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی"(الفاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو

اسے قبول کیا جائے اور اگر خلاف واقعہ ہے تو ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں: "نھی عن المنکر" اور "شہادت حق" ہے، اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ" (المومنون:۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، رحم اور عفو در گذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ "رحمٰن و رحیم" ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ "رحمة للعالمین" ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خودرو پودے بھی اُکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے، ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے، دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں؛ بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۱۷/نومبر ۲۰۰۰ء)

مسلم پرسنل لا — ایک غلط فہمی کا ازالہ

آج کی ترقیات اور انکشافات نے زندگی کی قدریں یکسر تبدیل کر دی ہیں، جو کل رینگتا تھا، وہ آج برق رفتار سواریوں کو وجود میں لا چکا ہے اور ہوا کے دوش پر اڑ رہا ہے، کل تک دریا کی معمولی موجیں جس کے لئے ایک نا قابل تسخیر مصیبت تھی، آج وہ سمندر کا جگر چیر کر لعل و جواہر کی دنیا سمیٹ رہا ہے، کل کا لکڑیاں جلانے اور چراغ میں تیل ڈالنے والا آج برقی، آلات و وسائل کی مدد سے پوری دنیا کو اپنی مضبوط گرفت میں لے چکا ہے، کل تک جو اپنی نحیف آواز میل دو میل کے فاصلے پر پہنچانا بھی ممکن تصور نہ کرتا تھا، آج کی حیرت انگیز ایجادات نے اس کی آواز کو آفاقی بنا دیا ہے اور اس کی آواز بیک وقت ایک دو شہر نہیں پوری کائنات میں پھیل سکتی ہے...... پھر آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس دور کا قانون آج کی اس ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکے اور ان کے لئے مشعلِ راہ بن سکے!

اس دلیل کو ہمارے مغرب زدہ اور علوم اسلامی سے نا آشنا حضرات نے ایسی تسلیم شدہ حقیقت تصور کر لیا ہے کہ گویا اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہو؛ حالاں کہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی رہی ہے اور بدل رہی ہے، وہ کیا ہے؟ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ اس کے طبعی تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں؟ یا محض وسائل اور اسباب میں تغیر رونما ہوا ہے؟ ذرائع زندگی میں فراوانی آئی ہے؟

اس نکتہ پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ ازل سے آج تک دنیا میں جو انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی طبعی افتاد آج سے دس بیس ہزار سال پہلے جو تھی، وہی اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

ایک بچہ اپنے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی اپنے دل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی خواہش پاتا ہے، مگر وہ اپنے دست و پا کو اس سے بے بس پا کر روتا ہے، اشارہ کرتا ہے اور اپنے بڑوں کی گود کے سہارے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے، پھر جب اس کے پاؤں میں اتنی قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود سے جنبش کرے اور کسی قدر چل سکے تو وہ گھٹنوں کے سہارے کیڑوں کی طرح زمین پر رینگنا شروع کر دیتا ہے، وہ ذرا بڑھتا ہے تو ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا ہے، جوان ہوتا ہے، عمر پختہ ہوتی ہے، جسم میں توانائی آتی ہے تو وہی دوڑنے لگتا ہے، چھلانگ لگاتا ہے، کودتا ہے اور پھر جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش میں بسوں اور ٹرینوں، جہازوں اور راکٹوں کی طرف مدد کا ہاتھ پھیلاتا ہے، یہ بتدریج پیدا ہونے والی تبدیلیاں اگر غور کیا جائے تو محض وسائل میں رونما ہوتی رہی ہیں، اسبابِ سفر تبدیل ہوتے رہے ہیں؛ لیکن اس کے پس پردہ کارفرما انسانی فطرت، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی خواہش، ہر جگہ یکساں طور پر باقی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

میں نے یہ محض ایک مثال دی ہے، ورنہ آپ جس چیز کے بارے میں بھی چاہیں، اس انداز میں تجزیہ کر لیجئے، آپ محسوس کریں گے کہ تغیر پذیر محض ''اسباب'' ہیں، انسان کی ''فطرت'' اپنی جگہ قائم ہے، وہ جس طرح کل کبھی رنج وغم اور کبھی مسرت وشادمانی محسوس کرتا تھا آج بھی کرتا ہے، پہلے آہ وواہ سے اس کا اظہار کرتا تھا اب بھی کرتا ہے، کل جس طرح اس کے دل میں اپنے دشمنوں کے خلاف انتقام کا شعلہ سلگتا تھا آج بھی سلگتا ہے اور جس طرح کل اس کا سینہ مال ودولت اور حرص وہوس کی آماجگاہ تھا آج بھی اقتصادی ترقی کا بھوت اس کے ہوش وحواس پر سوار ہے، آج بھی اس کا نفس اس کو اخلاقی تقاضوں کے بالائے طاق رکھ دینے کی تلقین کرتا رہتا ہے، جس طرح ماضی کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، جس طرح کل جاگیرداری اور زمینداری کی تمنا اس کو بے چین کئے رہتی تھی آج بھی اس کے دل میں حکومت اور اقتدار کی آرزوئیں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں —— پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی حد تک وہ فکری بنیادیں بھی آج تک قائم ہیں جو پہلے تھیں، جس طرح پہلے ''سچائی'' کو ''اچھائی'' اور ''جھوٹ'' کو ایک ''پاپ'' تصور کیا

جاتا تھا آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی جھوٹ کو کوئی ''کارِ خیر'' تصور نہیں کیا جاتا، جس طرح کل ''ایفاءِ عہد'' محبوب تھا آج بھی ''عہد شکنی'' معیوب ہے اور جس طرح کل ''ایمانداری'' اور ''انصاف پروری'' محمود تھی آج بھی ''خیانت'' اور ''ظلم و جور'' مذموم ہے۔

معلوم ہوا کہ عہد حاضر کی دلفریب ترقیاں اور تبدیلیاں چاہے وہ کتنی ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہوں اور کتنی ہی نئی اور انوکھی ہوں، بہر حال انھوں نے اسباب و وسائل میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے اور انسان کے لئے زندگی میں راحت کے کچھ سامان فراہم کر دیئے ہیں؛ مگر وہ چیز جسے ''انسان'' کہتے ہیں اور جسے ''انسانی فطرت'' کہا جاسکتا ہے، وہ ایک ایسی غیر تغیر پذیر حقیقت ہے جسے زمانہ کی کہنگی اور وقت کا تیز رو سفر کچھ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

اس مرحلے پر آکر ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام اور اس کے قانونی نظام کا اصل موضوع اسباب و وسائل نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا موضوع انسان، اس کی فطرت اور اس کے فطری تقاضوں کی مناسب حدود میں تکمیل ہے، پس جس طرح انسان ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اسی طرح ظاہر ہے اس سے تعلق رکھنے والا قانون بھی ابدی اور دائمی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بلا شبہ نو دریافت وسائل زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں غیر معمولی تبدیلی کا یہ تقاضا ضرور ہے کہ قانون میں اس کی کچھ رعایت کی جائے اور ان نئے تقاضوں اور وسائل سے اسلامی قوانین کو ہم آہنگ کیا جائے اور جزوی اور فروعی حدود میں اسلام ان تقاضوں کو قبول کرے، اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیاز اور بنیادی اُصول کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر و تبدل اور واقعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ایسی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے؛ چنانچہ مشہور فقیہ اور مزاجِ شریعت کے رمز شناس حافظ ابن القیم (۱۲۹۱-۱۳۰) اپنی گراں قدر کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عرف و عادت، حالات و مقاصد اور زمان و مکان کے تغیر کی بنا پر

مسائل میں اختلاف اور تغیر و تبدل کا بیان، یہ بڑی مفید اور اہم بحث
ہے، جس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت میں بڑی غلطیاں واقع ہوئی
ہیں، جس نے دشواری، تنگی اور استطاعت سے ماورا تکلیف پیدا کر
دی ہے، جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر
معمولی رعایت کرتی ہے، ان ناقابل برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں
کرتی، اس لئے کہ شریعت کی اَساس سراپا رحمت اور سراپا مصلحت ہے؛
لہٰذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم و زیادتی، رحمت کی
حدوں سے گذر کر زحمت، مصلحت کی جگہ خرابی اور کارآمد ہونے کے
بجائے بیکار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا۔ (اعلام الموقعین، جلد:۲)

جس قانون میں ایک ایسا تغیر پذیر اور لچکدار پہلو موجود ہو اور وہ ہر دور کے سیاسی واخلاقی حالات، جدید انکشافات و تغیر اور رسوم و عادات کے تحت مناسب تبدیلی کو گوارا کر لیا کرتا ہو اور جس کی اسی وسعت نے اس کو چودہ سو سال تک مسلسل زندہ اور پائندہ رکھا ہو اور تمام انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اس کی روشنی میں حل کیے جاتے رہے ہوں، اس کو جامد اور کسی زمانے کے لئے ناکارہ کہنا سوائے عناد کے اور کیا ہے؟ اس قسم کی باتیں عموماً ہمارے مسلمان قانون داں ہی "ارشاد" فرماتے رہتے ہیں؛ حالاں کہ بعض غیر مسلم ہندو اور مستشرقین ماہرین قانون نے عموماً اسلامی فقہ کی تعریف کی ہے اور اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے، چند سال قبل دہلی میں منعقد ہونے والے ایک سمینار میں سابق جج سپریم کورٹ مسٹر وی، آر کرشنا آئر نے کہا:

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی سول کوڈ میں اسلامی قانون کی کوئی
جگہ نہیں ہے؛ بلکہ مستقبل میں اسلامی اُصول قانون، ہندوستانی
سول کوڈ کا ایک بڑا عنصر بن کر رہے گا۔

اسی سپریم کورٹ کے دوسرے جج نے اپنی تقریر میں کہا:

ہندوستان کے نظام قانون میں اسلام کی دین کسی سے کم نہیں ہے
اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کے قوانین میں اُصولی حیثیت
سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔ (صدق جدید: ۱۳ر فروری ۱۹۸۱ء)

(۱۳را کتوبر ۲۰۰۰ء)

یونیفارم سول کوڈ — حقیقت پسندانہ جائزہ!

یونیفارم سول کوڈ، تین انگریزی الفاظ کا مجموعہ ہے، ''یونیفارم'' (Unifarm) کے معنی 'یکساں' کے ہیں اور ''سول کوڈ'' (Civilcode) شہری' قانون' کو کہتے ہیں، اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' ایسے شہری حقوق کا نام ہوگا: جس میں نسل ونسب، علاقائی عرف وعادت، مذہب واعتقاد، مخصوص سماجی کلچر اور زبان وادب کے اختلاف کے باوجود سبھوں کے لئے یکساں قوانین بنائے جائیں۔

''سول کوڈ'' کا ایک حصہ ایسا ہے، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان اُمور میں آزادی سے پہلے بھی یکساں قوانین تھے، اب بھی ہیں اور ان کو ہندوستان کے مخصوص ڈھانچے کے اعتبار سے ایسا ہی ہونا چاہئے، اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق ''مذہبی قوانین'' سے ہے، مثلاً نکاح وطلاق، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ، ہندوستان کی تاریخ میں مسلم عہدِ حکومت سے پہلے بھی، مسلم عہدِ حکومت میں بھی اور دیش دشمن انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس حصۂ قانون میں ہر مذہب کے ماننے والے آزاد رہے ہیں اور اس کو ایک ''حق'' کی حیثیت سے ہندوستانی قانون میں بنیادی حقوق کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ''یونیفارم سول کوڈ'' کا ایسا خاکہ پیش کیا جانے لگا جس کی روشنی میں ''پرسنل لا'' بھی اس میں داخل ہوجاتا ہے اور اس طرح ''مسلم پرسنل لا'' پر خطِ تنسیخ پھیر کر مذہبی اُمور میں بھی ''یکساں قانون'' بنانے کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی، یونیفارم سول کوڈ کی سب سے بڑی مصلحت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ ''قومی یکجہتی'' اور ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' پیدا ہوگی، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خلیج کم ہوسکے گی اور ''فرقہ وارانہ کشیدگی'' دور ہوگی۔

حکومت کی یہ فکر لائق صد آفریں ہے؛ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ''یونیفارم سول کوڈ'' سے یہ مقصد حاصل ہو سکے گا اور کیا آج جو فرقہ وارانہ تناؤ پایا جاتا ہے اور جمشید پور مرادآباد اور سورت و بمبئی کے خونچکاں واقعات سامنے آتے ہیں، وہ ''اسی مذہبی امتیاز'' اور تشخص کا نتیجہ ہیں؟

تجربات اور ہمارے ملک کے حالات شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہے، جہاں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور فسادات ہوتے ہیں وہاں ہندو، مسلمان سے یا مسلمان، ہندو سے یہ نہیں پوچھتا کہ ذرا آپ اپنے قوانین بیان فرمادیجئے، اگر میرے مذہب کے مطابق ہو تو بخش دوں گا، ورنہ ابھی سرتن سے جدا کیئے دیتا ہوں، وہاں تو صرف مذہب کا نام پیش نظر ہوتا ہے، ایک مسلمان، ہندو تہذیب سے کتنا بھی قریب کیوں نہ ہو، اگر وہ غریب ''مسلمان'' کہلاتا ہے تو گردن زدنی ہے؛ بلکہ ہندوستان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں ''مسلم پرسنل لا'' سے ہٹ کر ہونے والے نکاح، اکثر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی ''بین مذہبی'' نکاح ہوتا ہے تو پورا علاقہ ایک طرح کے تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

اگر قوانین کی یکسانیت اس ہم آہنگی کے لئے کافی ہوتی تو بنگال میں بنگالی، غیر بنگالی اور آسام میں آسامی، غیر آسامی کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا، ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی باہمی کشاکش دیکھئے، پاکستان کے مختلف صوبوں کا آپسی تناؤ ملاحظہ کیجئے، آخر یہاں کے ہندو اور وہاں کے مسلمان ''قوانین کی یکسانیت'' کے باوجود باہم کیوں دست و گریباں ہیں؟

دوسرے اگر ''قومی یکجہتی'' کے نام پر آج مسلم پرسنل لا کو منسوخ کردیا جائے تو یہ سلسلہ یہیں رُک نہ سکے گا، اس کے لئے یہ بات زیادہ ضروری ہوگی کہ عبادت گاہوں کا امتیاز بھی ختم ہوجائے، تیوہار اور مخصوص مذہبی دنوں کی تفریق بھی مٹادی جائے، حرام و حلال اور کھانے پینے میں بھی نظریاتی یکسانیت پیدا کی جائے، اگر ''قومی یکجہتی'' کی قربان گاہ پر اس طرح مذہبی اقدار کو بھینٹ چڑھایا جاتا رہے اور اگر یہی حکومت کا منشا ہے تو صرف ''مسلم پرسنل لا'' کا مسئلہ نہیں ہے؛ بلکہ کہنا چاہیئے کہ اس کام کے لئے ہندوستان سے مذہب کی یکسر بیخ و بن اُکھاڑ

دی جائے گی — اور یہ شاید ممکن نہیں؛ کیوں کہ مذہب ہندوستان کے خمیر میں داخل ہے، جسے ختم کرنے کی کوشش ناکام ہی رہے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کم از کم اس کے ذریعہ تہذیب میں یکسانیت اور وحدت تو پیدا ہو سکے گی، مگر یہ بجائے خود ایک ''بچکانہ بات'' ہے، اولاً تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کا اصل حسن تہذیب کی اسی رنگا رنگی میں مضمر ہے اور ماضی بعید سے ہندوستان کا یہی امتیاز رہا ہے کہ ''گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن'' — اور اسے مٹایا بھی کہاں جا سکتا ہے؟ آپ قانون ایک کر دیں گے؛ لیکن کیا سب کو اپنی زبان بدلنے پر مجبور کر دیں گے؟ پھر کوئی سرد علاقہ کا رہنے والا ہے، کوئی گرم علاقہ کا، فطری طور پر وہاں کی بود و باش، لباس و پوشاک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے، کیا ان میں بھی اتحاد پیدا کیا جائے گا؟ ایک شخص جو پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں رہتا ہے، دوسرا شخص جو زرخیز اور آبیار سرزمین میں زندگی بسر کرتا ہے، تیسرا شخص جو جنگلوں کے اطراف و جوانب کا رہن سہن رکھتا ہے، کیا ان سب کی تہذیب میں کچھ فرق نہ ہوگا؟ اور پھر کیا ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے جو تہذیبی اور تمدنی تشخص ہوگا، آپ اسے مٹا دیں گے؟ اور مٹانے پر قادر بھی ہوں گے؟

آپ قانون میں لاکھ یکسانیت پیدا کریں، ایک راجستھانی اور ایک لکھنوی، ایک آسامی اور ایک کشمیری، ایک بنگالی اور ایک حیدرآبادی کی تہذیب میں جو فرق ہے، وہ بہرحال باقی رہے گا، ان کی زبانیں جداگانہ ہوں گی، ان کے لب و لہجہ میں اختلاف ہوگا، ان کے مزاج اور عادتوں میں فرق ہوگا، ان کے انداز و اطوار الگ ہوں گے، تہذیب اور سماج کی ان ساری ''دوئیوں'' کے باوجود آخر قانون ہی میں ''اکائی'' پیدا کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی ہے؟

بعض حضرات اس تہذیب فروشی کو رواداری کا تقاضا سمجھتے ہیں، مگر نہ اس کا نام رواداری ہے اور نہ اسلام ایسی ''رواداری'' کا قائل ہے، وہ چاہتا ہے کہ جہاں رہے، اپنا تشخص برقرار رکھے، قانون اور عقیدہ تو بہت اہم چیز ہے، وہ تو وضع قطع اور لباس و پوشاک میں بھی بہت حساس واقع ہوا ہے، ایامِ جاہلیت میں عرب صرف عمامہ استعمال کرتے تھے یا صرف ٹوپی،

رسول اللہ ﷺ نے ان کے طرزِ عمل اور مشابہت سے بچنے کا حکم دیا کہ عمامہ اور ٹوپی دونوں کا استعمال کیا جائے، پھر بعد کو جب پورا جزیرۃ العرب مسلمان ہوگیا تو آپ نے صرف ''ٹوپی'' اور صرف ''عمامہ'' کے استعمال کی بھی اجازت دے دی — یہاں تک کہ اسلام تو ''عمل خیر'' کی انجام دہی میں بھی اپنے آپ کو ممتاز رکھنا چاہتا ہے، یوم عاشورہ (۱۰ رمحرم) کو یہود بھی روزہ رکھتے تھے، آپ نے مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا؛ لیکن ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے ایک اور روزہ کا اضافہ کرکے ''دوروزہ'' رکھنے کی تلقین کی گئی جو مذہب اپنے تشخص اور امتیازات کے معاملہ میں اتنا حساس ہو، وہ اس رواداری کو کیسے قبول کرسکتا ہے؟ ہاں! اسلام بے شک مذہبی رواداری کا قائل ہے مگر ''رواداری'' وہ شی ہے ہی نہیں، جس کے لئے آج اس کا نام استعمال کیا جاتا ہے ''مذہبی رواداری'' کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اپنے عقیدہ، مذہب، تہذیب اور معاشرت پر پوری استقامت اور جماؤ کے ساتھ دوسروں کے ''مذہبی اقدار'' کا بھی احترام کیا جائے، ان کی عبادت گاہوں اور مذہبی طور طریقوں کے ساتھ تمسخر نہ کیا جائے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی دِل آزار باتیں نہ کہی جائیں اور اس حیثیت سے واقعہ ہے کہ اسلام کی رواداری کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی، وہ اپنی مملکت کی اقلیت کو اس سے زیادہ ''مذہبی آزادی'' دیتا ہے جو آج کی سیکولر حکومتوں میں حاصل ہے، وہ ان کو عبادتوں کی، اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی، جائز حدود میں اسلام پر فکری اور عقلی تنقید کی اور اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے؛ لیکن تہذیب فروشی کا قائل نہیں ہے اور اس معاملہ میں وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھتا ہے؛ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں غیر مسلم ایرانیوں کو بھی ''عربی اسلامی لباس'' اختیار کرنے سے منع کیا تھا۔

(۶ راکتوبر ۲۰۰۰ء)

عورت اور اسلام

آج ۸/ مارچ ہے، آج کے دن کو ''عالمی یوم حقوقِ نسواں'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، تو آیئے! ہم آج کے دن کی مناسبت سے جاننے کی کوشش کریں کہ اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ذات یوں تو سوکھی ہوئی خزاں رسیدہ انسانیت کے تمام طبقوں پر ابر بہار بن کر برسی؛ لیکن خاص طور پر دو طبقے اس وقت سب سے زیادہ مظلوم، ستم رسیدہ اور قابل رحم تھے اور نہ صرف عرب؛ بلکہ ایشیاء، یورپ اور افریقہ کے تمام علاقوں میں ان کی حالت نہایت قابل رحم تھی، روم اور ایران کے لوگ گو اس زمانے میں تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور شائستگی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے، مگر وہاں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی، یہ دو طبقے تھے غلاموں کے اور خواتین کے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ انھیں دونوں طبقوں کی دستگیری اور غم گساری کی، ان کو اونچا اُٹھایا اور سماج میں عزت و احترام کا مقام دیا، یہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ غلامی کا جو رواج ہزاروں سال سے چلا آ رہا تھا، چند سو سالوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا اور اسلام ہی کے اثر سے یورپ اور دنیا کے مختلف علاقوں میں عورتوں پر ظلم کے خلاف تحریکیں اُٹھیں اور اس کو ایک اہم سماجی مسئلہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اسلام سے پہلے عورت کو جائداد کی حیثیت دی جاتی تھی، قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ عورت مرد ہی کی طرح انسانیت کا مستقل حصہ ہے، (الحجرات: ۱۳، النساء: ۱۲۴) چوں کہ تورات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا باعث حضرت حوا ہی تھیں، اس لئے یہودی اور عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا، قرآن مجید نے اس لغزش میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ذمہ دار قرار دیا؛ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام

کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا اور فرمایا آدم نے (بھول کر) اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا اور وہ پھسل گئے: ''وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى '' (طٰہٰ: ۱۲۱) یہ فکر وعقیدہ کے اعتبار سے بہت بڑا انقلاب تھا، جس کے ذریعہ ہزار ہا ہزار سال سے جاری غلط فہمی کو دور کیا گیا، اسلام سے پہلے عام طور پر عورتوں کو جائیداد کے مالک بننے اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے وغیرہ کا حق نہیں تھا، اسلام نے عورتوں کو جائیداد میں مالک بننے اور اپنی مرضی سے اس میں عمل کرنے کا پورا اختیار دیا۔ (النساء: ۴، ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں اور ان کی لطافت ونزاکت کی جتنی رعایت کی ہے، اس سے زیادہ بہتر طور پر کوئی اور مذہبی یا انسانی قانون عورتوں کی مشکلات کو حل نہیں کرتا، عورتیں عام طور پر تین مرحلوں سے گزرتی ہیں: بیٹی، بیوی اور ماں، بعض دفعہ ناخوشوار حالات میں ایسی صورت بھی پیش آجاتی ہے کہ ایک عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہے، اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے ان مختلف مرحلوں میں عورتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں اور ان کے مسائل کس طرح حل کئے ہیں؟

بیٹی : رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کی پرورش پر پورا اجر وثواب بتایا ہے، فرمایا کہ جس کو دو یا ایک لڑکی ہو اور وہ ان کی اس طرح پرورش کرے کہ تعلیم دے، بہتر طور پر تربیت کرے، تو جنت میں اس کو میرا ساتھ اسی طرح حاصل ہوگا، جیسے یہ دونوں (شہادت اور بیچ کی) انگلیاں، (ترمذی: ۲/ ۱۳، ابوب البر والصلۃ) اس طرح کی خوش خبری آپ ﷺ نے لڑکوں کی پرورش پر بھی نہیں دی ہے، لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر افسردہ اور غمگین ہو جایا کرتے تھے اور بدقسمتی سے بے دینی اور جہالت کی وجہ سے آج کل بھی بعض مرد اور اس کے خاندان کے لوگ بچیوں کی پیدائش پر آزردگی کا اظہار کرتے ہیں، قرآن مجید میں اس طرح کی سوچ کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ (الزخرف: ۱۷، النحل: ۵۸-۵۹)

شریعت میں لڑکیوں کی پرورش اور اس کی تمام ضروریات کی تکمیل اس وقت تک باپ کے ذمہ رکھی ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے، لڑکے بالغ ہو جائیں، تو والدین اکثر

حالات میں اس کے اخراجات کے ذمہ دار نہیں رہتے؛ لیکن لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کے اخراجات اس وقت تک باپ پر واجب ہیں، جب تک کہ شادی نہ ہو جائے اور وہ سسرال نہ چلی جائے، (عالمگیری: ۱/۵۶۳) پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش میں والدین کے لئے جائز نہیں کہ وہ لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں اور لڑکیوں کے ساتھ کم تر درجہ کا سلوک، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو لڑکی ہو، وہ اس کو زندہ باقی رکھے، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہ کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (ابوداؤد: ۲/۷۰۷)

بالغ ہونے کے بعد ماں باپ اور خاندان کے بڑوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح کر دیں اور اس پر اپنی پسند کو تھوپیں، رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ نکاح میں لڑکیوں کی رضامندی دریافت کی جائے، (بخاری: ۲/۷۷۱) ایک خاتون نے آپ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ ان کے والد نے ان کی اجازت کے بغیر نکاح کر دیا ہے، آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد فرما دیا، (بخاری: ۲/۷۷۱) اگر نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے علاوہ کسی اور سرپرست نے نکاح کر دیا ہو، یا باپ دادا ہی نے کیا ہو؛ لیکن وہ معاملات کی ناتجربہ کاری میں معروف ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو اس نکاح کے رد کر دینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی میں اگر والدین اپنی جائداد بچوں میں تقسیم کر کے ان کے حوالہ کر دینا چاہیں، تو واجب ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر حصہ دیں، اسی طرح اگر والدین کے زیرِ پرورش رہتے ہوئے کوئی شخص رقم یا جائیداد ہبہ کرے، تو لڑکی خود اس کی مالک ہوگی اور والدین وغیرہ کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا، والدین کی وفات کے بعد جائداد میں شریعت نے لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے اور یہ حصہ لڑکوں کے مقابلے آدھا ہے، چوں کہ ماں باپ، بال بچے، نابالغ بھائی بہن، مطلقہ اور بیوہ بہنیں اور خاندان کے دوسرے نادار و محتاج رشتہ دار، مثلاً چچا، پھوپھی، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں وغیرہ کی پرورش کی

ذمہ داریاں عام طور پر مردوں ہی پر رکھی گئی ہیں، اس لئے بیٹے کا حصہ بہ مقابلہ بیٹی کے دوگونہ رکھا گیا ہے۔

اگر بھائی کا انتقال ہوا، جو لاولد تھا اور اس نے تنہا ایک بہن کو چھوڑا، تو وہ نصف جائداد کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بہنیں تھیں، تو ایک ایک تہائی دونوں کا حصہ ہوگا اور اگر اس کے بھائی بھی ہیں، تو بھائی کے مقابلہ نصف حصہ بہنوں کو ملے گا، (النساء:۱۷۶) اس طرح مختلف رشتہ داروں سے بہت حصہ وراثت پاتی ہے۔

بیوی : شریعت میں بیوی کو کافی حقوق دیئے گئے ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کو کسی مرد کے بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بہتر ہو اور میں اپنی بیوی کے ساتھ تم سب کے مقابلہ بہتر سلوک رکھتا ہوں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ:۲/۲۸۱)

بیوی اپنی تمام جائداد اور سامان کی خود ہی مالک ہے، اس کو اپنے والدین کی طرف سے میراث یا تحفہ کے طور پر جو کچھ ملے، وہ اس کی ملکیت ہے، اسی طرح شادی کے وقت یا اس سے پہلے اور اس کے بعد شوہر یا اس کے اہل خاندان نے تحفتاً عورت کو جو کچھ دیا ہو، وہ سب اس کی ملک ہے، شوہر اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا، ان تمام چیزوں میں عورت ہر طرح کا تصرف کرسکتی ہے، شوہر یا دوسرے اہل خاندان اس کو روک نہیں سکتے۔

بیوی کا نفقہ یعنی کھانے، پینے، دوا علاج اور کپڑے وغیرہ کی تمام ضروریات شوہر کے ذمہ ہے، چاہے بیوی بذات خود خوش حال ہو اور مرد تنگ دست ہو، پھر بھی نفقہ شوہر پر واجب ہوگا (البحر الرائق:۴/۱۸۸) اگر بیوی شوہر کے بے جا ظلم سے بچنے کے لئے یا اپنے کسی جائز حق کے مطالبہ کے لئے اپنے میکہ میں رہے، تو میکہ میں رہنے کے باوجود اس کے اخراجات شوہر پر واجب ہوں گے، (عالمگیری:۱/۵۴۵) کھانے، پینے، رہائش اور لباس و پوشاک میں شوہر پر واجب ہوگا کہ بیوی کے اہل خاندان کی رعایت کرے، مثلاً: اگر کسی شخص کے یہاں رہنے سہنے کا معیار کمتر ہے اور اس کے سسرال میں معیار زندگی اونچا ہے تو وہ عورت کے لئے درمیانی درجہ کا معیار فراہم

کرے، (ہدایہ:۲/۴۱۷) بیوی اگر صاحب جائیداد بھی ہو، تب بھی بال بچوں کے اخراجات شوہر پر ہی واجب ہوں گے، اگر شوہر معاشی اعتبار سے خوش حال ہو تو اس پر یہ بھی واجب ہے کہ بیوی کی اُمور خانہ داری میں مدد کے لئے نوکر یا نوکرانی کا انتظام کرے، (ہدایہ:۲/۴۱۹) اگر شوہر بیوی کے اخراجات نہیں ادا کر سکتا ہو یا صلاحیت رکھنے کے باوجود ادا نہیں کرتا ہو تو عورت کو حق ہے کہ وہ قاضی شریعت سے رجوع کر کے اپنا نکاح تڑوالے۔

اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو، تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کو اس کا پورا کرنا واجب ہے، (ہدایہ:۲/۴۲۱) شوہر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی کے والدین یا اس کے محرم رشتہ داروں کو آنے سے منع کرے، (ہدایہ:۲/۴۲۱) اگر وہ خود والدین یا دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملنا چاہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے، علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس کا میکہ شہر میں ہے، تو ہفتہ میں ایک دن والدین کے یہاں اور مہینہ میں ایک دن دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے جاسکتی ہے اور شوہر کو کسی معقول عذر کے بغیر اس سے نہیں روکنا چاہئے؛ (عالمگیری:۲/۱۴۸) البتہ غیر محرم مردوں سے ملنا سخت منع اور گناہ ہے۔

بیوی کو گالی گلوچ کرنا، اس کی صورت یا کسی اور بات پر طنز کرنا حرام اور سخت گناہ ہے، قرآن مجید نے بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی خاص تاکید کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم کو اس میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ سمجھ کر نظر انداز کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں کوئی بڑی بہتری بھی پیدا کر سکتا ہے (النساء:۱۹) شریعت میں والدین کی طرح شوہر سے بیوی کو بھی میراث ملتی ہے، اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (۱/۸) حصہ ملے گا اور وہ لاولد ہو تو چوتھائی حصہ (۱/۴)۔ (النساء:۱۲)

بیوی کا ایک نہایت اہم حق ''مہر'' ہے، یہ اتنا اہم حق ہے کہ اگر نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہوا ہو، تب بھی مہر واجب ہو کر ہی رہے گا، قرآن مجید نے مہر ادا کرنے کی خصوصی تاکید کی ہے (النساء:۴) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا،

تو ایسا شخص زانی ہے۔(مجمع الزوائد:۴/۲۸۴)

بیوی کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی جائز شرعی ضرورت کی بنا پر مرد دوسرا نکاح کرے،تو دونوں بیویوں کے درمیان مکمل عدل وانصاف سے کام لیا کرے،لباس و پوشاک، کھانے پینے کے سامان اور رات گذارنے کے اعتبار سے پوری طرح برابری برتی جائے، بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا حرام اور سخت گناہ ہے،رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کی بڑی مذمت فرمائی ہے،قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں۔(النساء:۳)

بیوہ و مطلقہ: بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو شریعت نے نہ صرف نکاح کی اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے،خود قرآن مجید نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے(النور:۳۲)اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اگر وہ خود نکاح کرنا چاہیں،تو اس میں رکاوٹ بنا جائے،(البقرۃ:۲۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے کل گیارہ نکاح فرمائے،جن میں سے دس نکاح بیوہ اور مطلقہ خواتین سے کیے۔

وہ خواتین جو شوہر سے محروم ہوں: خواتین کو شریعت نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے؛ بلکہ والدین اور دوسرے محرم رشتہ داروں پر ان کی کفالت واجب قرار دی ہے،(ہدایہ:۲/۴۲۶) اور یہ کوئی احسان اور اخلاقی حق نہیں؛ بلکہ ایسی عورتوں کا قانونی حق اور محرم رشتہ داروں پر شرعی فریضہ ہے، یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور شوہر کا انتقال ہو جائے،تو شوہر کے متروکہ میں سے اولاً بیوی کا مہر ادا کرنا واجب ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد جنازہ کے سامنے بیوی سے مہر معاف کروانا نہ جائز ہے اور نہ اس کا اعتبار ہے، ورثہ کو چاہئے کہ اولاً بیوہ کا مہر ادا کرے،پھر جو بچ رہے،اس کو حکم شرعی کے مطابق تمام ورثہ میں تقسیم کرے۔

مطلقہ عورت کو شریعت نے یہ خصوصی حق دیا ہے کہ لڑکیاں جب تک بالغ نہ ہو جائیں اور لڑکے سات،آٹھ سال کی عمر کو نہ پہنچ جائیں اور اپنی ضروریات (یعنی کھانے،پینے،استنجا

وغیرہ) خود پوری کرنے کے لائق نہ ہو جائیں، ماں ان کی پرورش کرے گی اور ماں کا نکاح ہو جائے تو نانی کو حق پرورش حاصل ہوگا اور جب تک بچے زیر پرورش رہیں گے، ان بچوں کا نفقہ تو باپ کے ذمہ رہے گا ہی، پرورش کرنے والی خاتون کی اُجرت بھی اس کے ذمہ واجب ہوگی، اس طرح جو مطلقہ عورتیں صاحبِ اولاد ہوں، طلاق کے بعد عرصہ تک اس ذریعہ سے ان کی ضروریات کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

ماں : قرآن وحدیث میں سب سے زیادہ جن لوگوں کے حقوق کی تاکید زیادہ وارد ہوئی ہے، وہ والدین ہیں اور والدین میں بھی ماں کا درجہ زیادہ رکھا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، (مشکوٰۃ:۲/۴۲۱) ایک شخص نے دریافت کیا: ہمارے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں، وہ تین بار یہ سوال دہراتے رہے، آپ ﷺ نے تین دفعہ ماں اور چوتھی دفعہ باپ کا ذکر فرمایا، (ابوداؤد:۲/۷۰۰، ۷۹۹) قرآن مجید نے بھی ماں کے حقوق واحسانات کو خاص طور پر ذکر فرمایا، (لقمان:۱۳، الاحقاف:۱۵) اگر ماں حاجت مند ہو تو اس کی کفالت اولاد پر واجب ہے (ہدایہ:۱/۲۶۶) یہاں تک کہ اگر ماں مسلمان نہ ہو تب بھی اس کا نفقہ ادا کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود صاحب جائداد اور مالی اعتبار سے خود مکتفی ہو، تب بھی اولاد کو چاہئے کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا کرے، یہ بھی اولاد کا فریضہ ہے کہ نہ ماں کی طرف سے بیوی پر ظلم ہونے دے اور نہ بیوی کی طرف سے ماں پر، ماں کے اخراجات کی کفالت کے علاوہ ان کا اکرام، ان کی خدمت اور جائز باتوں میں ان کی اطاعت واجب ہے، اگر ماں کسی ناجائز بات کا حکم دے، تو اس کا ماننا جائز نہیں؛ بلکہ خوش اُسلوبی سے ماں کو سمجھا دینا چاہئے، مثلاً جہیز لینے کا مطالبہ کرے، بلاوجہ بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تو ایسی باتوں کا ماننا جائز نہیں۔

اگر زندگی میں اولاد کا انتقال ہو جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد یا حادثاتی موت کی صورت میں سرکار سے ملنے والی امداد میں ماں کا بھی حصہ ہوگا، اگر مرنے والے کے بال بچے ہیں تو چھٹا حصہ (۱/۶) اور اگر بال بچے نہیں ہیں؛ لیکن بھائی ہیں، تو بھی چھٹا حصہ ملے گا

اور مرنے والے کے بچے بھی نہ ہوں اور بھائی بھی نہ ہوں تو ایک تہائی (۱/۳) ماں کا حصہ ہوگا۔ (النساء:۱۱)

ان وضاحتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے سماجی زندگی میں عورتوں کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی ہے کہ ایک طرف ان کو تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے اور دوسری طرف خود ان کی مالی ذمہ داریاں باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی کے ذمہ رکھی گئی ہیں اور ان رعایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو قریب قریب ان تمام رشتہ داروں کا وارث بھی مانا گیا ہے جن سے مردوں کو میراث ملتی ہے اور مہر کی ایک خطیر رقم بھی شوہر سے دلائی گئی ہے، مغربی معاشرہ کی طرح عورتوں کو کمانے اور ملازمت کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ اس کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو گھر کی ملکہ کا درجہ دیا گیا ہے، افسوس کہ بعض حقیقت نا آشنا لوگ عورتوں کے لئے اس کو قید سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ قید نہیں؛ بلکہ ان کا تحفظ ہے اور مردوں کو ''قوام'' (النساء:۳۴) قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی ضروریات کا ذمہ دار اور اس کا محافظ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سماجی قوانین میں عدل بھی ہے، انصاف بھی ہے، اعتدال بھی ہے اور توازن بھی اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی اور مرد و عورت کی صلاحیت کی پوری پوری رعایت بھی، دنیا میں جہاں کہیں بھی اس سے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہاں عدل و انصاف کے تقاضے مجروح ہوئے، خاندان بکھر گئے اور عورتوں کو آزادی کے نام پر سر بازار رسوا کرنے اور سامان لذت و ہوس بنانے کی ایک مکارانہ تدبیر کی گئی ہے: ''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ''۔

(۵/مارچ ۱۹۹۹ء)

کم عمری کی شادی

آج کل پریس (Press) کو مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ کسی نئے مسئلہ کی تلاش رہتی ہے، جس کو بغیر کسی مناسب تحقیق اور جانکاری کے خوب پھیلایا جاتا ہے اور زہر افشانی کی جاتی ہے، ان ہی مسائل میں ایک شادی کی عمر کا مسئلہ ہے، ہندوستان میں طویل عرصہ سے یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے، برطانوی عہد میں ۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ بنا، جس کے خلاف پورے ملک میں مسلمانوں نے آواز اٹھائی اور جمعیۃ علماء دیوبند کے زیر اہتمام ''تحفظ ناموس شریعت'' کے نام سے ملک گیر تحریک چلائی گئی۔

آزادی کے بعد مختلف ریاستوں نے اس طرح کے قانون بنائے ہیں، جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کی کم سے کم عمر ۱۸ سال مقرر کی گئی ہے، اس وقت اسی نوعیت کا ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے، جس میں ۱۷ سال کی عمر میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے، یہ مسئلہ چوں کہ مسلم پرسنل لا سے بھی متعلق ہے؛ اس لئے' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' نے اس میں فریق بننے کی درخواست کی ہے۔

جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اور تولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ جسمانی نشو ونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتا، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸ سال سے کم عمر کی ہر لڑکی

کے لئے ماں بننا نقصان دہ ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ سال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو، اس لئے ۱۸ سال ہی کی تعیین قابل فہم نہیں، قانونِ فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی کثرت، انٹرنیٹ اور بیہودہ فلموں کے ویڈیو اور ان فلموں تک کم عمر لڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورتِ حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز اسقاطِ حمل کی کثرت ہوگئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انھیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؛ تا کہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچا سکیں، اصل مسئلہ "Child Marraige" کا نہیں؛ بلکہ "Child Sex" کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنا رہا ہے، پہلے اس کے سد باب کی کوشش کریں۔

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جا رہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصولِ روزگار کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے اس تلاشِ روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں

کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی خود ہی کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں اس لئے وہ قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے فریق بننے کی وجہ سے اسے مسلم مسئلہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے؛ حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہیں، راجستھان میں اب بھی ''اکھاتیج'' کے موقع پر ہزاروں شیر خوار لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے، راجستھان مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں، اصل مسئلہ ان رواجات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں، ظاہر ہے کہ اصل عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو ''خیارِ بلوغ'' حاصل ہوتا ہے اور وہ اس نکاح کو رد کر سکتا ہے۔

ہندو معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اور بھی قابل اصلاح رسوم ہیں، آج بھی ''ستی'' کے واقعات سننے کو ملتے ہیں، آج بھی ہزاروں خواتین بھگوان کی مورتیوں سے بیاہ دی جاتی ہیں اور بھگوان کی آڑ میں سنت اور ''مہنت'' ان کو اپنی ہوس کا سامان بنائے رہتے ہیں؛ بلکہ بعض قبائل اور علاقوں میں چند شوہری کے واقعات بھی ملتے ہیں، اصل میں ایسی سماجی برائیوں کی اصلاح کی طرف ذرائع ابلاغ کو متوجہ ہونا چاہئے کہ یہ زیادہ قابل اصلاح ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا

نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو: ''وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ، فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ '' (النساء:٦)

''نکاح کو پہنچنے'' سے مراد بالغ ہونا ہے: چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں: ''هو بلوغ حال النكاح من الاحتلام '' (احکام القرآن:۲/۶۳) اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: ''اى صاروا محلاله بالاحتلام '' (جلالین:۷۰) یعنی نکاح کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کا اہل ہو جائے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے؛ کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، حضرت قدامہ بن مظعون، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر، اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے نابالغی کی عمر میں بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا یا نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کی صورت منقول ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تو وہ نابالغہ تھیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چچازاد بہن حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا نکاح حضرت عمر بن ابی سلمہؓ سے اس وقت کیا جب وہ نابالغہ تھیں؛ چنانچہ ابن شبرمہؒ اور ابن اصمؒ کے علاوہ تمام محدثین اور فقہاء نکاح نابالغاں کے جواز کے قائل رہے ہیں؛ اس لئے یہ فقہاء

اسلام کے درمیان ایک اجماعی مسئلہ ہے، مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسیؒ نے اس سلسلہ میں تفصیل سے صحابہ ﷺ کے آثار اور فقہاء کے اقوال ذکر کیے ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھیے: مبسوط: ۱۴/۱۴-۱۲)

یہ اجازت اس لیئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، ان میں دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راہ کھل جاتی ہے اور یہ بات اسے ناجائز رُخ پر جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحت جسمانی کے لئے بھی مضر ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں؛ کیوں کہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سماج ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا ہے، اسلام میں حفاظت اخلاق کی بڑی اہمیت ہے اور والدین بھی اس سلسلہ میں جوابدہ ہیں؛ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت کرے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کر دے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا: ''فاِنما اِثمه علی أبیه''۔ (مشکوٰۃ: ۲۷۱، کتاب النکاح)

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لب گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے اُمید رکھی جا سکے، کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کر سکیں گے اور مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں؛ لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کر دیا جائے کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی اُمید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنھیں نظر انداز کر دیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا

چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں؛ لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود وقیود جن کی اسلام میں پہلے سے رعایت ہے، اگر ملحوظ ہو تو اس میں کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جاسکتا ہے اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جاسکتی ہیں، یہی اعتدال اسلام کا اصل امتیاز اور اس کی شناخت ہے۔

(۲۰؍ستمبر ۲۰۰۲ء)

تعددِ ازدواج کا مسئلہ

ابھی چند دِنوں پہلے اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ ایک خاتون نے سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے تحت ''تعددِ ازدواج'' (Polygamy) کی اجازت کے خلاف دعویٰ دائر کیا ہے، تعددِ ازدواج کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے جو آزادیٔ نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیر بحث رہا ہے اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہل مغرب کی طرف سے جو فردِ جرم عائد کی جاتی رہی ہے ان میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو اس کو درست سمجھنے لگتا ہے؛ چنانچہ تعدد ازواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں تنگ وتذبذب میں مبتلا ہیں اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے وہ ''بے چارے'' تو اس مسئلہ پر اتنے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرقِ ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں کو جاتا ہو، اس لئے اس مسئلہ پر پوری حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعددِ ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل غور ہے: مذہبی، سماجی اور اخلاقی، مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر مالک رام نے رگ وید (۱۰۵-۱۰۸۱۰) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست ہے اور بیویوں کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، یہودی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی گنجائش ہے؛ چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں، ایک حضرت صفورہ، جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں (استثناء ۲۲: ۱۰۲) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوسی خاتون سے ہوا تھا (استثناء ۲۲: ۳۳) خود بائبل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی چھ

بیویوں (اخنوعم، اجمیل، محکہ، حجیت، ابیطال، عجلاہ) کا ذکر آیا ہے (گنتی ۸:۲۷) عیسائی مذہب چوں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلاً عیسائی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت ہے؛ چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہل کلیسا نے تعدد ازدواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں :

> مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کا مستند عالم وسٹر مارک (Vister marc) نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدد ازدواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا۔ (الفلسفة القرآنیہ:۵۴)

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو جس نے تعدد ازدواج کو جائز نہ رکھا ہو، اسلام نے بھی تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے؛ لیکن اس کے لئے بنیادی طور پر دو باتوں کی تحدید رکھی ہے، اول: یہ کہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار تک ہی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، دوسرے: یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے، پس اسلام نے ایک طرف سماجی ضرورت کی رعایت بھی کی ہے اور دوسری طرف ان حدود و قیود کے ذریعہ اس اجازت کو متوازن بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دوسرا پہلو تعدد ازدواج میں سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش (Rate of Linth) میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا؛ لیکن شرح اموات (Rate of death) میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے؛ کیوں کہ زیادہ تر حادثات میں مردوں کی جانیں کام آتی ہیں، مثلاً: پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، میں اسّی لاکھ صرف فوجی مارے گئے، شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، جس میں کل ساڑھے چھ کروڑ آدمی یا تو ہلاک ہو گئے یا معذور، ان

مہلوکین اور معذورین میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، اس جنگ عظیم میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے مقابلہ شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ، تیئس ہزار، سات سو نو سے زیادہ تھی اور آسٹریلیا میں ۱۸۹۰ء میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار، سات سو، چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۸۸ء-۱۹۷۹ء) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہوگئیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے ٹریفک یا صنعتی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ غنڈہ گردی کا نشانہ بنتے ہیں وہ بھی عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں، پھر اگر جیلوں میں طویل المدت قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نوے (۹۰) سے زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی ہے؛ کیوں کہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے اور دفاعی تکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریباً اسی لاکھ زیادہ تھی۔

ان حالات میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے، اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں؛ بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

تعدد ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر و مادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان میں بھی ہے اور دوسرے حیوانات میں بھی؛ لیکن یہ انسانی سماج کا امتیاز ہے کہ نکاح کے ذریعہ ایک مرد

اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہو جاتی ہیں، دوسری مخلوقات اس وفاداری سے نا آشنا ہے، اسی وفاداری کا نام ''عفت و عصمت'' ہے، عفت و عصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کر سکتا، تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے، قدم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی، ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء-۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی؛ لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ (تاریخ اخلاق یورپ، ص: ۲۴۰ ''ترجمہ دریابادی'')

چنانچہ منصف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، علم تمدن کے معروف عالم ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں :

> مغرب میں بھی...... ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کسی امر میں مغربیوں کی ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے۔ (تمدن عرب: ۳۶۶)

جناب مالک رام، ملک کے حقیقت پسند اصحابِ دانش میں تھے، ان کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے :

> تعددِ ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں، مثلاً یہ کہ عام حالت میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ

ہے، اگر ایک مرد، ایک عورت کے اُصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں...... اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انھیں قعرِ مذلت میں ڈھکیل رہے ہیں اور انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں؛ کیوں کہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت سماج کی اجازت سے اس کی تسکین نہیں کر سکے گی تو سماج کو دھتا بتائے گی اور گھونگھٹ کی اوٹ میں شکار کھیلے گی اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانونا تسلیم کرنا پڑے گا، حق انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قابل عزت بیوی اور گھر کی مالکہ اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابل نفرت داشتہ یا کسی خانماں برباد اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلینک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے۔ (اسلامیات:۱۶۲-۱۶۱)

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی گنجائش ایک عفیف و پاک دامن سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں؛ بلکہ مغرب کا عصمت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے۔

تعددِ ازدواج میں ایک پہلو عورت کے ساتھ رحم دلی کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو اور کسی مناسب یا نامناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہو تو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے؛ کیوں کہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کر سکتی ہے اور اپنے خنجر ناز سے قانونی بیوی کو گھائل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے نہ کہ

زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی تعدد ازدواج بنتا ہے اور یہ تعدد ازدواج بھی دوسری بیوی کی رضامندی اور خوشنودی ہی سے وجود میں آتا ہے؛ کیوں کہ کسی عورت کو دوسری بیوی بننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اب عورتوں کو بھی اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ جب عورتوں کی شرح آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لئے قانونی طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیوی بنتی رہیں؟ اور ان حقوق وفوائد سے بھی محروم رہیں جو ایک بیوی کو اپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟

تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے والوں کا رویہ بھی قابل توجہ ہے، کہ ایک طرف وہ قرآن مجید کی اجازت سے فائدہ اُٹھا کر دوسرا نکاح کرتے ہیں اور دوسری طرف قرآن ہی کی لگائی ہوئی عدل وانصاف کی شرط کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، تعدد ازدواج ایک سنجیدہ فیصلہ ہے نہ کہ پہلی بیوی سے انتقام کا طریقہ، عوام تو عوام، خواص اور اہل علم بھی جب دوسرا نکاح کرتے ہیں تو کھلے ہوئے ظلم و جور سے اپنا دامن آلودہ کر لیتے ہیں اور زیادہ تر پہلی بیوی کو اور بعض واقعات میں دوسری بیوی کو ''معلقہ'' بنا کر رکھ دیتے ہیں، یہ صریحاً ظلم اور گناہِ عظیم ہے اور اللہ کی شریعت سے کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے، جو شخص عدل پر قادر نہ ہو اس کے لئے ایک ہی بیوی پر قناعت کرنا واجب ہے، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا درست نہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرسکو گے تو تمہیں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے: '' فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً ''۔ (النساء:۳)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تعداد ازدواج کی اجازت ایک سماجی و عمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے اور اپنے نتائج و اثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعثِ رحمت ہے؛ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعدد ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں، ان کا لحاظ رکھا جائے ورنہ یہ قانون حکمِ شریعت کا استعمال نہیں؛ بلکہ ''استحصال'' ہوگا۔ (۲۵ رمئی ۲۰۰۱ء)

طلاق — اسلامی نقطۂ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے، اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی اُلجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو نہ ڈھادیں۔

قرآن مجید نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کے لئے ذریعۂ سکون بتایا ہے (الروم:۲۱) اور ایک کو دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے (البقرۃ:۱۸۷) کہ جس طرح لباس انسانی جسم کا سب سے بڑا اہم راز، تکلیف و آرام کا ساتھی اور محافظ ہے، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے راز داں، ان کی باہمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے اور ہر حال میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں اس رشتہ کو بڑی عظمت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے مرد و عورت میں عفت اور پاکدامنی پیدا ہوتی ہے، دو اجنبی خاندان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور ان کے درمیان محبت و وابستگی پیدا ہو جاتی ہے، یہ تعلق نسل انسانی کی افزائش کا ذریعہ بنتا ہے۔

پھر اگر خدانخواستہ رشتہ ٹوٹتا تو اپنے ساتھ اتنی ہی مضرتیں لاتا ہے، دو آدمی کی زندگیاں ویران ہو جاتی ہیں، بال بچوں کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صحیح طور پر نہیں ہوتی، دو خاندان جس قدر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے اب اتنی ہی دور ہو جاتے ہیں اور آپس میں سخت نفرت اور کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام ابتداء ہی میں ایسے تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے جو بعد میں باہمی نفرت، اختلاف اور ایک دوسرے سے دوری اور علاحدگی کا سبب بن سکتے ہیں، اس کے لئے

اسلام نے بعض ایسی چیزوں کو بھی گوارہ کیا ہے جو اسلام کی اصل سے میل نہیں کھاتیں، مثلاً پردہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے، وہ سب پر واضح ہے؛ لیکن ''منگیتر'' (Francee) کو دیکھنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اسے بہتر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شہوت اور بدنگاہی کا اندیشہ ہو تو بھی مرد ایسی لڑکی کو دیکھ سکتا ہے جس سے نکاح کا ارادہ ہو (عالمگیری: ۵/۲۷۷، کتاب الکراہیۃ) اسی طرح باوجود اس کے کہ اسلام انسانی مساوات اور برابری کا قائل ہے اور ان کے نزدیک عظمت اور برتری اور کمتری صرف تقویٰ اور اللہ کا خوف ہے؛ لیکن چوں کہ بسا اوقات خاندانی اور معاشی یا پیشہ ورانہ برتری اور کمتری میاں بیوی کے درمیان کھچاؤ اور نفرت کی بنیاد بن جاتی ہے، اس لئے شریعت نے اس کی بھی اجازت دی کہ نکاح کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے۔

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کو توڑنے کا نام ہے، اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کردی جائے، (صحیح مسلم) حضرت ثوبان ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت حرام ہے، (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ) آپ ﷺ نے نکاح کا حکم فرمایا اور طلاق سے منع فرمایا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے اور ایک عورت یا مرد کی لذت اُٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا: ''ان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات''۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۵۷۱، مجمع الزوائد: کتاب الطلاق، باب طلاق النساء)

مگر کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور کچھ ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے ہی میں دونوں کے لئے سکون وچین اور اطمینان رہتا ہے، ان حالات میں شریعت ایک ''ناپسندیدہ ضرورت'' سمجھ کر اس کی اجازت دے دیتی ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی

اجازت دی ہے، ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قابل نفرت چیز طلاق ہے: ''ابغض الحلال عند اللہ الطلاق '' (ابو داؤد، ابن ماجه) اور فقہاء نے بھی اسے بلا ضرورت ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ (رد المحتار: ۱۷/۳)

چند صدی قبل تک اسلام پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس نے جدائی کی اجازت دے کر ظلم کیا ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں اس کی مطلق اجازت نہ تھی ، عیسائیوں کے یہاں اس قانون کی بنیاد حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد تھا: جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے، (متی: ۱۹:۶) حالاں کہ اس حکم کی حیثیت یکسر اخلاقی تھی، جیسا کہ اس طرح کا حکم قرآن وحدیث میں موجود ہے۔

مگر یہ ایک ناقابل عمل اور غیر فطری بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس قانون میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی اور آج ہندوستان میں ہندو قانون اور تمام عیسائی ممالک کے عیسائی قانون میں طلاق کی گنجائش پیدا کر لی گئی ہے۔

سب سے پہلے وعظ ونصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لیے اپنی خواب گاہ اور بستر علاحدہ کرلو، یعنی وقتی طور پر اس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کر سکے تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی مار پیٹ بھی کر سکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو، ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہو سکے اور عورت بے جا نافرمانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں؛ لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے :

> اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک پنچ (حَکَم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا، بے شک اللہ علیم وخبیر ہے۔ (النساء: ۳۵)

یعنی دوسرے سمجھدار، دین دار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی جائے گی، اگر اس طرح آپسی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے؛ لیکن اگر ثالثی اور پنچوں کی کوشش کے باوجود دونوں میں موافقت نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو، تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتی ہے، پھر اب بھی ایک ہی دفعہ تین طلاقیں نہ دے؛ بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے، اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گذرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علاحدگی کے فیصلہ پر اٹل ہو تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں، ان کو چاہئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی بات پیش نہ آنے دیں جو باہمی نفرت اور آپسی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے، اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟

پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے، جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے کیا مناسب وقت ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا ان کی زندگی ہمیشہ خوش رہے گی اور انشاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اُصولی بات ہے، اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے :

اول: یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے جو مرد کے لئے پریشانی

کا باعث ہو، حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کردے، (المستدرک:۳۴۴۹،کتاب التفسیر ، تفسیر سورۃ التوبۃ) عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے: یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش وآرائش کرے، شریعت دوسروں کے لئے زیبائش وآرائش کی اجازت نہیں دیتی، جب کہ شوہر کے لئے اس کو پسند کرتی ہے، اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاک دامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے: اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے انتہائی بے توجہی برتے جو شوہر کو ناپسند ہوں، غیر محرم سے یوں بھی شریعت پردہ کا حکم دیتی ہے؛ لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہئے جو شوہر کو ناپسند ہوں، اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

چوتھے: شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے خود غرضی کا اظہار ہوتا ہو، یا ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ شوہر کی حریف ہے، مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ؛ بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے، اس طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنالے تو خود بخود مرد اس سے زیادہ کرے گا جو وہ چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع ہو کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے، نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے؛ بلکہ اگر باہمی رنجش اور کبیدگی پیدا ہوگئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے سماج میں ازدواجی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کریں اور یہ بتائیں کہ طلاق کب اور کس طرح دینی چاہئے۔ (۱۴؍مئی ۱۹۹۹ء)

نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ

ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے ''نفقۂ مطلقہ'' کا مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا ہے، ''شاہ بانو کیس'' نے پورے ملک میں جو ہلچل پیدا کی تھی اور اس مسئلہ کے پس منظر میں ''تحفظ شریعت'' کی تحریک نے جس طرح پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار کیا تھا اور احکام شریعت کو سمجھنے اور اس کی معاشرتی اہمیت کا مطالعہ کرنے کا جو شعور پیدا کیا تھا، وہ یقیناً مسلمانانِ ہند کی دینی اور ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اسی کے نتیجہ میں ''تحفظ حقوق مسلم خواتین بل'' پاس ہوا، مسلمان توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون اس مسئلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب کا مداوا کرے گا؛ لیکن افسوس کہ اس سیدھے سادھے قانون کی ہماری بعض عدالتوں نے ایسی تشریح کی، جس نے اس قانون کے بنیادی مقصد ہی کو مجروح کر کے رکھ دیا اور ایسی تشریحات کی گئیں جو ''قانون کی تشریح'' سے آگے بڑھ کر ''قانون وضع'' کرنے کے دائرہ میں آتی ہیں، ملک کے مختلف ہائی کورٹوں نے اس قانون کی الگ الگ تشریحات کی ہیں، بعض عدالتوں نے عدت کے بعد مطلقہ کو نفقہ کا مستحق نہیں قرار دیا اور بعض عدالتیں مطلقہ کو عدت گذرنے کے بعد بھی نفقہ کا حق دار قرار دیتی ہیں، ابھی ۱۲؍ جولائی ۲۰۰۰ء کو ممبئی ہائی کورٹ نے بھی ایک مقدمہ میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس طرح کے فیصلوں نے یقیناً مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

بعض بھولے بھالے اور قانون کی روح اور مضمرات سے ناواقف غیر مسلم بھائی تو کیا، مسلمان بھی مطلقہ کے لئے نفقہ کے حق کو ایک جائز اور انسانی حق باور کرتے ہیں؛ حالاں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات ناقابل فہم ہے — جہاں تک قانون شریعت کی بات ہے تو شریعت میں ایک شخص کا نفقہ دوسرے شخص پر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ سے

واجب ہوتا ہے: قرابت، حبس، ملکیت، ماں باپ، بال بچے، بھائی بہن، دادا دادی اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت کی بناء پر نفقہ واجب قرار دئے جانے کے سلسلہ میں دو اُصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ قرابت کی بناء پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو، دوسرے اس شخص پر واجب ہوگا جو اتنا خوش حال ہو کہ اپنی ضروریات پوری کر کے اس شخص کی کفالت بھی کر سکتا ہو۔

"ملکیت" کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کر کے کھالے یا فروخت کر دے اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کر دے، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں اور دیانت واخلاق کے خلاف ہے۔

"حبس" کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ پابندی اور حبس کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ، گورنمنٹ اور آجرین پر کیوں واجب ہے؟ اسی لئے کہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہیں —— بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے، بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور اُمور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے، اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب و تنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال و خود مکتفی اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہو جاتی ہے، تو عدت گذرنے کے بعد وہ اپنے

شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کر سکتی ہے، اس لئے "حبس" کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی؛ کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی اور اٹوٹ رشتہ نہیں؛ بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہو جاتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی — جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ مالک اور مملوک، عورت کو بعض قوانین میں مرد کی ملکیت اور جائیداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹایا، اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (البقرۃ:۲۲۸) اس طرح اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ ہندو مذہب میں حقیقی تصور یہی ہے کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے اور ایک عورت کو ہمیشہ اسی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قید نکاح سے آزاد نہیں کر سکتی، دراصل اسی تصور نے "ستی" کے رواج کو جنم دیا، کہ جب شوہر مر جائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذر آتش کر دی جائے، پس؛ چوں کہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں، اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں، اسی لئے برادرانِ وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آچکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہو سکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا جو اعلیٰ تصور ہے اور اس نے عورت کو جو مقام عطا کیا ہے، اس کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا نامناسب بات ہے، اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے نجات چاہتا ہو اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے درپے ہوگا اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے، جو روز ہمارے اخبارات کی سرخیاں بنتے ہیں، قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ نہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

دوسرے: بدقماش اور بیمار ذہن عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح دق کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہیں اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، گویا مرد ''جرم بے گناہی کی سزا'' پا رہا ہے اور عورت اپنی عیش کوشی کے لئے ''وظیفۂ حسن خدمت'' حاصل کر رہی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض بدقماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں اور بے راہ روی کو ترجیح دیں۔

آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کے واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا، تو یہ کونسی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا؛ لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟ — اور پھر کیا کوئی غیرت مند شریف عورت اس بات کو گوارا کر سکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی گذارے جس نے اسے رد کر دیا ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس

کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہر گز نہیں! — اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا، اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور چچا وغیرہ سے میراث کی حق دار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسبِ مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اُصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی اعزہ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، طلاق کے وقت مہر کی صورت میں اسے ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کر کے کچھ گذران حاصل کر سکتی ہے، اور اگر اس کی گود میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو بچوں کی عمر آٹھ سال ہونے تک اور لڑکیوں کی عمر بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حق دار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے — اس لئے ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو اور سب سے بڑا سرمایہ یہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف دوسرے نکاح کی اجازت دی؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط استعمال سے بھی ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو معاشرہ کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، سارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا: کیوں کہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں ؛ بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیام آنے شروع ہو جاتے ہیں، اسی لئے دونوں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستان میں دیکھنے میں آتی ہے — دوسرے: ہماری محبت اور حسن سلوک کا دائرہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ ہم "اپنے اور اپنے بچوں" کے سوا کسی کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے،

یہاں تک کہ بعض لوگ تو بوڑھے ماں باپ کو بھی بوجھ سمجھنے لگے ہیں، ان حالات میں مطلقہ عورتوں کے تئیں ذمہ داریوں کے احساس کی کیا خاک توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ مسلم سماج میں اس احساس کو جگایا جائے اور لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے کہ ایسی بے کس و بے آسرا عورتوں کی ضروریات کی کفالت بھی ہماری ذمہ داری ہے اور یہ احسان نہیں ؛ بلکہ ایک حق کی ادائیگی ہے!

اگر ہم خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں چوکس رہیں تو قانون شریعت پر نہ کوئی زبان کھل سکتی ہے اور نہ کوئی انگلی اُٹھ سکتی ہے!!

پردہ — حفاظت نہ کہ قید

حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے پھر بھی یقین کیجئے، کہ دنیا کے جغرافیہ میں مسلم ملک کے نام سے پائے جانے والے ایک ملک ''جمہوریہ ترکی'' نے ایک اسلام پسند خاتون رکن اسمبلی کو اسمبلی کی رکنیت؛ بلکہ ملک کی شہریت سے بھی محروم کر دیا ہے، شاید آپ سمجھیں کہ اس خاتون نے کوئی اخلاقی جرم کیا ہوگا، کسی سماجی بُرائی کی مرتکب ہوئی ہوگی، بے حیائی اور بے شری کی کوئی بات اس سے صادر ہوئی ہوگی، دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کا مذاق اُڑایا ہوگا؟ مگر نہیں، ایسا نہیں ہے! اس ''گنہگار خاتون'' نے ترکی کے ''سیکولرزم'' پر حملہ کیا ہے، اس کی سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلائی ہے اور ایک ایسا کام کیا ہے جس نے ترکی کے ''روشن خیال'' اور ترقی پسند حکمرانوں کو شرم سے پانی پانی کر دیا ہے اور ان کی جبینِ غیرت گڑ کر رہ گئی ہے — اس خاتون رکن اسمبلی کا ''جرم'' یہ تھا کہ وہ اسکارف پہن کر اسمبلی میں آتی تھی اور اس کی نسوانی غیرت وحیا کو اس پر اصرار تھا، یہ اتنی بڑی ''غلطی'' تھی جو ترک حکومت کے لئے نہایت ناقابل برداشت اور شرم ناک بات تھی۔

حالاں کہ ترکی کا زیادہ تر حصہ ایشین علاقہ ہے، ایک چھوٹی سی ٹکڑی یورپ میں ہے، اس کے مغربی پڑوسیوں کا رویہ کبھی بھی اس کے ساتھ دوستانہ تو کیا منصفانہ بھی نہیں رہا، ترکی کی طرف سے یونان کی کدورت اور اس کو زک پہنچانے کی کوشش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، بوسنیا، کوسووو اور بلقان کے علاقوں میں مغربی جارحیت اور انسانیت کشی کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کی تہہ میں ترکوں سے تاریخی عداوت ہی کارفرما ہے، اس کے مغربی دوستوں کا حال یہ ہے کہ باوجود صد ہزار خوشامد کے آج تک اسے یورپین یونین میں داخلہ نہیں مل سکا اور یورپ کی تجارتی منڈی میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے، یہ مغربی ممالک ہی ہیں جو

کردوں کو ترکوں کے خلاف اور ترکوں کو کردوں کے خلاف اُکساتے رہتے ہیں؛ تاکہ سیاسی عدم استحکام برقرار رہے، دوسری طرف ترکی کی سربلندی اور فتح مندی کی تاریخ دیکھئے، یہ عالم اسلام ہی ہے جس نے ترکی کو صدیوں خلافت کا تاج گہر بار پہنایا اور اس طرح ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصہ پر بلا شرکت غیرے ترکوں نے حکومت کی، یہ ترک جن کا دنیا کی قیادت میں کوئی کردار نہیں تھا اور تہذیب و ثقافت کا کبھی اس قوم سے گذر نہیں ہوا تھا، اسلام کی بادنسیم نے اس کو ایک بہار آفریں انقلاب سے ہمکنار کیا اور ترک قائدانہ صلاحیت، عسکری قوت، علمی و فکری بلندی اور تمدن و ثقافت کا ایک ایسا آفتاب بن کر مشرق و مغرب پر چھا گئے کہ کسی کور چشم کے لئے بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا؛ لیکن اسلام کا منت کش ہونے کی بجائے اسلامی قدروں ہی سے بغاوت کو ترکوں کی بدبختی اور احسان فراموشی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ جس ملک نے صدیوں حرمین شریفین اور مسلمانوں کے قبلۂ اول کی حفاظت کا شرف حاصل کیا ہو، وہ آج اسرائیل کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے اور فوجی مشقیں کرے، اس سے بڑھ کر عجوبہ اور کیا ہوگا؟

یہ سیکولرزم کا لفظ بھی ''موم کی ناک'' سے کم نہیں، جہاں چاہیں سیدھی کر دیں، جہاں چاہیں ٹیڑھی کر دیں، جب چاہیں پھیلا دیں اور جب چاہیں سمیٹ دیں، دنیا میں شاید ہی کسی لفظ سے اتنی متضاد حقیقتوں کو وابستہ کیا جاتا ہو اور جتنا ظلم اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے شاید کسی اور لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہو، امریکہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب اور تہذیب پر چلنے کی آزادی ہے، خواہ وہ کسی قدر بھی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہو، مرد برقع پہننے لگے اور عورتیں بے لباس ہو جائیں، تب بھی کوئی اعتراض نہیں، برطانیہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے؛ لیکن اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہانت کرے تو قانونی جرم اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بے احترامی کی جائے تو کوئی مواخذہ نہیں، خود ہمارے ملک میں ہر سیاسی جماعت کے پاس سیکولرزم کا اپنا تصور ہے، یہاں تک کہ مسجدوں کو شہید اور عیسائی مبلغین کو زندہ نذرِ آتش کرنے والے بھی اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، گویا

سیکولرزم ایسی سخت جان مخلوق ہے کہ اس پر کتنا بھی وار کرو، اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، ترکوں کا سیکولرزم شاید سب سے زیادہ ''روشن خیالی'' پر مبنی ہے، کہ فرانس (۱) جس کو جمہوری انقلاب کا مؤسس سمجھا جاتا ہے اور جو دنیا کی بڑی طاقتوں میں ایک ہے، اس کے سیلوکرزم میں تو پردہ اور نقاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا؛ لیکن ترکوں کا سیکورلزم اس سے ''مرگ بہ لب'' ہو جاتا ہے، سیکولرزم تو اصل میں رائے عامہ کے احترام اور ایک دوسرے کی شخصی آزادی میں عدم مداخلت سے عبارت ہے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی ملک میں بے دین اور بدتہذیب لوگ رائے عامہ کے ذریعہ برسر اقتدار آجائیں، تو سیکولرزم کا تقاضہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار کو قبول کیا جائے؛ لیکن اگر ترکی اور الجزائر میں رائے عامہ اسلام پسند حلقوں کے حق میں ہے تو رائے عامہ کو پس پشت ڈال دینا اور فوجی دہشت گردی کو ان پر مسلط کر دینا سیکولرزم ہے، گویا کہ رائے عامہ کی پاس داری بھی سیکولرزم اور رائے عامہ کا قتل بھی سیکولرزم، سیکولرزم کا یہ وہ معیار ہے جو آتا ترک مصطفیٰ کمال پاشا نے قائم کیا ہے، یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس شخص نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے، اسلامی تاریخ میں شاید ہی کسی منافق نے بھی اسلام کے ساتھ ایسی جفاکشی روا رکھی ہو، فعلیہ ما علیہ۔

بہر حال مجھے یہ خبر سن کر بے ساختہ اکبر الٰہ آبادی کا وہ شعر یاد آیا کہ :

آئیں جو بے حجاب نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ کیا ہوا ؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا !

اکبر نے جو بات کہی ہے وہ ایک حقیت ہے، کہ پردہ کی مخالفت کو کور عقلی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں دولت اور عورت کو سب سے زیادہ پر کشش بنایا گیا ہے، سالانہ جرائم کے اعداد و شمار ملاحظہ کیجئے اور ان کے محرکات کا جائزہ

(۱) یہ تحریر اس وقت کی ہے جب فرانس میں پردہ کے خلاف ''بدبختانہ'' قانون نافذ نہیں تھا۔

لیجئے تو پچانوے (۹۵) فیصد جرائم کے پیچھے یہی حصولِ زر اور حصولِ زن کا جذبہ کارفرما ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عورتیں، مقابلہ مال و دولت کے زیادہ اس کا باعث بنتی ہیں؛ بلکہ اکثر اوقات زر کو زن پر نثار کیا جاتا ہے، اب غور کیجئے کہ مال و اسباب کو چھپانے اور نظر بد سے بچانے کیا کچھ جتن نہیں کئے جاتے، بینکوں کی عالیشان اور قلعہ نما عمارتیں اسی لئے تو ہیں؟ رقم کی معمولی مقدار کے لئے بھی کیا آہنی جوڑیاں نہیں رکھی جاتیں اور مضبوط تالے نہیں لگائے جاتے؟ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو رقم رکھنے کے بجائے چیک اور ڈرافٹ لے جائے جاتے ہیں، کسی قدر ان کی حفاظت اور صیانت کا انتظام کیا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ وہاں تک پہنچنے نہ پائے کوئی نگاہ دیکھنے نہ پائے، یہاں تک کوشش کی جاتی ہے کہ کسی مسافر کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ آپ کے پاس اتنی رقم موجود ہے؟

تو عورت کے وجود اور اس کی عزت و آبرو کے مقابلہ بے قیمت مال و اسباب کے تحفظ کی اتنی کوششیں اور ان کو نگاہِ حرص سے بچا کر رکھنے کا اتنا خیال! لیکن عورتیں جو عزت و ناموس کا آبگینہ ہیں اور جن کے آئینۂ عفت پر ایک بال بھی انسان کی فطرتِ سلیمہ کو گوارا نہیں، ان کو بے پردہ رکھنا کہ سر اور بازو کھلے ہوں، ٹانگیں نظر آتی ہوں، سینہ و پشت سے لوگوں کی نگاہیں ٹکراتی ہوں، کیا شرافت کی بات ہے؟ اور شرافت کو تو جانے دیں، کہ مغربی تہذیب نے اپنی لغت سے اس لفظ کو کھرچ کر رکھ دیا ہے، کیا عقل اور انسانی فطرت بھی اس کو قبول کرتی ہے؟

نظر ہی فتنوں کا حرف آغاز ہے، کہ پہلے نگاہ پڑتی ہے پھر آنکھوں سے آنکھیں لڑتی ہیں، اس کے بعد زبان ہوس اپنا مدعا بیان کرتی ہے، پھر یکے بعد دیگرے بد اخلاقی کے دلدل میں انسان پھنستا چلا جاتا ہے اور اس کا زیادہ نقصان عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے، اسے سماج میں ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے، اسے بے باپ کی اولاد کی ماں بننا پڑتا ہے، پھر وہ گناہوں کے جال میں اس طرح پھنستی چلی جاتی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل سے باہر آنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا اور وہ ہر نگاہ ہوس کی آسودگی کا سامان بنتی رہتی ہے؛ لہٰذا پردہ عورتوں کے لئے نہ قید ہے اور نہ ان کی تذلیل؛ بلکہ یہ ان کی حفاظت و صیانت کا ایک نظام ہے۔

مذہب اور شریعت کے علاوہ خود قانونِ فطرت بھی ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ جو چیزیں عام، غیر اہم اور کشش سے خالی ہوں ان کے لئے حفاظت وصیانت کا اہتمام درکار نہیں، اور جو چیزیں قیمتی، اہم اور وجہ کشش ہوں، ان کی حفاظت کے لئے قدرتی تدبیریں موجود ہیں، پتھر کی چٹانیں کھلی اور بے غبار حالت میں ہر جگہ مل جائیں گی؛ لیکن سونے کی کان پتھر کی طرح کھلے عام دستیاب نہیں؛ بلکہ یہی پتھر اور دوسرے زمینی اجزاء کے تہہ در تہہ غلاف میں سونے کے ذرات چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان کی تلاش بھی مشکل ہے اور تلاش کے بعد ان کو کشید کرنا بھی دشوار، پانی میں سیپ اور اس جیسی کتنی ہی چیزیں تالابوں، ندیوں اور دریاؤں کے کنارے وافر مقدار میں دستیاب ہیں؛ لیکن موتی کو صدف کے مضبوط غلاب میں چھپا کر رکھا گیا ہے، جو تلاش بسیار کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، عورت کا وجود بھی یقیناً ایک پرکشش وجود ہے، جو تاریخ میں بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث بنا ہے، تو کیا ان کی حفاظت وصیانت مطلوب نہیں اور ان کو سماج کے رحم وکرم پر چھوڑنا جرم نہیں؟

یہ بات کہ پردہ ترقی کے لئے رکاوٹ ہے، ایک ایسی فرسودہ اور خلاف واقعہ بات ہے کہ نہ عقل اس کی تصدیق کرتی ہے اور نہ تجربہ، غور کرو کہ علم کی بنیادی طور پر دو ذریعے ہیں، ایک: انسان کی عقل ہے جس کا مرکز دماغ ہے اور دوسرے: انسان میں کسی محسوس کرنے کی صلاحیتیں ہیں یعنی آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتا ہے، زبان جو چکھتی ہے، ناک جو سونگھ کر کسی چیز کو سمجھتی ہے اور ہاتھ یا دوسرے اعضاء جو چھو کر کسی چیز کی سختی اور نرمی کو جانتے ہیں، ان ہی پانچ صلاحیتوں کو فلسفہ کی اصطلاح میں ''حواسِ خمسہ'' (Five Senses) کہا جاتا ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پردہ ان میں سے کسی صلاحیت کو متاثر کر دیتا ہے؟ کیا پردے کی وجہ سے عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے؟ اور انسان کی یہ صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ پردہ کو علمی وفکری ترقی میں رکاوٹ تصور کیا جائے۔

ہاں پردہ ضرور رکاوٹ ہے، بے حیائی اور بے غیرتی میں اس بات میں کہ عورتیں اپنی عفت وعصمت کو قربان کر کے کالبوں کی زینت بنیں، وہ اجنبی مردوں سے ہم دوش ہو کر رقص

وسرور کی بزم میں آراستہ کریں، وہ ''ماڈل گرل'' بن کر تجارت کی تشہیر کا ذریعہ بنیں، اپنے عارضی وگیسو اور سینہ و بازو کو بے پردہ کر کے تجارت کی ترقی کی خدمت انجام دیں اور جو آفسوں اور دفتروں میں آنے والوں کی نگاہ کے لئے خوان ضیافت بنائی جائیں، یقیناً پردہ ایسی بے ہودہ ''ترقیوں'' میں رکاوٹ ہے؛ لیکن اگر اسی کا نام ترقی ہے، تو کیا حیوانات اور چوپائے انسان سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں؟؟

(۲۸ رمئی ۱۹۹۹)

عبادت گاہوں کا احترام اور اسلام

خدا کی پہچان اور اس کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، موحد ہو یا مشرک خدا کی صحیح پہچان رکھتا ہو یا حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہو، خالق کا پرستار ہو یا خالق کو مخلوق کے قالب میں تلاش کرتا ہو اور شجر و حجر، آگ پانی کی پوجا کرتا ہو، اس کی تہہ میں خدا کی محبت ہی کار فرما ہے، آتش پرست آتش کدے کیوں سلگاتے ہیں؟ انسان اپنے ہاتھوں سے رنگ برنگ کی خوبصورت مورتیاں کیوں بناتا ہے؟ گرجا گھروں میں ناقوس کیوں بجائے جاتے ہیں؟ یہود اپنی عبادت گاہوں میں گھٹنے کے بل کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ مسجدوں میں اذانیں کس کی طرف پکارنے کے لئے دی جاتی ہیں؟ — یہ سب خدا کی محبت اور اس کی چاہت کے مظاہر ہیں، یہ اور بات ہے کہ اکثر قوموں نے خدا کی حقیقی پہچان کو کھو دیا ہے اور انھوں نے منزل کے بجائے راستہ اور خالق کے بجائے مخلوق ہی کو اپنا کعبہ مقصود بنالیا ہے، پیغمبر اسلام دنیا میں اسی لئے تشریف لائے کہ انسانیت کو اس کے حقیقی خالق و مالک کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور زندگی کے صحیح طریقوں کے ساتھ ساتھ خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ انسان کو بتایا جائے؛ لیکن بہر حال مختلف قوموں میں عبادت کے جو طریقے مروج ہیں، وہ درحقیقت انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی آواز ہے، خدا کی محبت، خدا کی چاہت، خدا کو پانے کا شوق، خدا کو اپنے آپ سے راضی کرنے کا جذبہ، خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی کو بچھانا اور اس کے حضور اپنی ضرورت واحتیاج کے ہاتھ اٹھانا، مانگنا، رونا اور گڑگڑانا، یہ سب انسانی فطرت کا حصہ ہے اور یہ بجائے خود خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خدا ہر جگہ ہے اور تہہ تہہ پر اس کی حکمرانی ہے؛ لیکن خدا کی جو عظمت اور جلالت شان انسان کے قلب و ذہن میں رچی بسی ہے، اس کے تقاضا سے آدمی چاہتا ہے کہ خدا کی بندگی

اور اس سے سرگوشی کے لئے پاک صاف جگہ ہو، جہاں سکون ہو، جہاں انسان کی روحانیت مادی آلائشوں سے آزاد رہ سکے اور وہ گھڑی چند گھڑی خدا کے حضور یکسو ہو سکے، اسی مقصد کے تحت ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر علاقہ میں عبادت گاہوں کی تعمیر کا ذوق رہا ہے، اس سلسلہ کا آغاز کس عبادت گاہ سے ہوا؟ اس کا جاننا بہت دشوار ہوتا، اگر خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: سب سے پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو مکہ میں تعمیر کیا گیا، (آل عمران:۹۶) قرآن مجید میں کعبہ کی تعمیر ابراہمی کا صراحتاً ذکر موجود ہے (البقرۃ:۱۲۷)؛ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم ؑ یا ان سے بھی پہلے فرشتوں نے خدا کے اس گھر کو تعمیر کیا تھا، یہ عبادت گاہ توحید کا مرکز تھی، ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گی، مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قریب دو ڈھائی سو سال پہلے سے لے کر آپ ﷺ کی بعثت کے اکیس سال بعد تک یہ مرکز توحید ''بت کدہ'' بنا رہا؛ لیکن آپ ﷺ نے کبھی اس گھر کی بے حرمتی نہیں فرمائی، مکہ فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس کے بت صاف کر دیئے اور اس کو اپنی اصل وضع پر لے آئے؛ لیکن اس کے در و دیوار سے ایک اینٹ بھی نہ کھینچی گئی اور حالاں کہ اس کی تعمیر بناء ابراہیمی سے کسی قدر مختلف تھی، پھر بھی اس کی توقیر و اکرام میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عبادت گاہیں کس قدر قابل احترام اور لائق رعایت ہیں۔

جب بیت المقدس کا علاقہ فتح ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ مقام ''صخرہ'' کو عیسائیوں نے کوڑا کرکٹ اور نجاستیں پھینکنے کی جگہ بنا رکھا تھا اور یہ یہودیوں کی عداوت کی بناء پر تھا؛ کیوں کہ یہود اسی کو اپنا قبلہ بناتے تھے، حد یہ ہے کہ عورتیں اپنے ناپاکی کے کپڑے یہاں ڈالتی تھیں، سیدنا عمر ؓ جب بیت المقدس پہنچے اور مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی تو ''صخرہ'' پر جو مٹی اور گندگی جمع تھی اسے اپنی چادر اور قباء مبارک کے دامن میں رکھ کر منتقل کرنا شروع کیا، اس طرح تمام مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مقام کو گندگی سے صاف کیا، عیسائیوں کا یہ عمل دراصل یہودیوں کے رد عمل میں تھا؛ کیوں کہ جس مقام پر حضرت عیسیٰ ؑ کو عیسائی عقیدہ کے مطابق

سولی دی گئی تھی، اس مقام پر یہود سڑی گلی چیزیں پھینکا کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایۃ: ۵۶/۷)

رسول اللہ ﷺ نے مذہبی جذبات کی رعایت اور عبادت گاہوں کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ فرمایا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ نہ کوئی چرچ منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی مذہبی رہنما کو نکالا جائے گا: ''**لاتهدم لهم بيعة ولا يخرج لهم قس**'' (ابوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) بعض مؤرخین نے معاہدہ نجران میں یہ دفعات بھی نقل کی ہیں کہ پادریوں راہبوں اور پجاریوں کو اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا اور نہ صلیبیں اور مورتیاں توڑی جائیں گی۔ (مقامات شبلی: ۱۸۹، بحوالہ فتوح البلدان: ۶۵)

شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوعبیدہ ؓ، حضرت عمر بن عاص ؓ اور دو اور صاحبان کی گواہی کے ساتھ دستاویز تحریر فرمائی، جس میں نام بنام چودہ گرجوں کا ذکر فرمایا اور اس کی حفاظت کی تحریری ضمانت دی۔ (البدایہ والنہایۃ: ۲۱/۷)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مصر کے موقع سے بھی حضرت عمر بن عاص ؓ نے گرجوں کی حفاظت کے سلسلہ میں دستاویزی معاہدہ کیا تھا اور ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کے اندر جس طرح چاہیں عبادت کریں، اور جو کہنا چاہیں کہیں: ''**ان يخلى بينهم وبين كنائسهم يقولون فيها مابدالهم**''۔ (جمع الفوائد: ۵۰۰/۲، بحوالہ طبرانی کبیر)

مسلمانوں کو ہمیشہ عبادت گاہوں کا اتنا لحاظ رہا کہ حضرت معاویہ ؓ نے جب دمشق کی جامع مسجد میں یوحنا کے نام سے موسوم گرجا کو شامل کرنے کی کوشش کی اور عیسائی اس پر راضی نہ ہوئے تو آپ اس سے باز رہے؛ لیکن عبدالملک بن مروان نے بہ جبر گرجا کو مسجد میں شامل کرلیا، پھر خلیفہ عادل و راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں عیسائیوں نے فریاد کی اور اس کا حوالہ دیا؛ چنانچہ حضرت عمرؒ نے دمشق کے گورنر کے نام حکم جاری فرمایا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے وہ انھیں واپس کردیا جائے، آخر مسلمانوں نے عیسائیوں کی خوشامدیں کر کے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا اور اس طرح یہ مسجد بچ سکی۔ (فتوح البلدان: ۱۳۱)

مسلمانوں کے عہد حکمت میں غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف اپنی قدیم عبادت گاہوں کو باقی

رکھنے کا حق تھا؛ بلکہ نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بھی اجازت تھی، مولانا عبدالسلام ندویؒ لکھتے ہیں :

> خود عیسائیوں کو اپنی آبادی میں گرجا بنانے کی ممانعت نہ تھی؛ چنانچہ جب فسطاط مصر میں عیسائیوں نے ایک نیا گرجا بنایا اور فوج نے اس کی مخالفت کی تو حضرت سلمہ بن مخلد نے یہ استدلال کیا کہ یہ تمہاری آبادی سے باہر ہے اور اس پر تمام فوج نے سکونت اختیار کیا، (حسن المحاضرہ:۵/۲) — ہارون رشید کے زمانہ خلافت میں مصر کے گورنر عامر بن عمر نے جب عیسائیوں کو گرجوں کے بنانے کی عام اجازت دینا چاہی تو لیث بن سعد اور عبید اللہ بن لہیعہ سے مشورہ لیا، ان بزرگوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ مصر کے تمام گرجے صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔(ولاۃ مصر:۱۳۲)

مسلمانوں نے نہ صرف مذہبی عبادت گاہوں کو قائم رکھا اور ان کی تعمیر کی اجازت دی؛ بلکہ عبادت گاہوں کے اوقاف، عہدے اور ان کے وظیفے بھی برقرار رکھے علامہ شبلیؒ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> عمرو بن عاص ﷺ نے حضرت عمر ﷺ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں، اسی طرح بحال رہنے دیں؛ چنانچہ اس قسم کی جو اراضیات ۷۵۵ھ تک موجود تھیں ان کی مقدار ۲۵ ہزار فدان تھی۔(مقالات شبلی:۲۰۲)

علامہ شبلی نے آگے لکھا ہے :

> حضرت عثمان ﷺ کے زمانہ میں مرو کا جو پیٹر یارک تھا اور جس کا نام "Jesujah" تھا، اس نے ایران کے لارڈ بشپ (Simeon) کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے: "عرب جن کو خدا نے اس وقت

جہاں کی بادشاہت دی ہے، عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے ؛ بلکہ
برخلاف اس کے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں، ہمارے
پادریوں اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں اور گرجوں
اور خانقاہوں کے لئے عطیہ دیتے ہیں۔ (حوالۂ سابق: ۲۰۵-۲۰۴)

محمد بن قاسمؒ نے جب سندھ کو فتح کیا تو برہموں کے ساتھ خصوصی حسن سلوک، تہوار وغیرہ سے متعلق ان کی مذہبی تقریبات اور ان کو جو دان اور تحائف ملا کرتے تھے، ان سب کو برقرار رکھا۔ (حوالۂ سابق: ۲۰۰۳)

یہ اور اس طرح کے بہت سے تاریخی حقائق ہیں جن سے دوسری قوموں کے ساتھ خالص مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کی رواداری اور فراخ قلبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، عبادت گاہ خواہ کسی قوم کی ہو، بہر حال اسے خدا کی عبادت و بندگی سے ایک نسبت ہے، اس لئے اس کی بے حرمتی کو ہرگز روا قرار نہیں دیا جاسکتا، اس سے لوگوں کے گہرے جذبات متعلق ہیں، ایسی ناشائستہ حرکتوں سے پوری قوم کو ٹھیس لگتی ہے اور ان کے قلوب مجروح ہوتے ہیں، اس لئے عبادت گاہوں پر حملہ اور ان کی بے حرمتی اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے، افسوس کہ سنگھ پریوار نے ہندوستان میں "بابری مسجد" کو شہید کر کے عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی ایک نئی راہ دکھا دی ہے اور شر پسند عناصر جذبات سے کھیلنے اور ماحول کو غیر معتدل رکھنے کے لئے اب اسی مذموم طریقہ کا استعمال کر رہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو لوگ عبادت گاہوں کے ساتھ زیادتی کے اصل میں مرتکب ہیں وہی مسلمانوں کو انتہاء پسند اور دہشت گرد کہتے ہیں اور ان پر مذہبی مقامات کی بے احترامی کا الزام لگاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے سادہ ذہن غیر مسلم بلکہ ناواقف مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک شدت پسند اور مذہب کے معاملہ میں بے مروت اور ناروادار مذہب ہے، کاش! لوگ اسلام کو پڑھیں اور حقائق کو جاننے کی سنجیدہ کوشش کریں!

(۲۸/ جولائی ۲۰۰۰ء)

زنا کی سزا — موجودہ سماجی ماحول میں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک سے ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگ کے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ اہل ہوس جس کے اسیر زلف ہو کر رہ جاتے ہیں اور کتنی ہی نعمتیں ہیں، جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات و خواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ہی کی پوری کی جاسکتی ہے؛ لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شی سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات و مراتب کا فرق ہوگا؛ لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُر سکون رکھے گا اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت اور اس لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت و عداوت اور مخالفت کو جنم دیتا ہے، پھر لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ لوگ محروم و ناکام، جو محروم ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، اس کے دل میں انتقام اور تشدد کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور یہی جذبات

جرم کی صورت اختیار کرتے ہیں، دنیا میں ہر طبقہ مفادات میں دوسرے طبقہ سے متصادم ہے، غریبوں کو مالداروں سے گلہ ہے، مزدوروں کو آجرین سے شکوہ ہے، رعایا حاکموں اور فرماں رواؤں سے شاکی ہے، یہ تقسیم دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی کہ اسی سے کائنات کی ہمہ رنگی قائم ہے، اس لئے آخرت سے پہلے ایسی دنیا کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو جرم اور جرم کے جذبات سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہو؛ البتہ جرم کو روکنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔

جرم کو روکنے کے تین محرکات ہیں، اول: طبعی شرافت، دوسرے: قانون کا خوف، تیسرے: آخرت میں جواب ہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے:

''کل ولد یولد علی الفطرۃ'' (بخاری:۱۲۹۶،کتاب الجنائز ، باب ماقیل فی اولاد المشرکین)

انسان بہر حال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم و جور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہوجاتی ہیں اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا مؤثر ذریعہ قانون ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے، اسلام نے بھی کچھ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں اور وہ یہ ہیں: زنا، چوری، زنا کی تہمت، شراب نوشی، راہزنی اور ارتداد، ان سے متعلق سزاؤں کو ''حدود'' کہتے ہیں، یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق مانے گئے ہیں، اس لئے عدالت یا خود صاحبِ معاملہ بھی مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں،

اسلام کے نظام جرم وسزا میں دوسری اہم چیز ''قصاص ودیت'' ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، اس جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا، اس لئے صاحب معاملہ یا اس کے اولیاء جرم کو معاف کرسکتے ہیں اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کرسکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں ان کی بابت، عدالت اپنی صواب دید سے سزا کا فیصلہ کرسکتی ہے اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں ''تعزیر'' کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے؛ لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہنچ سکتا، آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا اور نئے نئے راستے تلاش کرلے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوف خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے ''حدود'' میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی سزا سو کوڑے ہے اور شادی شدہ کے لئے سنگسار (Stoneto Death) کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف دامن اخلاق کو تار تار کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے؛ بلکہ یہ ایک پورے خاندان کے عزت وآبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ وعار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے اور اصحاب شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث حیاء نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے والے بچہ کو

پہنچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے؛ بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوار پن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کے عزت و آبرو کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والے بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے یہ اور اس قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے؛ کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا؛ بلکہ اعداد وشمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد وشمار کے مطابق اس سال چوری کے ۷۱۹ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ کیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا، اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۱۹۷۱ء تک چوری کے صرف بارہ ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں، قتل وغیرہ کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ مؤثر ہیں محض قید کی سزا اس درجہ جرم کے سدباب میں مفید نہیں۔

جبری زنا کے سلسلہ میں اس وقت ایک بحث چھڑی ہوئی ہے، ہمارے وزیر داخلہ شری لال کرشن اڈوانی اور ریاست کے چیف منسٹر جناب چندرا بابو نائیڈو دونوں کا رجحان ہے کہ اس

جرم کی سزا پھانسی ہونی چاہئے ،بعض تنظیموں نے اس کی مخالفت کی ہے اور بعض مسلم تنظیموں اور شخصیتوں نے اس کی تائید کی ہے، غالباً اس لئے کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے قریب ہے؛ لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کر دیا جائے، مثلاً: یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا؛ کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسرِ عام اپنی زیبائش و آرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پُر کشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی؛ کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی، دوسرے: جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو۔

ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی، وی نے حیاء کی چادر اتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنا دیا ہے، تعلیم گاہوں سے لے کر دفاتر تک ایک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں؛ بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا پھانسی کو قرار دینا میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے

''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے؛ لیکن تقاضہ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محل نظر ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

(۱۵ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

ذبحِ حیوان — حقائق اور غلط فہمیاں

ادھر چند سالوں سے جیسے بقرعید آتی ہے، فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آجاتی ہیں اور ''گاؤ کشی'' اور ''جیو ہتیا'' کے خلاف بیانات شروع ہو جاتے ہیں؛ بلکہ قربانی کے خلاف ایک مہم سی چلائی جاتی ہے، اس سال چوں کہ ۱۰ ر ذی الحجہ کو ہی '' جین جینتی'' بھی تھی، اس لئے اس مسئلہ کو نسبتاً زیادہ ہوا دینے کی کوشش کی گئی، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مرکز میں بی۔ جے۔ پی حکومت ہے، گویا ''چور خود چوکیدار'' ہے، اس لئے فساد کی آگ سلگنے نہ پائی، حقیقت یہ ہے کہ انسانی غذا کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا نہ مذہب کے خلاف ہے اور نہ بے رحمی ہے؛ بلکہ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور اس سے بہت سے غریبوں کے معاشی مفادات متعلق ہیں، جس کو نظر انداز کر دینا کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں، ضرورت ہے کہ غیر مسلم برادرانِ وطن غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ جوابی اشتعال کے بجائے دلیل کی زبان میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو سمجھائیں اور ان کو قائل کریں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے، اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے '' جین مذہب'' کے حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے، آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے؛ لیکن یہ محض اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے، پکانے اور قربانی کا تذکرہ

موجود ہے، رگ وید میں ہے :

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینس پکائیں۔
(رگ وید: ۷:۱۱:۱۷)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے، (یجر وید، ادھیائے: ۲۰:۸۷) منوسمرتی میں کہا گیا ہے :

مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک،
بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے
پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی، ادھیائے: ۳:۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانے تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تارا چند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوشت کے انسانی غذا ہونے اور اس مقصد کے لئے ذبحِ حیوان کے جائز ہونے پر نہ صرف یہ کہ مذاہب عالم متفق ہیں؛ بلکہ تقاضۂ فطرت کے تحت اور عقلی طور پر بھی اس کا حلال ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنا ہے، یعنی یہ ''جیوہتیا'' کا باعث بنتا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں کہ کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ مخلوق کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے، غور کرو کہ کیا اس جیوہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے؟ آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اتارتے ہیں، تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبان حال سے پروانۂ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے ہوں، ان کا خاتمہ کر دیں، پس ''جیوہتیا'' کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں

پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں، خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے، سوامی دیانند جی نے ''آواگمن'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں: انسان، حیوان اور نباتات، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہے تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہوں۔

پھر انسانی خوراک کا بڑا حصہ جانور ہی سے پورا ہوتا ہے، بعض بہت ٹھنڈے یا بہت گرم صحرائی علاقے ہیں کہ وہاں کھیتی نہیں کی جا سکتی، وہاں گوشت ہی انسانی غذا کے کام آتے ہیں، پھر خود جسم انسانی میں بعض ایسے عناصر ہیں کہ ان کی کمی کو بغیر گوشت کے پورا نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ جانور ایک عمر کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، نہ ان سے دودھ حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی اور کام آ سکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر آپ ان کو غذا بنانے کی اجازت نہ دیں تو مویشی کی پرورش کرنے والوں کے لئے وہ بہت بوجھ بن جائیں گے اور غریب کسان جو خود اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے وہ کیوں کر اس بوجھ کو برداشت کر سکیں گے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے؛ بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستے قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا؛ لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے، اس کی مثال امریکہ اور یوروپ ہیں، ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاصی

تحدیدات ہیں؛ لیکن اس کے باوجود یہاں دودھ، گھی زیادہ مہنگے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک جانوروں کی افزائش نسل کر کے بڑے پیمانے پر ان کے گوشت برآمد کرتے ہیں اور اس طرح وہ کثیر اقتصادی منافع حاصل کرتے ہیں، اگر ہمارے ملک میں اس پر روک لگادی گئی تو یہ ملک وقوم کو گوشت اور چرم وغیرہ کی برآمدات کے ذریعہ حاصل ہونے والی کثیر آمدنی میں شدید خسارہ کا باعث ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گوشت خوری سے انسان میں تشدد اور ہنسا (Violence) کا مزاج بنتا ہے اور یہ انسان پر منفی اخلاقی اثر ڈالتا ہے؛ لیکن دنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے، آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں (Vege Tarian) اور گوشت خوری کے مخالف ہیں، رہنمایان عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح علیہ السلام کو عدم تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے؛ لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ بھی گوشت خور تھے، گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے؛ بلکہ دم آخر میں بھی گوشت کھا کر ہی ان کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بھی بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے، جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جواب دہی کا احساس نہ ہو تو محض غذائیں انسان کے مزاج ومذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۲/ اپریل ۱۹۹۹ء)

قانونِ شریعت — رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انھیں مشکل نہیں ہوتی ، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات، جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی ، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات، جذبات، مصالح ومفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا؛ اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اُصولِ زندگی اور جتنا مناسب قانونِ حیات وضع کرسکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی، نظامِ زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لئے قوتِ فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے: ''اَلَا لَہُ الْحُکْمُ'' ۔ (انعام:۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا؛ کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور اس سے اس بات کی بھی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیتِ انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور انصاف سے کام لے سکے گا،

اسی لئے خدا کے ''رب'' اور ''رحمٰن ورحیم'' ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گذارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جاتا رہا، اسی کو ''شریعت'' کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام ﷺ اس عہد میں تشریف لائے، جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا؛ اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے، جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں؛ لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے، آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعتِ محمدی اس وقت دُنیا میں آئی، جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام ''اکمالِ دین'' اور ''اتمام نعمت'' ہے۔ (المائدۃ:۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے، جو ''شریعتِ الٰہی'' یا ''اسلامی قانون'' کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض ''نظریہ'' نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام ونشان کردے؛ بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم وبیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا ہے، دنیا میں جب بھی اس قانون کی

آزمائش کی گئی، اس کی افادیت، قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن وسلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافت عثمانیہ، ترکی کے سقوط (۱۹۲۴) کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا؛ لیکن آج بھی دُنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن وسلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی احساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیاء وافریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ممالک کو تو عرصہ سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جارہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو، جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن وامان اور قانون وآئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتہ پہلے اچانک وزیراعظم پاکستان جناب نواز شریف نے ''شریعت بل'' کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن وحدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائے گا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں؛ لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں وہ ''پرسنل لا'' تک محفوظ نہیں، جس کو کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو اونچا اُٹھانے کی ایک تدبیر ہے؛ تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانہ بھی یہ بل پاس ہو

جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی جے پی گورنمنٹ، جو خود 'رام راج' کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ''ڈراؤنی'' چیز ہے؛ حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے، نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن وامان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی؛ کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُمورِ خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی؛ کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق وفرائض کی تعیین میں افراط وتفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دیں، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط وتفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعتِ اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود وقصاص کے قوانین، جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہیں۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنے ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں، ایک: اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع، جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، پکوان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے؛ لیکن بھوک و پیاس جیسے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کی جگہ ایٹم بم اور میزائیل بنالیا ہے؛ لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی یہی حال زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے؛ اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ کہ آج دنیا کا کوئی قانون نہیں، جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی قانون میں تو اسلامی قانون سے اتنا فائدہ اُٹھایا گیا ہے کہ اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض

اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر لوگ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے، نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ۔ اور نہ اس پر دُنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن و سلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ کچھ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانونِ شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انھوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلتی ہیں گنگ ہو جائیں گی!

(۲/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

بنیادی انسانی حقوق کا اولین منشور

بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور نا قابل
نراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو جنگ عظیم کے نام
سے یاد کی جاتی ہیں، اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ
یں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے
ا کھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سرو سامان نہ کر لیا، کہا جاتا ہے کہ کوئی
بھی شی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے؛ چنانچہ جب یہ جنگی جنون
پنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک
کرن طلوع ہوئی اور وہ یہ کہ مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل
شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے یہ آواز اٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی
انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ و امن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو، بالآخر یہ
خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی
حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی، اسی پس منظر میں ۱۰ر دسمبر کو
عالمی سطح پر "بنیادی انسانی حقوق" کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ہر چند کہ یہ منشور عملاً
یک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؛ کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے
ور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں، دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس
سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے؛ لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی کامیابی
ہے اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس میں جو کچھ خامیاں ہیں وہ بتدریج دور ہوسکیں گی۔

یہ منشور تیس دفعات پر مشتمل ہے، جن میں زندگی کا حق، آزادی اور وقار و حقوق کے

معاملہ میں مساوات، نسل و رنگ، جنس، زبان اور مذہب کی بناء پر عدمِ تفریق، قانونِ مساوات عدالتی چارہ جوئی کا حق، بلا جواز گرفتاری یا جلاوطنی کی ممانعت، الزامات کے مقابلہ صفائی کا حق نجی زندگی کے تحفظ کا حق، ملک کی حدود میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی، بیرونِ ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے، شہریت حاصل کرنے، اپنی مرضی سے شادی کرنے، تنہا مشترک جائداد رکھنے، ضمیر و عقیدہ اور تبدیلی مذہب، اظہارِ خیال اور اجتماع و تنظیم، اپنے ملک کی سیاست میں حصہ داری، اپنی پسند کے پیشہ کا انتخاب، حصولِ تعلیم وغیرہ کے حقوق کا ذکر ہے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خواتین اور بچوں کے حقوق، نیز نسلی امتیاز اور غلامی کے انسداد کے لئے بھی اقوام متحدہ نے مختلف قراردادیں منظور کی ہیں، جو گویا اسی منشور کا تکملہ ہیں۔

اگر واقعی دیانت داری کے ساتھ اس منشور کا نفاذ عمل میں آتا، تو یہ انسانیت کے لئے بارانِ رحمت ثابت ہوتا؛ لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہیں پایا، ایک تو یہ تحریک ہی رضا کارانہ ہے دوسرے مختلف ملکوں نے انسانی حقوق کے الگ الگ پیمانے قائم کر لئے ہیں، اقوام متحدہ کی بے بسی کا کھلا ہوا ثبوت ماضی قریب ہی میں یورپ کے قلب ''بوسنیا'' میں ساری دنیا نے دیکھا ہے، ۳۰ رنومبر ۱۹۷۳ء کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسلی امتیاز کو قابل سرزنش جرم قرار دینے کی غرض سے ایک تجویز پاس کی، تو امریکہ اور برطانیہ بھی اس تجویز کے مخالفین میں تھے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود قانون بنانے والوں کی نگاہ میں ان حقوق کی کیا اہمیت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو ڈرانے، دھمکانے اور ان کا استحصال کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔

مسلمانوں کی تصویر آج کچھ اس طرح مسخ کردی گئی ہے کہ لوگ ''مسلمان'' اور ''دہشت گرد'' کو مترادف الفاظ تصور کرنے لگے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں انسانی قدروں کے احترام کا کوئی تصور نہیں ہے؛ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ علم و دانش کی موجودہ دُنیا کو انسانی حقوق کا سب سے پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا اور آج دُنیا میں جو کچھ انسانی حقوق کی بات کی جارہی ہے، وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کے تصور کی بازگشت ہے،

پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا، وہ بنیادی انسانی حقوق کے لئے متن کا درجہ رکھتا ہے، اس خطبہ کے چند اقتباسات کچھ اس طرح ہیں :

❖ لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا فضیلت نہیں ، ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام آثار و مفاخر ختم کئے جاتے ہیں، صرف سدانہ (کعبہ کی نگرانی و نگہبانی) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کے عہدے باقی رہیں گے۔

❖ قتل عمد کا بدلہ قصاص ہے، عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے وقوع میں آئے، اس کی دیت سو اونٹ مقرر ہے، جو زیادہ چاہے گا وہ اہل جاہلیت میں سے ہوگا، اہل قریش! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دُنیا کا بوجھ لدا ہوا ہو، جب کہ دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا، اہل قریش ! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو خاک میں ملا دیا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے لئے تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

❖ لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تمارے لئے حرام (محترم) ہیں ، یہاں تک کہ قیامت میں خدا کے سامنے پیش ہو، جس طرح اس دن اور اس مہینہ کی حرمت تمہاری نزدیک مسلم ہے اور عنقریب تم سب خدا کے آگے جاؤ گے، پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

❖ تمام سودی کاروبار آج سے ممنوع قرار پاتے ہیں ؛ البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا، اللہ نے یہ بات طے کر دی ہے کہ سود کی گنجائش نہیں اور جہاں تک عباس (ابن عبد المطلب) کے سود کا تعلق ہے، تو میں ان تمام سود کو باطل کرتا ہوں اور زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں اور (اپنے خاندان میں سے) پہلا انتقام جسے میں معاف کرتا ہوں ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بچے

کا، جسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔

❖ قرض قابل ادائیگی ہے، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے، تحفہ کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے تو اسے تاوان ادا کرنا چاہیے۔

❖ لوگو! تمہارے اوپر جس طرح تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اسی طرح ان پر تمہارے کچھ حقوق واجب ہیں، عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ سلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی بے حیائی کا کام نہ کریں، پس اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو اور ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو، پھر اگر وہ باز آجائیں تو (حسبِ حیثیت) ان کا کھانا، کپڑا تمہارے ذمہ ہے، پس عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور ان سے بہتر سلوک کرو؛ کیوں کہ وہ تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں، تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال ہوئیں اور کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

❖ لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جو اس کا بھائی برضا و رغبت عطا کر دے، اپنے نفس اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔

❖ اور ہاں تمہارے غلام! ان کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو اللہ کے بندو! انھیں فروخت کر دو اور انھیں سزا نہ دو۔

❖ لوگو! سنو اور اطاعت کرو، اگر چہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنا دیا جائے، جو تم پر کتاب اللہ کو قائم کرے۔

غور کیا جائے تو آپ ﷺ کا یہ خطبہ بنیادی انسانی حقوق کا اصل منشور ہے، جس میں انسانی مساوات، جرم و سزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت،

مال و جائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان و اظہار ہے، اسلام نے ان حقوق کو محض کاغذی پیرہن عطا نہیں کیا؛ بلکہ اس کو برت کر دکھایا، کمزوروں کی دادرسی کی اور پست کو بلند کیا، قرآن و حدیث میں اور پھر قرآن و حدیث سے اخذ کر کے کتبِ فقہ میں انسانی بنیادی حقوق کو اتنی وضاحت و تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے اور ان کو سامنے رکھ کر ایک پورا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے کہ شاید کہیں اور اس کی مثال مل سکے، اسلام نے حقوق کو صرف دنیا ہی سے متعلق نہیں رکھا؛ بلکہ ان حقوق کی ادائیگی اور عدم ادائیگی سے آخرت کے احتساب کے تصور کو بھی وابستہ رکھا، یہ تصور انسان کو ان حقوق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اگر دنیا کو واقعی انسانی حقوق کی پاسداری مطلوب ہے، تو اسے اسلامی تعلیمات کی طرف رُجوع کرنا چاہئے، کہ اسلام کسی ایک قوم کی میراث نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کی امانت ہے۔

(۱۱ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

بین قومی اتحاد — اسلام کی نظر میں

دنیا میں دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، اس جنگ نے پوری دنیا کی کمر توڑ دی، مفتوحین تو کیا فاتحین کے بھی ہوش ٹھکانے لگ گئے، نہ جانے، کتنی بے قصور جانیں جنگ کے اس مہیب دخوں آشام عفریت کی غذا بن گئیں، نازیوں کی یہود دشمنی میں کتنے یہود کام آئے؟ اس کی صحیح تعداد جاننا مشکل ہے، اڑسٹھ لاکھ سے زیادہ تو وہ یہودی تھے جن کو گیس چیمبروں میں ڈال کر فنا کر دیا گیا، یہ گویا ایک پوری قوم اور نسل کو تہہ تیغ کر دینے کی شیطانی سازش تھی، ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اب تک کی تاریخ میں پہلی اور آخری بار ایٹم بن گرایا گیا، اس سے ہونے والی تباہ کاری یہودیوں کی نسل کشی سے بھی آگے بڑھ گئی اور افسوس کہ یورپ نے اس واقعہ پر افسوس کرنے کے بجائے چراغاں کیا اور خوشیاں منائیں، آخر اگست ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ اختتام کو پہنچی۔

اس سے پہلے ۲۴؍جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰ ممالک کے نمائندوں نے بین الاقوامی امن اور صلح کی غرض سے سان فرانسکو میں ایک اجتماع منعقد کیا تھا، اب چار ماہ بعد ۲۴؍اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اگلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اقوام متحدہ کے منشور پر پچاس ممالک نے دستخط کئے اور اس طرح ادارہ ''اقوام متحدہ'' کا وجود عمل میں آیا، اقوام متحدہ اس نوعیت کا پہلا ادارہ نہیں تھا؛ بلکہ اس سے پہلے ۱۹۱۹ء میں صدر امریکہ مسٹر ویلسن کی تحریک پر لیگ آف نیشنس (مجلس اقوام) قائم ہو چکی تھی، جس میں دنیا کے پچیس ممالک شامل تھے؛ لیکن دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے عملاً اس تنظیم کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے اس کی جگہ لی، اب اس وقت اقوام متحدہ کی رکن ممالک کی تعداد ایک سو پچاسی ۱۸۵ تک پہنچ چکی ہے، گو عملاً یہ عالمی تنظیم محض پانچ ممالک، امریکہ، برطانیہ، چین، روس اور فرانس کی یرغمال ہے؛

لیکن بہر حال عالمی سطح پر انسانی مسائل حل کرنے کے لئے ادارہ کا وجود ایک ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر انصاف کا حصول، قوموں کو قانون جنگ کا پابند رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ اور متصادم اقوام وممالک کے درمیان صلح وصفائی کی کوشش، نیز انسانی بنیادوں پر مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا ہے، گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اقوام متحدہ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اور کیا طاقت ور ممالک کو بھی عدل وانصاف کا پابند بنانے میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہایت اہم اور اعلیٰ مقاصد ہیں اور موجودہ حالات میں جب کہ پوری دنیا ایک گھر بن چکی ہے، بہ مقابلہ پہلے کے اس کی اہمیت کہیں بڑھ گئی ہے، اس پس منظر میں ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسی بین قومی وحدت کی کیا اہمیت ہے؟ اور اسلام اس سلسلہ میں کیا تصور رکھتا ہے؟

امن وامان کا قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کی جس آیت میں عدل واحسان کا حکم دیا گیا ہے، اس کو خطبۂ جمعہ کا جزو بنا دیا گیا اور ہر جمعہ کو یہ آیت پڑھی جاتی ہے: ''إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ '' (النحل:۹۰) قرآن مجید ہمیں تلقین کرتا ہے کہ کسی کی عداوت ودشمنی بھی تمہاری طرف سے عدل وانصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ پائے: ''لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا '' (المائدۃ:۸) اس لئے قیام امن کی جو بھی سعی ہوگی وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ اور مطلوب ہوگی، قرآن نے اپنے آپ پر یقین کرنے اور اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے والوں کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں، مومن اور مسلم ''مومن'' امن سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی ہی ہیں: دوسرے کو امن دینے والے کے اور مسلم ''سلم'' سے ہے، جس کے معنی صلح اور بچاؤ کے ہیں، گویا مسلم وہ ہے جس سے دوسرے لوگ حفاظت وسلامتی میں رہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں امن وامان اور صلح وآشتی کی کیا اہمیت ہے؟

خود رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، اسی سلسلہ کی

ایک کوشش نبوت سے پہلے ہوئی، جس کو ''حلف الفضول'' کہتے ہیں، اس تحریک میں آپ پیش پیش رہے، ہوا یوں کہ بنوزبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے، ان سے عاص بن وائل نامی شخص نے ایک سامان خریدا اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے، زبیدی نے ہزارہا کوشش کی اور مکہ کی بااثر شخصیتوں سے رابطہ کیا؛ لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوع آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد و پیش بیٹھے رہتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو چونکا دیا، زبیر بن عبد المطلب اُٹھے اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے؛ چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا اور زبیدی کو اس کا سامان حوالہ کیا گیا، اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی، آپ ﷺ بھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے، اتفاق سے اس معاہدہ میں اشراف مکہ میں سے تین ایسے لوگ شریک تھے جن کا نام فضل تھا، اسی مناسبت سے یہ تنظیم ''حلف الفضول'' کہلائی، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۲/۹۳-۲۹۱)

سیرت میں اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کو ''میثاقِ مدینہ'' سے موسوم کیا جاسکتا ہے، آپ ﷺ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تو وہاں ایک گروہ مہاجرین وانصار کا تھا، جو آپ ﷺ پر ایمان لاچکے تھے، اور دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو اہل کتاب میں سے تھے اور کم تعداد میں سہی، مشرکین بھی موجود تھے، آپ ﷺ نے ان کے درمیان معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کی رو سے مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور خاندانی اکائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی، جان ومال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کیا گیا اور یہ بات طے پائی کہ اگر مدینہ پر باہر سے کوئی دشمن طاقت حملہ آور ہو تو سب مل کر دفاع کا فرض انجام دیں گے، نیز اس معاہدہ میں ان لوگوں کو بھی شریک تسلیم کیا گیا جو کسی فریق کے ساتھ دوستی کا معاہدہ رکھتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۳/۲۲۵)

صلح حدیبیہ کا مقصد بھی بین قومی امن وامان کا قیام ہی تھا، یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ مسلمانوں نے طاقت ور ہونے کے باوجود مشرکین مکہ کی تمام شرطوں کو قبول کرتے ہوئے یہ صلح کی، بعض حضرات کا خیال تھا کہ صلح کی یہ شرطیں یک طرفہ ہیں، اسی لئے حضرت عمرؓ وغیرہ کو صلح پسند نہیں تھی؛ لیکن جنگ کے ماحول کو ختم کرنے اور امن کو حاصل کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے بہ ہر قیمت صلح فرمائی، یہ صلح نہ صرف مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی؛ بلکہ ان دو فریقوں کی جن عرب قبائل سے مصالحت ہو، آپ ﷺ نے ان کو بھی صلح میں شریک قرار دیا، اس طرح اس ''میثاق امن'' کا دائرہ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہوگیا، یہ صلح بھی بقاء باہم اور ایک دوسرے کے بنیادی حقوق اور آزادی کے احترام کے اُصول پر مبنی تھی۔

اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عالمی امن اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی ادارہ اور تنظیم کی تشکیل کا تصور دیا ہے، مجلس اقوام ہو یا اقوامِ متحدہ، یا اس طرح کی دوسری تنظیمیں، وہ اسی تصور کی بازگشت ہیں، یہ عجیب بدبختی ہے کہ اس وقت اقوام متحدہ کو کچھ مغربی اقوام نے اغواء کیا ہے، جن کے دباؤ کی وجہ سے نا منصفانہ فیصلے ہوتے ہیں، اسرائیل کئی ملکوں کی سرحدات کو پار کر کے عراق کے نیوکلیر مرکز پر حملہ کرسکتا ہے، امریکہ غیر قانونی طور پر سوڈان اور افغانستان کے اندرونی علاقوں کو نشانہ بنا سکتا ہے، روس چیچنیا میں معصوم شہریوں کو دیوانہ وار ہلاک کر رہا ہے، بوسنیا اور کوسوو میں روس نے ننگی جارحیت کا علانیہ تعاون کیا ہے اور نہ جانے کتنے ہی چھوٹے ممالک اور کمزور اقوام ہیں کہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہیں، اس کے باوجود فلسطین اور چیچنیا کے مظلوم مسلمان تو دہشت گرد کہلاتے ہیں اور امریکہ وروس امن وانسانیت کے علمبردار اور یہ ساری ظالمانہ اور غیر انسانی حرکتیں خود اقوام متحدہ کے زیر سایہ انجام پارہی ہیں، اسلام یقیناً عالمی امن اور بین قومی اتحاد و یکجہتی کا علمبردار ہے؛ لیکن وہ صاف و شفاف عدل اور مساویانہ سلوک و برتاؤ کا داعی اور نقیب ہے اور حقیقی عالمی امن کا قیام ان اُصولوں کے بغیر ممکن نہیں۔

✿ ✿ ✿

اسلام اور تصورِ آزادی

آج کل شہروں میں چڑیا خانے (Zoo Park) بنے ہوتے ہیں، ان چڑیا خانوں کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت پر بہت بڑی رقم خرچ ہوتی ہے، پورا چڑیا خانہ رنگ برنگ کے خوب صورت اور مہکتے ہوئے پھولوں، لمبے ہرے بھرے درختوں اور پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں کی وجہ سے خوش منظر بنا رہتا ہے، پھر انواع و اقسام کے حیوانات اور پرندوں کے لئے الگ الگ احاطے بنے ہوتے ہیں، جانوروں کی دیکھ بھال اور آسائش کا جو انتظام ان چڑیا خانوں میں ہوتا ہے، یقیناً وہ ان کو جنگلات میں بھی میسر نہیں، اپنی غذا کے لئے نہ ان کو شکار تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ چارہ ڈھونڈھنے کی حاجت؛ بلکہ خود چڑیا خانہ کا عملہ ان کی غذائی ضروریات وقت پر اور فراوانی کے ساتھ فراہم کرتا ہے، حفظانِ صحت کی جو رعایت یہاں کی جاتی ہے، جنگلات میں ان کا میسر آنا ممکن نہیں، باضابطہ ڈاکٹر اور معالج متعین ہیں؛ بلکہ ان کے علاج کی اتنی فکر کی جاتی ہے کہ انسانوں کے لئے بھی اتنی فکر نہیں کی جاتی، جانوروں کی حفاظت و صیانت کا بھی اعلیٰ درجہ کا نظام موجود ہے، نہ کسی جانور کو اس کا خطرہ ہے کہ اس سے زیادہ طاقت ور جانور اسے اپنی خوراک بنا لے گا، نہ شکاریوں سے کوئی خوف ہے، غرض حیوانات کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو چڑیا خانے ان کے لئے ایسی راحت گاہ ہیں کہ انسانوں کو بھی ایسی سہولت و آسائش میسر نہیں۔

لیکن اگر کسی شخص کو جانور کی زبان آتی، وہ ان سے ہم کلام ہوسکتا اور ان جانوروں سے ان کی دلی آرزو اور سب سے پیاری خواہش کے بارے میں سوال کرتا تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوتا کہ خدارا مجھے اس خوب صورت آراستہ و پیراستہ "سونے کے قفس" سے نکال کر بے ترتیب اور انسان کے ذوقِ خوش آرائی سے محروم جنگلات میں پہنچا دو، جہاں گو وقت پر کھانا نہیں آئے

گا، اپنی خوراک کے لئے دوڑ بھاگ کرنی ہوگی اور علاج کے لئے کوئی ڈاکٹر بھی میسر نہیں ہوگا، ایسے خوش رنگ، سجے سجائے، سنوارے اور دلہن بنائے گل بوٹے نظر نہیں آئیں گے، مگر پھر بھی ہم ''آزاد'' ہوں گے، حصار بندیوں نے مجھے قید نہیں کیا ہوگا، میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آنا جانا کرسکوں گا۔

جب حیوانات جو عقل و شعور کے اعتبار سے بمقابلہ انسان بہت ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہیں، کے اندر آزادی کی ایسی طلب بلکہ تڑپ ہے، تو انسان میں اس کا داعیہ کتنا شدید ہوگا، وہ محتاجِ اظہار نہیں، اس کی ایک چھوٹی سی مثال جیل اور قید خانے ہیں، یہاں قیدیوں کی اکثر بنیادی ضروریات پوری کی جاتی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ہر قیدی رہائی کے لئے بے چین اور بے قرار رہتا ہے، اس لئے آزاد رہنے کی خواہش انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے، جب کوئی قوم دوسری قوم پر غلبہ پالیتی ہے تو اپنی غلامی کا احساس اس کو تڑپاتا رہتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے محروم کردیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں آزادی کی جدو جہد اور غلامی سے نجات کی کوشش میں بے شمار اور بے پناہ قربانیاں دی گئی ہیں، جان و مال کی، اولاد کی، گھر و بار کی اور بعض مواقع پر عزت و وقار کی بھی، خود ہمارا ملک ہندوستان اس کی روشن مثال ہے، قفس چاہے سونے کا ہو وہ قفس ہی ہے، وہ انسان کی طبع آزاد پسند کی سیری کا سامان نہیں۔

اسی لئے اسلام نے آزادی کو انسان کا فطری اور پیدائشی حق تسلیم کیا ہے، وہ تمام انسانیت کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے، اس لئے کسی انسانی طبقہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنالے، رسول اللہ ﷺ نے اس انقلابی تصور کا اعلان اس طرح فرمایا:

> اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو، تم سب آدم سے پیدا کئے گئے اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے شریف اور باعزت وہ ہے جو سب

سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، کسی عرب کو کسی عجمی پر تقویٰ
کے علاوہ کسی اور سبب سے کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔

یہ توحید اور انسانی وحدت کا عقیدہ وہ انقلابی عقیدہ ہے جو نسلی، خاندانی جغرافیائی اور لسانی بنیادوں پر ایک طبقہ کے دوسرے انسانی طبقہ کو غلام بنانے، ان کو کمتر سمجھنے اور اپنے تئیں برتری کے احساس کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے۔

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے، اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یورپ افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو جمہوری طرز فکر کا بانی تصور کرتا ہے اور افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) کو اس موضوع پر پہلی کتاب خیال کیا جاتا ہے؛ لیکن افلاطون کے جمہوری تصور کا حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک صرف فلاسفہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے اور وہ سماج کے بقیہ افراد کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک ان سب کی تخلیق کا خمیر بھی الگ الگ ہے، فلاسفہ کو خدا نے سونے سے بنایا ہے، ان کے معاونین کو چاندی سے، پھر کاشتکار اور دستکار وغیرہ کو لوہے اور پیتل سے، یہ ہے جمہوریت اور انصاف کا وہ تصور جو افلاطون نے پیش کیا ہے۔

افلاطون کے بعد مشہور فلسفی اور افلاطون کے شاگرد ''ارسطو'' کو نظام جمہوری کا مفکر تصور کیا جاتا ہے، ارسطو کے یہاں سماج کی طبقاتی تقسیم اتنی نمایاں ہے کہ ایک دانشور سے ایسے غیر منصفانہ خیالات کا صدور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، ارسطو کا خیال ہے کہ ''غریب امیروں

کے پیدائشی غلام ہیں، وہ بھی، ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی" ارسطو کو مساوات اور حکومت میں غریبوں کی شرکت نہایت ناگوار خاطر ہے، جب فلاسفہ روزگار اور دانشوران عصر کے فکر ونظر کا یہ حال ہو تو عام لوگوں کی سوچ کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اس کو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے، انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انھیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انھوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں "ابن الاکرمین" (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا اچھا بیٹھو! پھر عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھے کہ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھنے لگے کہ انکا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ درّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمرو کے سر پر بھی گھماؤ، کیوں کہ انھیں کے سہارے پر اس نے تمہیں مارا تھا،

مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم انھیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انھیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمرلابن جوزی: ۹۷-۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روس تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا؛ لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوقِ انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انھوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں، ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے، یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی لڑائی مسلمانوں نے شروع کی، ہندوستان کی جنگِ آزادی جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال پر مشتمل ہے، اس کا پہلا نصف حصہ یعنی ۴۵ سال زیادہ تر مسلمانوں ہی کی قربانی سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں ملک کا کوئی چپہ نہیں جس کو مسلمانوں نے اپنے خون اور لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہو، جنگ آزادی کا یہ حصہ جس میں سب سے زیادہ خوں ریزی اور تباہی و بربادی ہوئی، مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی قربانیوں اور فداکاریوں کی تاریخ ہے، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، ان کے عالی ہمت خلفاء، علماء صادق پور، مولانا فضل حق خیرآبادی اور کتنے ہی علماء ومشائخ ہیں جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں جان و مال کی زبردست قربانیاں دی ہیں۔

اگلے پینتالیس سال میں جو مسلمان جنگِ آزادی میں شریک ہوئے ان میں غالب

اکثریت علماء اور اہل دین کی تھی، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ تو قائم ہی اسی مقصد کے لئے ہوئیں، افسوس کہ لوگ ان تحریکوں کو فراموش کر گئے، انھوں نے صرف کانگریس کو یاد رکھا، جو محض انگریز کی خوشامد اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان روابط کو پروان چڑھانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، ریشمی رومال تحریک اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت میں بھی زیادہ حصہ علماء اور خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی'' کا تھا، علماء اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی تحریک آزادی میں یہ پرجوش شرکت اور قربانی کچھ اس لئے نہیں تھی کہ ان کو آئندہ حکومت میں حصہ داری کی طمع تھی اور وہ وزارتوں میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انھوں نے یہ سب کچھ تحسین وتعریف کی تمنا اور عہدہ اور مال وزر کی حرص وطمع سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا؛ کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی قوم کو غلام ومحکوم بنا لینا ایک ایسا ظلم ہے کہ اس کے خلاف آواز اُٹھانا ''جہاد'' اور اس راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنا ''شہادت'' ہے۔

عدل کے نفاذ میں مساویانہ سلوک

گذشتہ کئی ہفتوں سے مشہور سیاسی قائد جناب بال ٹھاکرے کی گفتاری اور ان کے مقدمہ نے ایسی ہنگامہ خیز اور حشر انگیز صورت اختیار کرلی کہ گویا بکریوں کے ریوڑ میں کوئی شیر گھس آیا ہو، کمزور دل کمزور تن اور کمزور حوصلہ بکریاں چاہتی ہوں کہ شیر کو اس کی چیرہ دستیوں پر سزا دی جائے اور کیفر کردار تک پہنچایا جائے ؛ لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس طاقت ور اور ظالم صفت کا ہاتھ تھام سکے، یہ ہے ہمارے ملک کی جمہوریت، قانون کی بالادستی، اور انصاف کی حکمرانی!! اگر کوئی مسلمان، عیسائی یا دلت جناب بال ٹھاکرے کے مقابلہ دس فیصد کم ہی مجرم ہوتا تو شاید اس کا پولیس انکاؤنٹر ہو چکا ہوتا، ورنہ ٹاڈا کے تحت ضرور وہ موت سے زیادہ تکلیف دہ اذیتوں کا مستحق گردانا جاتا؛ لیکن یہاں ایک شخص علانیہ اپنی مجرمانہ روش پر مصر ہے اور ملک کے پورے نظام قانون کو چیلنج کر رہا ہے؛ لیکن اس کے باوجود کیا مجال کہ کوئی اس کی زبان روک سکے اور اس کے ہاتھ باندھ سکے۔

تمام افراد اور قوموں کے ساتھ عدل کا منصفانہ روّیہ اور انصاف کا برتاؤ اس ملک کی حفاظت کی ضمانت ہے، غنڈہ گردوں اور لاقانونیت برتنے والوں کی ناز برداری اور ان کے ساتھ نرم خوئی و دل داری سماج کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور مضرت رساں عمل ہے؛ اسی لئے اسلام نے عدل اور عدل کے معاملہ میں مساویانہ سلوک کی قدم قدم پر تلقین کی ہے، رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی بابت حکم دیا گیا کہ جب آپ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پورا انصاف ملحوظ رکھیں: ''وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ''۔ (المائدۃ:۴۲)

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا، فتح مکہ کے موقع سے عرب کے

معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے کچھ چوری کر لی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جو اسلام میں چوری کی سزا ہے، آپ کے محبوب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے اس خاتون کے حق میں سفارش کی، تو آپ اتنے برہم ہوئے کہ کم آپ ﷺ اس طرح غضبناک ہوا کرتے تھے اور خاص اس موضوع پر صحابہ ؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے اس خطاب میں فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ محمد کی بیٹی فاطمہ ؓ نے چوری کی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے؛ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے اس کے ہاتھ کاٹے گئے۔ (بخاری حدیث نمبر: ۳۹۶۵)

یہی مزاج آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے صحابہ ؓ نے پایا، حضرت ابو بکر ؓ نے ایک بار جمعہ کے دن اعلان کیا کہ کل اونٹوں کی زکوٰۃ لے کر یہاں حاضر ہوں، کہ ہم اسے تقسیم کریں، اور کوئی شخص میرے پاس بلا اجازت نہیں آئے، دوسرے دن ایک صاحب اونٹنی کی نکیل لے کر آ گئے، کہ شاید تقسیم میں اونٹ مل جائے، تو لے جانے میں آسانی ہو، جس حصہ میں اونٹ رکھے گئے تھے، حضرت ابو بکر ؓ و عمر ؓ وہاں داخل ہوئے، ساتھ ہی یہ صاحب بھی آ گئے، حضرت ابو بکر ؓ کو اعلان کے باوجود ان صاحب کی بے وقت آمد پر غصہ آ گیا اور آپ ؓ نے اونٹ کی نکیل لے کر ایک آدھ بار انھیں رسید کیا، جب حضرت ابو بکر ؓ اونٹ کی تقسیم سے فارغ ہوئے، تو اس شخص کو بلایا اور ہاتھ میں نکیل دی اور فرمایا کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو، حضرت عمر ؓ نے عرض کیا کہ نہ وہ بدلہ لے گا اور نہ آپ اس طریقہ کو رواج دیں، حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا کہ پھر قیامت کے دن مجھے کون اللہ سے بچائے گا، حضرت عمر ؓ نے کہا کہ آپ انھیں راضی کر لیں، حضرت ابو بکر ؓ نے حکم دیا کہ اسے ایک اونٹنی مع کجاوہ، ایک چادر اور پانچ دینار دیئے جائیں اور اس طرح اسے راضی کیا۔ (کنز العمال: ۳/۱۲۷)

حضرت عمر ؓ کی عدالت میں ایک مسلمان اور یہودی کا مقدمہ آیا تو آپ ؓ نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمایا (الترغیب والترہیب: ۳/۲۲۵) حضرت عثمان ؓ کے بارے میں مروی ہے کہ اپنے غلام کی گوشمالی کی، تو پھر اس سے اصرار کر کے اپنے کان پکڑوائے اور جب اس کو لحاظ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سختی سے کان ملو، دنیا میں بدلہ ادا کر دینا بہ مقابلہ آخرت

میں بدلہ ادا کرنے کے بہتر ہے؟ (مختصر حیاۃ الصحابہ للکاندھلوی: ۲۴۳) جعد بن ہبیرہ ﷺ نے حضرت علی ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کے پاس دو شخص آتے ہیں، جن میں سے ایک آپ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت رکھتا ہے اور یہ دوسرا آپ سے اس قدر بغض رکھتا ہے کہ اگر بس چلے تو آپ ﷺ کو ذبح کر دے؛ لیکن آپ اس محبت رکھنے والے کے مقابلہ بغض رکھنے والے کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں، حضرت علی ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ فیصلہ میرے اختیار کی چیز ہوتی تو میں وہی کرتا جو تم خیال کرتے ہو؛ لیکن یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے: ''لو كان لي فعلت ، انما ذا شيئ لله''۔ (حوالہ سابق: ۲۴۴)

عدل میں مساویانہ سلوک کا حال یہ تھا کہ خود حضرت عمر ﷺ اپنے عہد خلافت میں حضرت زید بن ثابت ﷺ کے یہاں مقدمہ کے فریق بن کر آئے، حضرت زید ﷺ نے ازراہ احترام حضرت عمر ﷺ کو اپنے قریب بیٹھانا چاہا، حضرت عمر ﷺ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور فرمایا کہ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا، (کنزل العمال: ۳/۱۷۲) حضرت عمر ﷺ کا اسی طرح کا واقعہ حضرت ابی ابن کعب ﷺ کے اجلاس عدالت میں بھی پیش آنا منقول ہے۔

حضرت عمر ﷺ ہی کے عہد خلافت میں ایک غسانی رئیس مسلمان ہوئے اور مدینہ آئے، ان کا نام ''ایہم'' تھا، اسلام تو قبول کر لیا تھا؛ لیکن ابھی اسلامی مزاج و مذاق سے نا آشنا تھے، طواف کے درمیان لباس فاخرہ پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا، طبع نازک کو گوارا نہ ہوا اور تھپڑ رسید کر دیا، مقدمہ دربار خلافت میں آیا، حضرت عمر ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ بدو بدلہ لے گا، یا اس سے معاف کرانا ہوگا، ایہم کا مذاق جاہلی اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا، ایک دو دنوں کی مہلت لی، اور اسی درمیان راہ فرار اختیار کی اور مرتد ہو گیا، حضرت عمر ﷺ کو ایک بڑے رئیس کے یوں چلے جانے سے کوئی ملال نہیں ہوا؛ بلکہ استقامت کی جو توفیق میسر آئی، اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

عدل و انصاف کے معاملہ میں اسلامی نظام نے عدلیہ کو پوری طرح آزاد رکھا ہے اور کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کے لئے بھی اس میں مداخلت کی گنجائش نہیں رکھی ہے،

حضرت علی ﷛ نے خود اپنے عہد خلافت میں قاضی شریح کی عدالت میں ایک یہودی کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور گواہان کی حیثیت سے صاحبزادہ گرامی مرتبت حضرت حسن ﷛ اور اپنے غلام قنبرہ کو پیش فرمایا، قاضی صاحب نے دونوں گواہیاں رد کردیں اور کہا کہ نہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر ہے اور نہ غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قابل قبول اور بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں اور امیر المومنین کے خلاف ہوا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی ظاہری شکست سے فتح کا سامان پیدا کیا، یہودی غلطی پر تھا، اس نے مسلمانوں کے اس عدل کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اسلام سے مشرف ہوا۔

انصاف کو یقینی بنانے اور مساویانہ سلوک برقرار رکھنے کے لئے فقہاء نے قاضی کے لئے اس بات کو بھی منع کیا کہ وہ مقدمہ کے فریقین یا جن لوگوں کا مقدمہ آنا متوقع ہو ان سے ہدیہ قبول کرے، اسی سلسلہ میں دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت عمر ﷛ کی خدمت میں اکثر اونٹ کی ران پیش کیا کرتے تھے، اتفاق سے اسی شخص کا مقدمہ آپ ﷛ کے سامنے آیا، اس شخص نے حضرت عمر ﷛ سے عرض کیا کہ جیسے اونٹ کی ران کی بوٹیاں ہڈیوں سے الگ کی جاتی ہیں، اسی طرح آپ بھی اس معاملے کا صاف صاف فیصلہ کردیجئے۔ حضرت عمر ﷛ اس شخص کے اشارہ کو سمجھ گئے اور قاضیوں کو خاص طور پر حکم جاری فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے گریز کریں۔ (کنزل العمال: ۱۷۷/۳)

عدل پروری کا یہ معاملہ حضرات صحابہ ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ رعایا میں عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کو سامنے رکھا، خود ہندوستان کے مسلم سلاطین کے ایسے بیسیوں واقعات موجود ہیں، سلطان ناصر الدین محمود تغلق اور غیاث الدین بلبن، خاندان غلامان، سوری اور مغل بادشاہوں میں کتنے ہی حکمراں گذرے ہیں، کہ رعایا ان کو بے لاگ عدل کے لئے ضرب المثل بنائے ہوئے تھی، جہانگیر نے اپنے ایک نہایت مقرب وزیر مقرب خاں کو ایک معمولی بڑھیا کی فریاد پر مقرب خاں اور اس کے متعلقین کو سخت سزا دی۔ (سچی کہانیاں: ۱۴۲/۲)

آج کل فوج اور پولیس کے معاملہ میں اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، بابر کی

فوج ۱۵۱۹ء میں بھیرہ میں داخل ہوئی، بابر کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ بھیرہ میں کچھ لوگوں نے رعایا کے ساتھ زیادتی کی ہے، فوراً معاملہ کی تحقیق ہوئی اور بعض سپاہیوں کو سزائے موت دی گئی اور بعضوں کی ناک کٹوا کر انہیں عوام میں پھرایا گیا تاکہ پھر آئندہ ان کو ایسی زیادتی کی جرأت نہ ہو۔ (بچی کہانیاں: ۲/۱۷۱، سید صباح الدین عبدالرحمان)

جو جمہوریت انسان کو انصاف بھی نہ دے سکے اور جو ظالم کا ہاتھ تھامنے میں بھی چہرے اور چہرے میں فرق کرتی ہو، اس سے کیسے کوئی مظلوم اپنے حقوق کے تحفظ کی توقع رکھ سکتا ہے اور کیوں کر اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہاں ظالموں کے ہاتھ تھامے جائیں گے۔

(۱۴/اگست ۲۰۰۰)

ردِّ عمل اور جوابی اقدام — اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ایک خاص عنصر جذبات کا رکھا ہے، یہی جذبات محبت ونفرت اور خوشی وغم کے احساس کا سرچشمہ ہیں، عام حالات میں انسان کے جذبات معتدل ہوتے ہیں؛ لیکن جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو اسی نسبت سے انسان کی جذباتی کیفیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، فرحت انگیز واقعات سے زیادہ انسان الم انگیز واقعات پر جذباتی ہوجاتا ہے، اس طرح کے واقعات سے انسان کو گہرا دکھ بھی پہنچتا ہے اور اس کے جسم میں انتقام کی آگ بھی سلگنے لگتی ہے، بعض اوقات یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ انسان خود اپنے قابو میں نہیں رہ پاتا، ان حالات میں اگر قانون اور اُصول کے دائرہ میں ردِ عمل کی گنجائش فراہم نہ کی جائے اور حصولِ انصاف کو ممکن نہ بنایا جائے تو مزید لاقانونیت پیدا ہونے کے خطرات ہوتے ہیں۔

اسی لئے اسلام نے ظلم وتعدی کا جواب دینے اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے ردِ عمل ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ (البقرۃ:۱۹۴)

تم پر جو شخص زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر اس کی زیادتی کے بقدر جواب دو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں چند باتوں کی طرف اشارہ ہے، اول یہ کہ کسی پر ظلم وزیادتی میں پہل کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اور دوست ہو یا دشمن، اس سلسلہ

میں قرآن مجید کی ہدایت یہاں تک ہے کہ تم ان ہی لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے برسر پیکار ہوں، جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، ان سے قتال جائز نہیں، یہ ''اعتداء'' یعنی حد سے گزرنا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ (البقرۃ:۹۰)

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کے غیر قانونی ردِ عمل کو روکنے کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے انتقام کی گنجائش ہے، تیسرے کسی زیادتی پر یا تو عفو درگذر سے کام لینا چاہئے یا اسی کے مماثل بدلہ لینے کی گنجائش ہے، اس سے زیادہ گنجائش نہیں، اسی زیادتی کو قرآن مجید میں اعتداء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی قبیلے کا غلام مارا جاتا، تو خواہ اس کا قاتل غلام ہی کیوں نہ ہو، وہ کہتے کہ ہم اس کے بدلہ میں تمہارے آزاد شخص کو قتل کریں گے، اگر کوئی عورت ماری جاتی تو خواہ کوئی عورت ہی اس قتل کی مرتکب ہوئی ہوتی؛ لیکن لوگ اس کے بدلہ میں، دوسرے خاندان سے کسی مرد کو قتل کرنا چاہتے، اگر کسی خاندان سے ایک شخص کا قتل ہوا، تو مقتول کے لوگ چاہتے کہ اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان سے ایک جماعت کا قتل کیا جائے، کسی کو ایک زخم لگے تو وہ اس کے بدلے سے کئی چند زخم لگانا چاہتے۔ (مفاتیح الغیب:۲۵/۳)

اس ناروا انتقام اور بدلہ کو قرآن مجید نے منع کیا اور فرمایا گیا کہ قصاص کی اجازت ضرور ہے؛ لیکن جو قاتل ہے، اسی سے، خواہ وہ غلام ہو یا آزاد اور مرد ہو یا عورت، اگر کوئی چاہے تو بجائے جانی بدلہ کے مالی جرمانہ یعنی ''خوں بہا'' بھی وصول کرسکتا ہے، اس حکم کو بیان کرتے ہوئے اخیر میں فرمایا گیا کہ جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے: ''فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' (البقرۃ:۱۷۸) —— اس سے معلوم ہوا کہ بدلہ لینے میں قانون و آئین کے حدود کو پار کر جانا بھی جائز نہیں۔

انتقام اور ردِ عمل کے سلسلہ میں تین باتیں نہایت ہی اہم ہیں، اول یہ کہ اصل میں جس نے ظلم و زیادتی کی ہو، اس کے بارے میں مناسب تحقیق کی جائے، بلا تحقیق محض شبہ کی بنا پر کسی کو نشانہ بنانا اور نقصان پہنچانا درست نہیں، مجرم کے بچ جانے سے زیادہ بُری بات یہ ہے کہ کوئی

بے قصور سزا پا جائے، یہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے اور نہ صرف اسلام بلکہ دنیا بھر کے مہذب قانونِ جرم وسزا میں اس اُصول کو تسلیم کیا گیا ہے، محض شک وشبہ کی بنیاد پر اور بلا ثبوت کسی شخص کو مجرم تصور کر لینا اور اس کے ساتھ مجرموں کا سا معاملہ کرنا قطعاً درست نہیں اور سراسر تقاضا انصاف کے خلاف ہے، افسوس کہ ان دنوں نہ صرف اشخاص و افراد؛ بلکہ حکومتوں میں بھی یہ رجحان عام ہوتا جا رہا ہے، چند سال پہلے تک ہندوستان میں ٹاڈا کا قانون نافذ تھا، یہ بہت ہی تکلیف دہ قانون تھا، جس میں عرصہ تک ملزم بلا ثبوت پولیس تحویل میں رکھا جاتا، اسے سخت اذیت پہنچائی جاتی اور طویل عرصہ تک اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوتی، اس قانون کے تحت ہزاروں افراد گرفتار کیے گئے؛ لیکن ایک فیصد مقدمہ میں بھی ان پر لگائے گئے الزامات ثابت نہیں ہو سکے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب مجرم معلوم ہو اور اقرار یا ثبوت وشہادت سے اس کی تعیین ہو جائے، تو صرف وہی شخص مستحق سزا سمجھا جائے گا، اس کے بدلے اس کے کنبہ، علاقہ، یا قوم کے دوسرے لوگوں کو مجرم تصور کرنا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کرنا درست نہیں ہوگا، مثلاً اگر کوئی مسلمان کسی قوم کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا، تو یہ درست نہیں ہے کہ اس قوم کا جو شخص بھی ہمارے ہاتھ آ جائے، ہم اس کے ساتھ قاتل کا سا سلوک کریں، سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت "فیروز" نامی ایرانی شخص کے ہاتھوں ہوئی، حضرت عمر ؓ کے صاحبزادگان پر اس واقعہ کا ردِّعمل ہوا اور حضرت عمر ؓ کے "عبید" نامی صاحبزادہ نے مدینہ میں مقیم بعض ذمیوں کو جوشِ انتقام میں قتل کر دیا، حضرت عثمان ؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا معاملہ یہی زیرِ بحث آیا، اس سلسلہ میں حضرت علی ؓ اور اکثر صحابہ ؓ کی رائے تھی کہ ان کو قصاص میں قتل کیا جانا چاہئے؛ لیکن مروان نے ایک قانونی نکتہ اُٹھایا، کہ یہ واقعہ آپ کے منصب امارت پر فائز ہونے سے پہلے کا ہے؛ چنانچہ اس وقت کے حالات کے پس منظر میں اس واقعہ کے بارے میں پہلو تہی سے کام لیا گیا، جب حضرت علی ؓ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو دوبارہ آپ ؓ نے اس مقدمہ پر کارروائی کرنی

چاہی؛ لیکن وہ بھاگ کر امیر معاویہ ؓ سے جا ملے اور جنگ صفین میں مقتول ہوئے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک وحشیانہ طریقہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ ہمارا امن وامان اور بقاء باہم کا معاہدہ ہو اگر اس قوم کے کسی فرد نے ہمارے کسی فرد پر زیادتی کی ہو، تو اصل مجرم کو ڈھونڈ نکالے بغیر ہم اس قوم کے بے قصور اور بے گناہ لوگوں پر ہلہ بول دیں اور ان کے جان ومال کے درپے ہو جائیں، یہ ظلم وزیادتی ہوگی اور یہ انتقام کا غیر اسلامی اور غیر قانونی طریقہ ہوگا۔

تیسری بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بدلہ میں زیادہ سے زیادہ مماثلت اور برابری کی گنجائش ہے، نہ کہ زیادتی کی، اپنے حق پر زیادتی بجائے خود ایک ظلم ہے اور اسلام میں اس کی اجازت نہیں، قرآن مجید نے جو قانون قصاص بتایا ہے وہ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ . (المائدۃ:۴۵)
>
> ہم نے ان لوگوں پر تورات میں یہ بات فرض قرار دی تھی کہ جان کے بدلے جان لی جائے، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، زخموں میں بھی برابری ہونی چاہیے۔

— پس بدلہ اور انتقام میں بھی برابری ضروری ہے، اس میں بھی مبالغہ اور انصاف کی حدوں سے تجاوز درست نہیں، یہ بجائے خود زیادتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اگر آپ کے ساتھ آپ ہی کے ملک کے کسی شہری نے زیادتی کی ہے، تو یہ بھی ضروری ہے کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں؛ بلکہ مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا خود بھی ایک خلاف قانون امر ہے، اگر ہر شخص نے اپنے طور پر معاملات کا فیصلہ کرنے

اور سزائیں جاری کرنے لگے تو پھر تو معاشرہ کا امن وامان ہی رخصت ہو جائے گا، قرآن مجید نے مقتول کے اولیاء کو یہ حق تو دیا ہے کہ وہ قاتل کے خلاف مقدمہ کا فریق بنیں؛ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطور خود قصاص کی کاروائی کریں، قصاص کی سزا بہر حال عدالت کے واسطہ سے ہی نافذ ہوگی۔

ہاں، اس سے مدافعت کی صورت مستثنیٰ ہے، جب کسی کی جان و مال یا عزت وآبرو پر حملہ ہو تو اس کو اپنے دفاع کا بھرپور حق حاصل ہے؛ بلکہ فقہاء حنفیہؒ کے نزدیک اپنے آپ سے دفاع واجب ہے: ''مَن شهر على المسلمين سيفًا وجب قتلهٗ '' (ہندی: ۶/۷)۔۔۔ اپنی مدافعت میں اگر حملہ آور کی جان بھی چلی جائے تو مدافعت کرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں: ''وَلَو اشهر على رجل سلاحاً ...... فلا شيئ عليه '' (ہندیہ: ۶/۷)۔۔۔ البتہ مدافعت میں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قتل سے کم تر درجہ کا اقدام کافی ہو جائے، تو اقدام قتل سے گریز کیا جائے، (دیکھئے بدائع الصنائع: ۷/۹۳)۔۔۔ حفاظت خود اختیاری نہ صرف اسلام؛ بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور نظامہائے قانون میں ہر شخص کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

غرض بدلہ و قصاص اور انتقام کے باب میں بھی اسلام کی تعلیمات نہایت واضح، منصفانہ، معتدل اور متوازن ہیں، مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، وہ دوستوں کے درمیان ہوں، یا دشمنوں کے درمیان، بہر صورت یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات اور قرآنی ہدایات کو ملحوظ رکھیں، کوئی قوم خواہ ہماری نگاہ میں وہ برائی اور فساد پر کار بند ہو، ہمیں بہر حال یہ بات سزاوار نہیں کہ عدل اور اعتدال کا راستہ چھوڑ دیں: ''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ''۔ (المائدۃ: ۸)

(۸/ مارچ ۲۰۰۲ء)

مفتوحین کے ساتھ سلوک

موجودہ عہد فکری اور تہذیبی ارتقاء کا عہد کہلاتا ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ تہذیب وثقافت اور انسانی اقدار کا احترام جیسا کچھ آج کے عہد میں ہے، جو مغرب کے سیاسی غلبہ اور عروج کا عہد ہے پہلے کبھی نہیں تھا؛ لیکن یہ دعویٰ کس قدر مبنی بر حقیقت ہے؟ آئے دن کے واقعات اس پر گواہ ہیں، اس کی ایک مثال اس وقت ''چیچنیا'' ہے، یہ دوہرا رویہ ہی انصاف کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جارجیا، آرمینیا اور لتھوانیا جو عیسائی ریاستیں ہیں، انھوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو پورے مغرب نے ان کے اعلان آزادی کی حمایت کی اور روس کو اس کو منظور کرنے پر مجبور ہونا پڑا؛ لیکن اگر چیچنیا، انگوشتیا، داغستان اور قفقاز کی مسلم ریاستیں آزادی چاہتی ہیں تو نہ روس اسے قبول کرتا ہے اور نہ ہی مغرب اس کی تائید میں ہے اور ان ریاستوں کی جنگ آزادی کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نام دیا گیا ہے۔

افسوس کہ ان مجاہدین آزادی کے ساتھ کوئی زبانی کلمۂ ہمدردی کہنے والا بھی موجود نہیں، حد یہ ہے کہ مسلم ملکوں نے بھی اس موقع پر ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ گویا اگر کچھ احتجاج کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ ہو جائے گا، سوائے ایک افغانستان کے چیچنیا کے قتل پر کوئی دو آنسو بھی گرانے والا موجود نہیں، یہ عالم اسلام کی ایسی بے حسی ہے کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے اور شاید جانور بھی اپنے ہم جنسوں کی ہلاکت پر ایسی خاموشی گوارا نہ کریں، بوسنیا میں کیسے کیسے مقتل سجائے گئے اور مغرب خاموش تماشائی بنا رہا، کوسوو میں البانوی مسلمانوں پر کیا کچھ ستم نہیں ہوئے؛ لیکن انسانی ضمیر کو کوئی حرکت نہیں ہوئی، چیچنیا کا سانحہ تو ان سب سے زیادہ سنگین ہے، یہ عجیب بات ہے کہ انڈونیشیا کے ایک علاقہ میں کچھ عیسائی آزادی کا مطالبہ کریں تو وہ مجاہدین آزادی ہیں اور انڈونیشیا کو پروانۂ آزادی پر دستخط کرنے کے لئے

مجبور کیا جائے اور چیچنیا کے مسلمان آزادی کے طلب گار ہوں تو وہ دہشت گرد اور غارت گر قرار پائیں۔

چیچنیا میں کیا کچھ مظالم ڈھائے گئے اور کس کس طرح بے گناہوں کے خون سے پیاس بجھائی گئی؟ اس بارے میں بہت کم تفصیلات، ذرائع ابلاغ تک پہنچ پاتی ہیں؛ لیکن روسی فوجیوں کی خوں آشامی کی ایک روایت رہی ہے اور اس کی روشنی میں ان کے جور و ستم کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں، ابھی اخبارات کے ذریعہ ان مظالم کا ایک منظر جو سامنے آیا ہے تنہا وہی دل دہلا دینے کے لئے کافی ہے کہ چیچنیا کے سپاہیوں اور شہریوں کی نعشوں کے پیر رسیوں کے ذریعہ ٹرک سے باندھ دیئے گئے اور کھینچے گئے اور بعض رپورٹوں کے مطابق زندہ سپاہیوں کو بھی گاڑیوں سے باندھ کر کھینچا گیا، یہ ایسی شرمناک اور نفرت انگیز حرکتیں ہیں کہ ان پر جتنی بھی ملامت کی جائے کم ہے؛ حالاں کہ بین الاقوامی قانون کے تحت جنگی قیدیوں اور جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی نعشوں کے ساتھ احترام برقرار رکھنا ضروری ہے، اگر کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہوتا تو پورا مغرب و مشرق سراپا احتجاج بن گیا ہوتا، اور اِس کو اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا؛ لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر انسانی رویہ اور اس کے مرتکبین کو دہشت گردی اور دہشت گرد کا عنوان نہیں دیا جاتا۔

مغرب میں انسانی خون سے آتشِ انتقام بجھانے کا ذوق زمانہ قدیم سے ہے، یورپ میں اسلام سے پہلے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں "سیانی" کے نام سے ایک غیر انسانی کھیل منعقد ہوتا تھا، قیدیوں کا جنگلی جانوروں یا خود دوسرے قیدیوں سے مقابلہ کروایا جاتا تھا، اور ان کی بے دردانہ ہلاکت کے تماشے نہایت ذوق و شوق سے دیکھے جاتے تھے، نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ ان کے کھانے پینے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں برداشت کیا جائے، بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا، تو ستر ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے اور یہودیوں کو ان کے مقدس مذبح میں ایک ساتھ نذر آتش کر دیا گیا، خود عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق شہر میں ہر جگہ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اور اعضاء نظر آتے تھے، یہ سلوک تو

دوسری قوموں کے ساتھ تھا، خود عیسائیوں کے ایک فرقہ کا رویہ دوسرے فرقوں کے ساتھ کچھ کم جارحانہ نہیں تھا، کلیسائی نظام کے غلبہ و عروج کے زمانہ میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر جو عیسائی قتل کیے گئے، ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ مذہبی اختلاف کی بناء پر جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ان پر یہ سزا زندہ جلا کر جاری کی جاتی، ایسی قوم سے نمائشی دعوؤں کی امید تو رکھی جا سکتی ہے حقیقی رحم کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے؟

اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اسلام سے پہلے عربوں میں مثلہ کا طریقہ تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتی تو ان کے اعضاء کی قطع و برید کرتی؛ بلکہ بعض تاریخی اور ادبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب تک پیا کرتے، خود رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش کا غزوۂ اُحد میں مثلہ کیا گیا، اسلام نے اس غیر انسانی طریقہ سے منع کیا اور آپ ﷺ نے صراحتاً عین جنگ کے دوران بھی مثلہ کرنے کی ممانعت فرمائی، مفتوحین کی نعشوں کے ساتھ کبھی بھی بے حرمتی کے رویہ کو آپ نے روا نہیں رکھا، غزوۂ بدر میں اہل مکہ میں سے بڑے بڑے سردار جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، وہ قتل ہوئے؛ لیکن آپ ﷺ نے ان کی نعشوں کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا؛ بلکہ بدر ہی کے میدان میں ایک گڑھے میں مسلمانوں نے ان کو دفن کر دیا، غزوۂ خندق کے موقعہ سے مشرکین کی فوج میں سے ایک شخص خندق پار کر کے حملہ آور ہوا اور قتل کیا گیا، اہل مکہ اس لاش کا معاوضہ ادا کر کے لاش حاصل کرنا چاہتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کا معاوضہ لینا گوارا نہیں فرمایا اور یوں ہی لاش حوالہ فرما دی۔

غزوۂ بنو قریظہ میں یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے حکم کے فیصلہ کی بناء پر خود یہودی قانون کے مطابق قریب چار سو فوجی قتل کیے گئے، کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور معاہدہ شکنی کی تھی اور اپنی دانست میں ایسا قدم اُٹھایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی مملکت صفحۂ ہستی سے

ناپید ہو جائے؛ لیکن ان کے ساتھ بھی کوئی غیر انسانی رویہ نہیں برتا گیا اور ان کی نعشیں بھی دفن کی گئیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی سزائے قتل کا مستحق ثابت ہو جائے اور اسے قتل ہی کرنا ہو تو بھلے طریقہ پر قتل کرو یعنی ایذائیں پہنچا پہنچا کر اور بے دردانہ طریقہ پر اسے ہلاک نہ کیا جائے۔

ان اسلامی تعلیمات کا مسلمانوں پر ایسا اثر تھا کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ غلبہ پانے کے بعد ہمیشہ فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا، وہ جنگ کے میدان میں جتنے بہادر تھے، صلح کی میز پر اس سے زیادہ وسیع القلب، جیسے میدان کارزار ان کی تلوار کی جھنکار سے لرزتے تھے، ویسے ہی ان کی صلح پسندی اور انسانیت نوازی دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتی تھی، وہ میدانِ مقابلہ میں جتنے بلند ہمت تھے، صلح کی بزم میں اسی قدر عالی حوصلہ اور بامروت، اسی لئے جو علاقہ ان کے ہاتھوں فتح ہوتا وہاں کی شکست خوردہ آبادی کچھ ہی دنوں میں ان کے اخلاق ومحبت اور مہر وفا کی وجہ سے ان کی گرویدہ ہو جاتی اور انھیں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی ابرِ رحمت ان پر سایہ فگن ہو گیا ہے۔

جو لوگ آج مسلمانوں کو دہشت گرد اور جنونی قرار دیتے ہیں وہ ذرا اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں، اپنی انسانیت پروری کا جائزہ لیں اور بتائیں کہ کیا کبھی مسلمانوں نے بھی اپنے مغلوب بلکہ مہلوک دشمنوں کے ساتھ ایسا انسانیت سوز برتاؤ روا رکھا ہے؟ —ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے تئیں مسلمانوں کے ایسے رویہ وسلوک کی ہرگز کوئی مثال نہیں ملے گی!

(۱۰ر مارچ ۲۰۰۰ء)

تخفیف اسلحہ اور اسلام

۲۴ تا ۳۰ ؍اکتوبر کا "ہفتہ" اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی سطح پر "ہفتۂ تخفیف اسلحہ" کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اس کا مقصد پوری دنیا کو اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ وہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہتھیاروں میں کمی کریں؛ کیوں کہ انسانیت کو تخت و تاراج اور تباہ و برباد کرنے کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا، گویا مہلک اسلحہ کا ذخیرہ انسانیت کے لئے خودکشی کے مترادف ہے اور اپنی قبر آپ کھودنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جو امن و امان کا نام لیتی ہیں اور اپنے آپ کو امن اور سلامتی کا پیغامبر تصور کرتی ہیں، یہی طاقتیں ہتھیاروں کی سوداگر ہیں، نت نئے مہلک ہتھیاروں کی منڈیاں گویا "انسانیت کی قتل گاہیں" یہی آراستہ کرتے ہیں، یہ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کو ہتھیار فراہم کر کے ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر اکساتے بھی ہیں اور دوسری طرف صلح و امن کی تلقین بھی کرتے ہیں، مشرق بعید کے ممالک جاپان، کوریا، ملیشیا وغیرہ نے جب سے صنعتی طور پر پیش رفت کی ہے اور ایسی صنعتوں میں قدم بڑھایا ہے جو انسان کے لئے نافع اور فائدہ بخش ہیں، تب سے خاص طور پر مغربی ملکوں نے ہتھیاروں کی صنعت پر اپنی توجہ مزید بڑھادی ہے اور اس بات کی بھرپور کوشش بھی کی ہے کہ مشرقی ممالک دفاعی ٹکنالوجی میں آگے نہ بڑھیں؛ تاکہ اس مہنگی اور ملکی سلامتی کے لئے ناگزیر صنعت میں ہماری اجارہ داری باقی رہے اور پوری دنیا ہتھیاروں کی خریداری میں ہم پر ہی انحصار کرے، ایسی قوموں کی طرف سے دوسروں کو تخفیف اسلحہ کی تلقین یقیناً ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔

تاہم ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہئے —— اسلحہ کی ایک قسم وہ ہے جو مجرم اور ظالم کو تنہا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، مثلاً تلوار ہے، جس شخص پر وار کیا جائے

وہی اس سے متاثر ہوتا ہے، تیر اور بندوق ہے اس کے نشانے بھی محدود ہوتے ہیں، آج کل جنگ کے موقع سے آبادیوں کا تخلیہ کرادیا جاتا ہے اور میدان جنگ میں محدود نشانے تک وار کرنے والے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، ان کو بھی جنگی حالات میں ایسے ہی اسلحہ کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ فوج اور فوجی ٹھکانے ہی ان کا اصل نشانہ ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے ہتھیار وہ ہیں جو بہت دور تک کے علاقہ کو نشانہ بناتے ہیں اور محض کوئی محدود جگہ ان کا ہدف نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ ایک بڑے علاقہ کو اس امتیاز کے بغیر کہ وہ فوجی اہمیت کا حامل علاقہ ہے یا عام رہائشی علاقہ تباہ و برباد کردیتا ہے، بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار و معذور، بے قصور شہری، جانور، مکانات، کھیتیاں اور غیر دفاعی صنعت پر مبنی کارخانے سب اس کا نشانہ بنتے ہیں، اس قسم کے ہتھیار بنیادی طور پر ظلم کی مدافعت کے لئے نہیں ہیں؛ بلکہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے اور دوسروں کی زمین ہڑپنے کے لئے ہیں۔

مدافعت اسلام کی نگاہ میں افراد و اشخاص کا بھی اور ممالک و اقوام کا بھی بنیادی حق ہے اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہ صرف جائز؛ بلکہ حتی المقدور واجب ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> **من قتل دون دينه فهو شهيد من قتل دون ماله فهو شهيد ، ومن قتل دون اهله فهو شهيد .** (ترمذی:۲۶۱/۱، کتاب الدیات)
>
> جو دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

اس لئے ایسا اسلحہ جو محدود نشانہ کا حامل ہو اور مدافعت کے لئے کافی ہو، انفرادی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے مطلوب اور پسندیدہ ہے، غور کیجئے! صلح حدیبیہ میں مشرکین چاہتے تھے کہ مسلمان غیر مسلح ہو کر آئیں، اس وقت بھی آپ ﷺ نے اس پر اصرار فرمایا کہ کم سے کم تلوار ضرور ساتھ ہوگی، چاہے نیام کے اندر ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم

ہوتا ہے کہ جب سوتے تب بھی بستر میں تلوار رکھ کر سوتے اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ استنجا اور نماز عید وغیرہ کے لئے آبادی سے باہر تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا؛ کیوں کہ اس وقت مسلمان جن خطرات سے دو چار تھے، ان حالات میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے کچھ نہ کچھ مسلح رہنا ضروری تھا، معلوم ہوا کہ جیسے افراد و اشخاص اپنی حفاظت کے لئے مناسب تدبیر کے مکلف ہیں، اسی طرح ملکی اور قومی سطح پر بھی دفاعی اغراض کے تحت ہتھیار ایک لازمی حق ہے اور اسی لئے قرآن نے مستعد رہنے کا حکم دیا ہے: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ"۔ (الانفال:٦٥)

ہتھیار کا استعمال دو صورتوں میں مذموم اور ناپسندیدہ ہے، ایک اس وقت جب ہتھیار حفاظت اور بچاؤ کے بجائے دوسروں پر ظلم و جور کے لئے استعمال کیا جائے اور اسے دہشت گردی کا سامان بنالیا جائے، دوسرے جب وہ مجرموں کے ساتھ بے گناہوں اور قصورواروں کے ساتھ بے قصوروں کو نشانہ بنائے اور جو انسان کو جنگ کے قوانین و آداب کا پابند نہیں رہنے دے، اسلام نے اس بات سے منع کیا ہے کہ جنگ کے درمیان بچوں اور عورتوں کو نشانہ بنایا جائے، ایک جنگ کے موقعہ پر دشمنوں میں سے ایک خاتون مقتول پائی گئیں، آپ ﷺ نے دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے، (بخاری، حدیث: ۱۵-۱۴-۳، مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۴۴) اسی طرح جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں، عام شہری ہوں، ان کو بھی نشانہ بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر خاص طور سے سپہ سالار فوج حضرت خالد بن ولید ؓ کو اطلاع بھیجی کہ کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کریں: "لا یقتلن امراۃ ولا عسیفا" (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۶۹) مزدور کو قتل کرنے کی ممانعت کا منشا یہ ہے کہ بے قصور شہریوں کو نشانہ نہ بنایا جائے، اسی طرح حضرت انس ؓ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بوڑھے شخص پر حملے کرنے سے بھی منع فرمایا، ارشاد ہے: "ولا تقتلوا شیخا ما"۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۱۴)

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی کو آگ میں جلایا جائے اور فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے: "ان النار لا یعذب بها الا الله"

(بخاری، حدیث نمبر:۳۰۱۶) اس حدیث سے آتشیں ہتھیاروں کا حکم معلوم ہوا کہ اسلام بنیادی طور پر ایسے اسلحہ کے استعمال کو بہتر نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ مدافعت کی اس کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا رواج عام تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمن پر غلبہ حاصل کر لیتی تو اس کے اعضاء کی قطع و برید کرتی اور اس کے چہرے مسخ کر کے رکھ دیتی، اس غیر انسانی فعل کو "مثلہ" کہا جاتا، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا؛ چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے مروی ہے: "وینھانا عن المثلة" (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۶۷) آپ ﷺ کے اس ارشاد سے کیمیکل ہتھیاروں کا حکم اخذ کیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ کیمیائی اسلحہ شکل وصورت کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور گویا زندہ انسانوں کے حق میں ایک طرح کا مثلہ ہی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ان ارشادات سے واضح ہوا کہ نیوکلیر اسلحہ، اسی طرح ایسے فاصلاتی ہتھیار جو سینکڑوں میل آگے کے شہروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں جیسے میزائیل آتشیں ہتھیار کو اسلام جنگی مقاصد کے لئے بھی پسند نہیں کرتا؛ کیوں کہ ان کا اثر لڑنے والے فوجیوں تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ بوڑھوں، بچوں، خواتین اور بے قصور شہریوں کی ہلاکت اور بلا امتیاز بڑی بڑی آبادیوں کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا ہے، کتنے ہی قریوں اور شہروں کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، اور کتنے ہی لوگوں کو اپاہج ومعذور اور زندگی کی بنیادی ضرورت سے بھی محروم کر کے چھوڑتا ہے، اسلام یقیناً ایسے اسلحہ میں تخفیف و تحدید؛ بلکہ بہ تدریج اس کے خاتمہ کا قائل ہے؛ تاکہ اسلام نے جنگ کے جو آداب بتائے ہیں اور جو احکام وقوانین دیئے ہیں ان کی رعایت ہو سکے۔

لیکن ظاہر ہے کہ تخفیف اسلحہ کی تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے، جب یہ دوطرفہ بنیاد پر ہو اور اس سلسلہ میں ہمہ قومی معاہدہ ہو سکے؛ اس لئے اگر کچھ قومیں تخفیف اسلحہ کے اُصول پر عمل کریں اور کچھ قومیں نت نئے اسلحے بنائیں اور ان کا ذخیرہ کرنے میں بھی مشغول ہوں، تو یہ کھلی ہوئی ناانصافی اور قطعاً غیر منصفانہ بات ہوگی؛ بلکہ اس سے ظلم و جور کو مدد ملے گی اور اس میں اضافہ ہوگا، اگر دشمن ایسے ہتھیار سے مسلح ہوں، تو پھر اسلام ایسی تیاری کا حکم دیتا ہے جس میں دشمن کی طاقت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو اور مدافعت کی پوری پوری رعایت رکھی جائے؛

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض غزوات میں ''منجنیق'' استعمال فرمائی ہے اور قلعہ بند فوجوں کے خلاف اس کا استعمال فرمایا ہے، ''منجنیق'' گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس سے بڑی بڑی چٹانیں دور تک پھینکی جا سکتی تھیں، اسی طرح آپ ﷺ نے بنو نضیر کے باغات کو نذر آتش کرنے کی بھی اجازت دی؛ کیوں کہ مقابلہ کے لئے اس کے سوائے چارہ نہ تھا۔ (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۶۱۵)

پس اسلام یقیناً اندھا دھند تباہی و بربادی پھیلانے والے اسلحہ میں تخفیف؛ بلکہ اس کے خاتمہ کو پسند کرتا ہے؛ لیکن اس وقت جب کہ یہ عمل امتیاز اور غیر مساویانہ طرز عمل پر مبنی نہ ہو؛ بلکہ تمام قومیں اس کو دیانت داری کے ساتھ قبول کریں؛ تا کہ انسانیت جس خودکشی کی طرف بڑھ رہی ہے اور جس تباہی و بربادی کو خود دعوت دے رہی ہے، اس سے بچ سکے، کاش! اقوام عالم سچ مچ تخفیف اسلحہ کے تصور کو قبول کریں اور انسانیت کو اس تباہی و بربادی سے بچانے کا سروسامان کریں، جس کی طرف وہ تیزی سے بڑھ رہی ہے اور انسان کی جو قیمتی صلاحیت تخریب کی سمت گامزن ہے وہ انسانیت کی تعمیر اور اس کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے میں صرف ہو۔

(۲۹/ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

نیوکلیر اسلحہ — اسلامی تصور

دوسری جنگ عظیم کو جس بھیانک واقعہ نے اختتام پر پہنچایا، وہ یہ تھا کہ امریکہ نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم برسائے، یہ صبح کا وقت تھا اور سورج نے ابھی ابھی اپنی آنکھیں کھولی تھیں؛ لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس کے اوپر اُٹھنے سے پہلے ہی جاپان کے دو بڑے شہروں پر موت کی شب تاریک چھا جائے گی، اس حملہ نے آن کی آن میں لاکھوں آدمیوں کی جان لے لی اور بے شمار انسان معذور اور اپاہج ہو گئے، انسانی اجزاء بھنے ہوئے لاڈوں کی طرح فضا میں بکھر گئے اور آج بھی یہ زمین سبزہ سے محروم ہے۔

مغربی قوموں نے ایسا خطرناک اور ہلاکت خیز ''بم'' محض اپنی قوت کے اظہار اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کو کم سے کم وقت میں شکار کرنے کے شوق میں بنایا تھا؛ لیکن مشرقی قوموں کو خوف کی نفسیات نے نیوکلیر اسلحہ سازی کی طرف پیش قدمی پر طرف مجبور کیا، روس اور روس کے بعد چین نے اس فن میں دادِ مہارت دی، ہندوستان چین کے پڑوس میں ہے اور ہندوستان کے ایک قابل لحاظ علاقہ پر چین اپنی فوجی طاقت کی وجہ سے قابض ہے، ان حالات میں ہندوستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرے، چنانچہ گزشتہ دِنوں ہمارے ملک نے بھی نیوکلیر تجربے کئے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ کو محض سیاسی اور دفاعی نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں؛ بلکہ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں، ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسلام کی نگاہ میں ناپسند ہو اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے پنجۂ ظلم کو تھام لینا ان باتوں میں سے ہے جس کو اسلام نہایت ہی تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ظالم بھائی کی بھی مدد کرو اور وہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ظلم سے روک دو۔ (بخاری ۲/۲۳۳، ط: بیروت)

اس لئے اسلام نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے بلا امتیاز حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کے حق کو تسلیم کیا ہے؛ البتہ دوسرے اُمور کی طرح اس معاملے میں بھی وہ افراط اور حد اعتدال سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا، اسلام شاید پہلا نظامِ حیات ہے جس نے جنگ کے قوانین مرتب کئے اور عین حالتِ جنگ میں بھی تہذیب وشائستگی کا دامن نہ چھوڑنے کی تعلیم دی اور مفتوح قوموں کے حقوق اور ان کی نسبت سے فاتحین کی ذمہ داریاں متعین کیں، کم لوگ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ قانون کی تاریخ میں بین ملکی اور بین قومی تعلقات اور حقوق پر پہلی کتاب امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی ہے جو "سیر کبیر" اور "سیر صغیر" کے نام سے آج بھی موجود ہے، خود مغربی مصنفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ بین قومی قانون پر لکھی گئی یہ پہلی کتاب ہے۔

قانونِ جنگ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بہت واضح ہیں، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی شخص کو جنگ کے درمیان بھی نذر آتش کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، (بخاری: ۲/۹۲۷، ط: بیروت) آپ ﷺ نے اس پر اپنی ناخوشی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، (بخاری: ۲/۹۶۲، ط: بیروت) آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے، (ترمذی: ۴/۱۲۱، ط: بیروت) کیوں کہ اس میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور عام شہری بھی حملہ کا نشانہ بن جاتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو خاص طور پر ہدایت فرمائی: "لاتقتلن امراۃ و لا عسیفاً "۔ (ابوداؤد: ۲/۳۶۲)

اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا عام رواج تھا، یعنی جب کسی قوم پر غلبہ حاصل کر لیا جاتا، تو ان کے ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹ لیتے اور بعض شقی القلب تو ان کا ہار بنا کر پہنتے بھی تھے، آپ ﷺ نے اس غیر مہذب طریقہ سے بھی منع فرمایا، (ابوداؤد: ۲/۳۶۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں بھلا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ قتل میں بھی اور جانوروں کو ذبح کرنے میں بھی، (مسلم عن شداد بن اوس) اسی طرح کوئی بھی ایسی صورت جس سے انسان کا چہرہ بگڑ جائے روا نہیں، رحمت عالم ﷺ نے تو جانور کا چہرہ داغنے سے بھی منع فرمایا۔ (ترمذی: ۴/۲۱۱، ط: بیروت) چہ جائیکہ انسان کا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی ان ہدایات سے ظاہر ہے کہ اُصولی طور پر جنگ میں ایسے اسلحہ کا استعمال درست نہیں جو آتشیں ہوں، جو بلا امتیاز فوجیوں اور شہریوں کو، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو، بیماروں اور معذوروں، نیز مردوں اور عورتوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں، جو اپنے نشانہ بننے والے متاثرین کا چہرہ بگاڑ دیتے ہوں اور ایک حد تک ان کا مثلہ ہو جاتا ہو، اگر اس پہلو سے نیوکلیر اسلحہ کے بارے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلحے ان تمام ہدایات کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں، یہ انسانوں کے علاوہ بے زبان جانور کو بھی اپنا ہدف بناتے ہیں اور نہ صرف سرسبز کھیتوں اور درختوں کو تباہ و تاراج کرتے ہیں؛ بلکہ بسے بسائے شہر اور ہرے بھرے کھیت اور باغات کو ہمیشہ کے لئے بے آب وگیاہ صحراء اور ویرانہ میں تبدیل کر دیتے ہیں؛ حالاں کہ آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ جنگ کے درمیان ہرے بھرے کھیت ضائع کر دیئے جائیں۔

علاوہ ان وجوہ کے، اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان اسلحہ پر بڑی لاگت آتی ہے، اعلیٰ ٹکنالوجی کا حصول، مختلف تجربات سے گزرتے ہوئے اس کا استعمال، نیز اس کی محافظت کی تدبیر اور اس کو اپنے نشانہ تک پہنچانے کے لئے ذرائع و اسباب کی تیاری، یہ تمام مراحل اتنے اخراجات کے متقاضی ہیں کہ ان میں لاکھوں ناخواندہ بچوں کی تعلیم اور بے سہارا یتیم بچوں کی کفالت ہوسکتی ہے اور عوام کے لئے کتنے ہی فلاحی و رفاہی کام سرانجام پاسکتے ہیں، ظاہر ہے اتنے سارے معاشی وسائل کو محض بڑی طاقت کہلانے کے لئے بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دینا نہ صرف اسلامی اور مذہبی، بلکہ اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی کوئی مناسب بات نہیں۔

تاہم فقہ اسلامی کا ایک عام اُصول ہے کہ جو باتیں ممنوع ہوں، مجبوری کی بناء پر ان کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے؛ اسی لئے مجبوری کی حالت میں آپ ﷺ نے جنگ میں منجنیق بھی استعمال فرمائی، یہ آپ ﷺ کے زمانے کا ایک ترقی یافتہ ہتھیار تھا، جس کے ذریعے دشمن کے قلعہ پر پتھر کی چٹانیں پھینکی جاسکتی تھیں، بعض اوقات دشمن سے محافظت کے لئے ہرے بھرے باغات بھی کاٹنے پڑے ہیں اور غیر ارادی طور پر ایسے لوگ بھی حملہ کی زد میں آئے ہیں، جن کے بارے میں آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ ان پر حملہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ بعض اوقات ان کی

مدافعت اور مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اقدامی طور پر تو نہیں؛ لیکن دفاعی نقطۂ نظر سے ایسے اسلحہ کا بنانا اور اس کی ٹکنالوجی حاصل کرنا جائز ہے؛ لیکن اس کے استعمال میں پہل کرنا درست نہیں، جوابی اقدام کے طور پر اس کے استعمال کی گنجائش ہوگی، یعنی نیوکلیر طاقت کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی زبان میں قوت مرہبہ ہے،(انفال:۶۰) جو محض اس لئے ہے کہ دشمن کو مرعوب رکھا جائے اور ان پر ایسی ہیبت طاری رکھی جائے کہ وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت سوزی اور خوں آشامی کے لئے اس کو کھلونا بنالیا جائے۔

مغربی طاقتیں اس وقت جس طرح ایشیائی ممالک خصوصاً ہندوستان کو نیوکلیر اسلحہ سازی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں، وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں اور سراسر امتیاز پر مبنی ہے، امریکہ دوسری جنگ عظیم میں ایک ایشیائی ملک کے خلاف اس طاقت کا استعمال کر کے تباہی مچا چکا ہے؛ لیکن وہ اپنے آپ کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اور ذمہ دار رویہ کا حامل تصور کرتا ہے اور جن ملکوں نے ہمیشہ صبر وتحمل کا رویہ اختیار کیا ہے، ان کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ نیوکلیر طاقت ایک ایسی صلاحیت ہے جو فریقین کو محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ وروس کی سخت باہمی کشاکش کے باوجود کوئی جنگ نہ ہوسکی، چین اور روس کے درمیان بھی سخت مخاصمت کے باوجود جنگ کی نوبت نہیں آئی، خود ہمارے ملک ہندوستان نے جب سے ایٹمی دھاکہ کیا ہے، اس کے پڑوسیوں کو اس پر کوئی نئی جنگ کی ہمت نہیں ہو پائی، تاہم خود ایشیائی ملکوں کے لئے یہ بات سوچنے کی ہے کہ کیا ان کی معاشی قوت اس طرح کے اقدام کی متحمل ہے؟ جہاں آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے آسمان کے سائے کے سوا سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں اور کتنے ہی انسان ہیں کہ ہر سال فاقہ مستی ان کی جان لے لیتی ہے، کتنے ہی یتیم بچے ہیں کہ ان کے سر پر کوئی محبت کا ہاتھ رکھنے والا نہیں، کتنی ہی بے کس بیوائیں ہیں جو اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کی حکومتیں ان کے درد کا مداوا کریں، پھر کیا ان طاقتور ترین نیوکلیر ہتھیاروں کے ذریعہ فاقہ مستوں کی بھوک بھی مٹائی جاسکے گی اور غریبوں کے آنسو بھی پونچھے جاسکیں گے؟؟

(۲۹؍مئی ۱۹۹۸ء)

مزدوروں کے حقوق

کل یکم مئی ہے، ''مئی'' کا مہینہ آتے ہی مزدوروں کے حقوق وفرائض کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل ان ہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو ان کے خون وپسینہ اور قوت بازو سے غذا ملتی ہے، یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے؛ حالاں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں، جس میں آجر اور مزدور دونوں کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال وتوازن بھی ہے۔

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا، جواب تک باقی ہے، کی نفی کی، آپ ﷺ نے فرمایا :

❖ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی۔ (مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذرؓ)

❖ حلال روزی کی تلاش میں محنت وکاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امامِ عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔ (ابن عساکر عن عثمانؓ)

❖ چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ ﷺ

نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا۔(طبرانی عن کعب بن عجرۃ)

❖ آپ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے (بیہقی عن علیؓ، طبرانی عن ابی بردۃؓ) اور خدا کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے۔(بخاری عن ابی ہریرۃؓ دمقدامؓ)

❖ اللہ تعالیٰ ایسے مومن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت وحرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو: ''ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف''۔(طبرانی عن ابن عمرؓ)

❖ آپ ﷺ نے فرمایا: تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا: خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔(بخاری وابن ماجہ عن ابی ہریرۃؓ)

❖ کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔(ابوداؤد عن علی بن حسینؓ مرسلا)

❖ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: سب سے حلال کمائی وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔(دیلمی عن حکیم بن حزامؓ)

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور مؤقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اُجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے، جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اُجرت کی مقدار کا تعین ہے، اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے، جس میں حضور ﷺ نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں:

> وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے؛ لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحاب ﷺ کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے تھے، غلاموں اور ان کے مالکوں کے کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے، ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور ان کے غلام اوڑھے ہوئے تھے، ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود ہی اُوڑھ لیں؛ تا کہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ۔ (بخاری عن معرورؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اُجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیارِ زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسبِ ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے، آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہئے کہ بیوی حاصل کر لے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کر لے (ابوداؤد، عن مستورد بن شدادؓ) حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا: میرا ذریعۂ معاش میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں؛ اس لئے ابوبکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمان کے لئے کام کریں گے۔ (بخاری عن عائشہؓ)

اُجرت کی ادائیگی

اُجرت کے سلسلے میں اس اُصولی ہدایت کے بعد، کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کی جائے، اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اُجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھی جائے۔

ان رسول اللہ صلى اللہ علیہ وسلم نهى عن إستجارة

الأجير حتى يبين له أجره . (مسند احمد، حدیث نمبر:۱۱۱۳۹، عن ابی سعیدؓ)

رسول اللہ ﷺ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے؛

تا آں کہ اس کی اجرت واضح کر دی جائے۔

پھر آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے۔(بخاری عن انسؓ)

آپ ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اُجرت نہ دے:

"رجل استاجر أجيروا فاستوفى منه و لم يعطه اجره"۔(بخاری عن ابی ہریرہؓ)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر (Employer) کام سے پہلے اجرت دیدے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگادی ہو، اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی، یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کردے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اُجرت ادا کرنی ہوگی۔(الفتاویٰ الہندیہ:۵۰۶/۳)

کام کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو،(موطا امام مالک عن یحیٰ بن یحیٰ) یہ ایک اُصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً اُصولِ صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جاسکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقاتِ کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں، ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان آدمیوں سے، اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے، جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے، اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لئے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے ملنے کے لئے

تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔(رد المحتار:۳/۸۰)

حسن سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں ''انھم اخوانکم'' یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے، قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بحیثیت آجر (Employer) یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں :

مَا أُرِيْدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللهُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ. (القصص:۲۷)

میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، ان شاء اللہ تم مجھ کو صالح و نیک پاؤ گے۔

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے، حضور ﷺ کی حیات طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے، مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ ﷺ نے اُونھ بھی کہا ہو یا پوچھا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (بخاری و شمائل ترمذی عن انسؓ) آپ ﷺ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے (بخاری) اسی حسن سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذات خود بھی مدد کرے۔(بخاری و مسلم)

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک

ہوں، ''مضاربت'' کی اصل یہی ہے، مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت، پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً پچاس فیصد وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے، یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مل رہا ہے، وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہوگا، اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپ ﷺ نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے سے کم از کم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

حقوق کا تحفظ

مزدوروں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایت ہی سے کام نہیں لیا؛ بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت کی گنجائش رکھی ہے؛ چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی (م ۴۵۰ھ) ''محتسب'' کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے، مثلاً : اُجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسب درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو، مثلاً کام کم کرے اور اُجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔
>
> (الاحکام السلطانیہ للماوردی (مترجم)، باب:۲۰، ص:۳۹۹)

نقصانات کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا ضامن کون ہوگا؟ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے، مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں : ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو، پہلے کی مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی کو کپڑا سلنے کو دیں، اس صورت میں وہ وقت کا پابند نہیں ہے؛ بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلف ہے، چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں

اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے، اسی طرح دن بھر کے لئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ دن بھر اپنا وقت دے۔

پہلے قسم کے ملازم کو "اجیر مشترک" اور دوسرے قسم کے ملازم کو "اجیر خاص" کہتے ہیں، اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا اور تاوان ادا کرے گا، اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۳/۵۵۵)

بندھوا مزدور

بندھوا مزدور کی ظالمانہ رسم باوجود ارتقاء اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے، مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو؛ بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی، سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے: "واما رکنھا فالا یجاب والقبول" (الفتاویٰ الہندیہ: ۴/۵۰۲، کتاب الاجارۃ) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل و حرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کی آزادی حاصل ہے اور یہ اس کا خالصتاً ذاتی و شخصی مسئلہ ہے، وہ جہاں اور جس شہر و علاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے، کر سکتا ہے: "وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيراً وَسَعَةً". (النساء: ۱۰۰)

مزدوروں کی ذمہ داریاں

جہاں مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں، وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا، وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ :

یَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ . (القصص:۲۶)

ابا جان! ان کو مزدور رکھ لیجئے ،بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے، وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو۔

یہاں اچھے مزدوروں کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: ایک قوت وصلاحیت اور دوسرے امانت و دیانت ، اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اسی لئے فقہاء نے فاتر العقل طبیب (الطبيب الماجن) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی ؛ چنانچہ علماء لکھتے ہیں :

عدل کے ساتھ وزن کرو، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقات ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں ۔ (معارف القرآن معنف مفتی شفیع صاحبؒ)

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے ، رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کر لے ،حضور ﷺ نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے، ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہیں "الراشي والمرتشي كلاهما في النار " (طبرانی عن ابن عمروؓ) رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے ؛ بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عام لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہو کر "ہدیہ" اور "نذر و نیاز" کے نام سے پیش کریں، رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے لوگ بھی داخل ہیں ؛ چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو

قبول کرے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے (ابوداؤد عن ابی امامہؓ) اور حضرت عمرؓ نے عاملوں کو ہدایا و تحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں جو معصیت اور گناہ ہو، اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بننا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو، اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے؛ چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں :

> لایجوز الاستئجار علی شیء من الغناء والنوح والمزامیر ولا أجرلهم.
>
> مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں اور وہ اُجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور کوئی شخص معاملہ طے پا جانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اُجرت واجب نہ ہوگی، تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے۔

اسی حکم میں سینما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطلی کا ہے، یہاں یہ بات ذہن نشیں کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے، اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر

اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے، نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کر دے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے؛ چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں :

> لو قال اجرتک هذه الدار سنة ، كل شهر بدرهم ، جاز بالاجماع فلا يملك أحدهما الفسخ قبل تمام السنة من غير عذر . (فتاویٰ عالمگیری:۳/۵۰۸)
>
> اگر کوئی شخص یوں کہے" میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلے ایک درہم، تو بالاتفاق جائز ہے اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آجائے تو یک طرفہ اقدام کیا جا سکتا ہے، مثلاً ملازم کو غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازی صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے، یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے، ایسے ہی پرائیوٹ اداروں کا بھی ہے۔

(۳۰/اپریل ۱۹۹۹ء)

بچہ مزدوری — اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر صاحبِ شعور، صاحبِ فہم اور طاقتور بنایا ہے، انسان کا نومولود بچہ اسی قدر فہم وشعور سے عاری اور عاجز وناتواں ہوتا ہے، چوپائے کے بچے چند دنوں میں چلنے اور چرنے لگتے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کے مطابق نفع ونقصان کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن انسان ہے کہ مدتوں کروٹ بدلنے کی طاقت سے بھی محروم اور شعلہ وشبنم کے ادراک سے بھی عاجز! رب کائنات نے ایسے کمزور، بے شعور بچہ کی پرورش کا یہ سروسامان کیا کہ نہ صرف والدین؛ بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی بچوں کے لئے محبت کی وافر سوغات رکھ دی، کون صاحبِ دل ہے جسے بچہ کی معصوم مسکراہٹ اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو اور اس کا رونا اور بلکنا سخت سے سخت انسان کو بھی تڑپا نہ دیتا ہو؟ بچہ خواہ خوش رنگ ہو یا کالا کلوٹا، صاف ستھرا ہو یا میلا کچیلا، کسی کاشانۂ عشرت میں پیدا ہوا ہو یا آشیانۂ غربت میں، اس کا بچپن کشش سے بھرپور ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی حساس اور فطرتِ سلیمہ کا حامل اسے دیکھے اور دل بھر نہ آئے اور ماں باپ اور خاندان کے اہل تعلق کا کیا کہنا، ان کو تو اپنے بچوں کے معصوم چہرہ میں لالۂ وگل کا نکھار اور غنچۂ وگل کی بوئے عطر بار کا احساس ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی ایک ایک ضرورت کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، ان ہدایات میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ان کی کفالت اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل، دوسرے ان کی تعلیم وتربیت، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری والد اور والد نہ ہوں تو حسبِ مراتب رشتہ داروں پر ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اس لئے یتیم کی کفالت کرنے پر آپ ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے: ’’انا و کافل الیتیم کھاتین فی الجنۃ‘‘ (بخاری:۵۵۴۶، ابوداؤد:۴۴۸۳) اور اس کی خاص ترغیبات حدیث میں

منقول ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں آپ ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بچہ کو ایک کلمۂ خیر سکھا دینا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے، غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہو کر آئے ان کا فدیہ آپ ﷺ نے مقرر فرمایا کہ قیدیوں میں سے جس کو لکھنا پڑھنا آتا ہو وہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے، یہ فدیہ آپ ﷺ نے ایسے وقت میں مقرر فرمایا جب مسلمانوں کی غربت وافلاس انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی اور فاقہ مستی اہل مدینہ کے گویا معمولات میں سے تھی، آپ ﷺ چاہتے تو مالی فدیہ پر اصرار کر کے بہ ظاہر اس کا کچھ مداوا کر سکتے تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے مسلمان بچوں کی تعلیم کو ان کی معاشی ضرورت سے زیادہ اہم سمجھا۔

آپ ﷺ نے بچوں اور بزرگوں کے بارے میں اُصولی ہدایت دی ہے کہ جو چھوٹوں پر رحم اور بزرگوں کی قدر دانی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے "من لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر حق کبیرنا فلیس منا" (ابوداؤد: کتاب الادب، باب فی الحرمۃ) "رحم" ایک جامع لفظ ہے، جو ہر طرح کے حسن سلوک اور ہر قسم کی بہی خواہی کو شامل ہے، جیسے کسی شخص کا خود کھانا اور بچوں کو بھوکا رکھنا بے رحمی ہے، اسی طرح بچوں کو کسب زر کا ذریعہ بنانا اور تعلیم وتربیت سے محروم رکھنا اس سے بڑے بے رحمی اور بدخواہی ہے؛ کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے پسماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے، اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ کم عمر بچوں کو کسب معاش کا مکلف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ کمانہ پائیں گے تو چوری کا ارتکاب کریں گے: "لا تکلفوا الصغیر الکسب فانه اذالم یجد سرق"۔

(مؤطا امام مالك، باب الامر بالرفق بالمملوك)

کم عمر بچوں کو کسب معاش پر لگا دینا کئی وجوہ سے بچوں کے لئے نقصاندہ ہے، قبل از وقت مشقت اس کی صحت اور جسمانی نشو ونما کو نقصان پہنچاتی ہے؛ چنانچہ بچہ مزدوروں کے سلسلہ میں ملکی اور بین الاقوامی اعداد وشمار سے اس کے متعلق نہایت ہی تشویشناک رپورٹ سامنے آرہی ہے؛ کیوں کہ ان بچوں کی بے شعوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کی صحت کا ٹھیک طور سے خیال نہیں رکھا جاتا، ایسے کام ان سے لئے جاتے ہیں جن میں آلودگی ان پر اثر

انداز ہوتی ہے اور ان کی طاقت وقوت سے بڑھ کر کام ان سے کرایا جاتا ہے، اس سے ان کا معاشی مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور ان کے لئے پوری زندگی ایسی ہی معمولی مزدوری اور کم آمدنی پر انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا، وہ علم جیسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور ان کی جہالت کی وجہ سے ان کی اگلی نسلیں بھی پستی اور انحطاط کا شکار رہتی ہیں، یہ معاشی اور علمی محرومی ان میں اخلاقی گراوٹ اور تنزل بھی پیدا کرتی ہے، یہ تو ان کا اور ان کی نسلوں کا نقصان ہے۔

قوم وملک کے لئے بھی یہ بات کم نقصاندہ نہیں کہ قوم کا ایک اچھا خاصا حصہ مستقل پسماندہ رہے، وہ جسم صحت منداور طاقتور نہیں ہوسکتا جس کا کوئی ایک عضو بھی بیمار ہو، پھر ان بچوں میں نہ معلوم کیسی کیسی ذہانتیں اور صلاحیتیں چھپی ہوں، اگر وہ بہ روئے کار آتیں تو ان سے سماج کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا تھا! اس لئے کہ کیچڑ میں بھی پھول کھلتے ہیں اور بے قیمت سیپوں ہی کی آغوش میں موتی پرورش پاتا ہے، اگر آپ شہر میں سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ہوٹلوں سے گذریں اور وہاں برتن دھونے اور میزیں صاف کرنے والے ننھے منھے بچوں کی آنکھ میں جھانک کر دیکھیں اور ان سے انٹرویو لیں تو آپ بہ آسانی اندازہ کرسکیں گے کہ ان میں بیشتر بچے ذہین اور فہیم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں کی چمک ان کی صلاحیتوں کی چغلی کھاتی ہیں، مگر افسوس کہ ان پھولوں کے لئے ویران قبرستانوں پر چڑھنا اور مرجھا جانا ہی مقدر ہے۔

اس لئے بچوں کو قبل از وقت کسب معاش کی بھٹی میں جھونک دینا یقیناً اپنے فائدہ کے لئے ان کو ہمیشہ نقصان میں مبتلا رکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ضرر پہنچانے کی گنجائش نہیں، نہ ابتداءً اور نہ ردعمل میں "لا ضرر و لا ضرارا" (موطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فی المرفق) نیز ارشاد ہے کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر سے دو چار کریں گے اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ بھی اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے "من ضار ضار اللہ و من شاق شاق اللہ علیہ"۔ (ترمذی، باب ماجاء فی الخیانۃ والغش)

بچوں کے اس استحصال کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قومی سطح پر لوگوں کا ذہن بنایا جائے اور بچوں کے اولیاء کو سمجھایا جائے کہ اگر آج وہ چند روپیہ سے محرومی کو گوارا کرلیں تو کل

ان کا بچہ تعلیم یافتہ، باعزت، باشعور اور خوش حال بن سکتا ہے اور ان کی تھوڑی قربانی سے اس کی آنے والی نسلیں ذرہ سے آفتاب بن سکتی ہیں، مسلمانوں کو اس سلسلہ میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ جہالت کی وجہ سے مسلمان بچے اس پسماندگی کا زیادہ شکار ہیں۔

چھوٹے بچوں کو محنت مزدوری پر لگانے کے بنیادی طور پر تین اسباب ہوتے ہیں: اول ماں باپ کی مجبوری، دوسرے جاہل والدین اور اولیاء کی بے شعوری، تیسرے والدین کی بے جا حرص و طمع، ان میں سب سے بڑا اور اہم سبب ماں باپ کی غربت اور مجبوری ہوتی ہے، کوئی غریب شخص معذور ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے اور گھر میں کوئی کمانے والا موجود نہ ہو تو دکھیاری بیوہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے کم عمر نونہالوں کو مشقت کی اس بھٹی میں ڈال کر چند پیسے حاصل کرے، اسی سے اپنا تن ڈھانکے، پیٹ بھرے، اپنی اور گھر کی عزت و آبرو کی حفاظت کرے، سماج اتنا ظالم اور خود غرض ہے کہ وہ کسی غریب کی جھونپڑی پر ترچھی نظر ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور مجبوری کو دیکھ کر اس کی رہی سہی پونجی بٹورنے؛ بلکہ بعض اوقات اس کی عزت و آبرو کا بھی سودا کرنے کو کمربستہ ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر ان بے کس و بے آسرا لوگوں کو بچہ مزدوری کے سلسلہ میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، شریعت کا اُصول یہی ہے کہ اگر دو خرابیوں میں سے ایک کے ارتکاب پر مجبور ہو جائے تو کمتر درجہ کی برائی کو اختیار کرلے: ''اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضرراً بارتكاب اخفهما''۔

ایسے موقعوں پر حکومت کو اس بات کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے کہ وہ ایسے بے سہارا گھرانوں کی اقل ترین ضروریات کو پوری کرے؛ تاکہ قوم کی یہ متاعِ گراں مایہ ضائع نہ ہونے پائے، ایسے ہی پریشان حال لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی ''بوجھ'' چھوڑ کر مرا ہو وہ میرے ذمہ ہے اور مال چھوڑ کر رخصت ہوا ہو تو یہ اس کے ورثہ کا حق ہے: ''من ترك كلا فالي ومن ترك مالا فلورثته '' (ابوداؤد) ''بوجھ'' سے مراد عورتیں، بچے اور قرضے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب فراخی آئی تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ سو درہم مقرر کر دیا جاتا تھا، اگر حکومت عوام کو بچہ مزدوری سے روکنے کے لئے

اشتہار کے ایک سے ایک وسائل اختیار کرے اور قانون سخت سے سخت بنائے؛ لیکن ان مسائل کو حل نہ کرے جو اصل میں بچوں کو مزدوری پر لگانے کا سبب ہیں، تو یہ بے فیض ہوگا؛ بلکہ یہ مفلس و نادار گھرانوں کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، اس لئے حکومت کو ایسے غریب خاندانوں کی کفالت کا مناسب نظم کرنا چاہئے اور اربابِ اقتدار کی آسائش اور تفریح گاہوں اور ایوانِ اقتدار کے در و دیوار کی آرائش پر جو کثیر رقوم خرچ کی جاتی ہیں، ان کے بجائے جائز اور صحیح مصارف پر ان کو خرچ کرنا ہوگا۔

جو دکاندار اور کارخانہ داران کم عمر بچوں کی خدمت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، ان کو بھی چاہئے کہ قوم کے ان نونہالوں کے حقوق کو محسوس کریں اول تو ان سے وہی کام اور اتنا ہی کام لیا جائے جو ان کے لئے قابل برداشت ہو، آپ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، تو ان بچوں سے طاقت سے زیادہ کام لینا کیوں کر روا ہو سکتا ہے، بچہ مزدوری کے سلسلہ میں بین الاقوامی سطح پر جو معلومات جمع کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ بعض مالکان ان سے سولہ اور سترہ گھنٹے کام لیتے ہیں اور نہایت قلیل مزدوری ادا کرتے ہیں، جو کھلا ہوا ظلم و جور ہے، دوسرے ان سے کام لینے کے ساتھ ساتھ کچھ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا جائے؛ تاکہ ان کا مستقبل سنور سکے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے غلاموں اور باندیوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی تلقین فرمائی ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خادموں اور خادماؤں سے جہاں کام لیا جائے وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی بھی فکر کی جائے، تیسرے ان کو ان کی پوری مزدوری ادا کی جائے، ایسا نہ ہو کہ ان کی بے شعوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کام زیادہ لیا جائے اور پیسے کم دیئے جائیں، یہ ناانصافی اور استحصال بھی کم تولنے اور کم ناپنے میں داخل ہے۔

''بچہ'' اور کم عمر کا اطلاق کس سن و سال کے لڑکوں اور لڑکیوں پر ہوگا؟ اس سلسلہ میں جدید میڈیکل تحقیق کی روشنی میں ۱۴ سال کی عمر طے کی گئی ہے، حیرت انگیز طور پر بڑے چھوٹے کی تحدید کے لئے جو عمر رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی یہ وہی عمر ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقع سے مجھے جہاد میں شرکت کے سلسلہ میں پیش کیا گیا، تو آپ ﷺ نے مجھے شریکِ جہاد ہونے کی اجازت نہیں دی، پھر جب غزوۂ خندق میں میری پیشی ہوئی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی، جب نافع رحمہ اللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہی بڑے اور چھوٹے کے درمیان عمر کی حد ہے؛ چنانچہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کہ جو لڑکے پندرہ سال کے ہو گئے ہوں ان کے لئے فوجی خدمت کا وظیفہ مقرر کردیں، (بخاری: باب بلوغ الصبیان الخ) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت محنت و مزدوری کے معاملہ میں ۱۵ سال کے لڑکے کو بالغ تصور کرتی ہے؛ لیکن نکاح وغیرہ میں نابالغ، اسلامی نقطۂ نظر سے لڑکے اور لڑکیاں اس عمر میں تمام حقوق اور ذمہ داریوں میں بالغ تصور کئے جائیں گے، کہ اس عمر میں جسمانی نشو و نما اور شعور و ادراک دونوں ہی جہتوں سے انسان حدِ بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۳۰/ مارچ ۲۰۰۱ء)

ماحولیاتی آلودگی اور اسلام

ابھی چند دنوں پہلے ''عالمی یوم تحفظ ماحولیات'' منایا گیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کا مسئلہ اس عہد کا نہایت اہم اور گمبھیر مسئلہ بن کر اُبھرا ہے اور اس وقت تمام دنیا کو اس نے اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے، کئی عالمی کانفرنسیں اس موضوع پر ہو چکی ہیں اور اس کے لئے ممکنہ تدابیر پر نہایت سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ پوری دنیا میں غور کیا جارہا ہے۔

یوں تو ماحول میں کثافت پیدا کرنے والی بہت سی چیزیں خود قدرت نے انسانی اور حیوانی جسم میں رکھی ہیں، جیسے پیشاب، پائخانہ، مردار جسم سے پیدا ہونے والا تعفن وغیرہ؛ لیکن عصر حاضر کی صنعتی اور مشینی ترقیوں نے ماحولیاتی کثافت کے اسباب میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے، کارخانوں سے خارج ہونے والے فضلات، پٹرول، ڈیزل کے ایندھن، ایرکنڈیشن اور ریفریجیٹر وغیرہ سے خارج ہونے والی گیسیں، ڈیزل اور پٹرول کے ایندھن پر مبنی ٹریفک کی کثرت، یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو انسان کو راحت وسہولت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اور غیر محسوس فضائی اور ماحولیاتی کثافت کا تحفہ بھی دے جاتی ہیں۔

نظام قدرت میں توازن کی ایک مثال یہ ہے کہ جہاں اس نے کثافت پیدا کرنے والے قدرتی وسائل عطا کئے ہیں، وہیں اس نے کثافت کو تحلیل کرنے اور انسانیت کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے کچھ قدرتی اور فطری ذرائع بھی پیدا کئے ہیں، جیسے سمندر، کہ اس کا کھارا پانی آلودگی کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح درخت اور جنگلات، یہ جہاں انسان کو صاف وشفاف ہوا فراہم کرتے ہیں، وہیں فضا میں پھیلی ہوئی آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، خود وہ مٹی جس میں ہم رہتے بستے ہیں اور جس کی پشت پر ہزاروں سال سے کتنی ہی مخلوق شاد وآباد ہے، وہ بھی ٹھوس کثافت آمیز

مادوں تک کو تحلیل کر دیتی ہے، جو مردے اور مردار زمین میں دفن کئے جاتے ہیں اور جو گندگیاں اور غلاظتیں زمین کی تہوں میں چھپا دی جاتی ہیں، اگر زمین اپنا سینہ کشادہ کر کے ان کو قبول نہ کرے، تو نہ جانے روئے زمین پر کتنی آلودگی پیدا ہو جائے اور انسان وحیوان کے لئے جینا دوبھر ہو جائے۔

لیکن صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف قدرتی وسائل کا ایسا استعمال بڑھتا جا رہا ہے، جس سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہو اور دوسری طرف درخت اور جنگلات جو ہمارے ماحول کی حفاظت کے لئے ایک بہت بڑا قدرتی عطیہ ہیں، انسان نہایت ہی بے رحمی سے ان کو کاٹتا اور ختم کرتا جا رہا ہے، بہت سے جنگلات ہیں جو اب درختوں کے بجائے انسانوں کے جنگل بن گئے ہیں، ان جنگلات میں ایسے حیوانات بھی رہتے ہیں جو بعض کثافت پیدا کرنے والی اشیاء یا جانور کو اپنی غذا بناتے ہیں، جنگلات کا خاتمہ ان کے وجود کو بھی کم کرتا جاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ قدرت نے فضا میں بھی ہمارے لئے ''اوزون گیس'' کی صورت میں ایک قلعہ تعمیر کر دیا ہے، یہ قلعہ سورج اور فضا کی طرف سے زمین تک آنے والی شعاعوں کی صفائی کا کام کرتا ہے، ان کی وجہ سے شعاعیں اس تناسب کے ساتھ زمین تک پہنچتی ہیں کہ عام حالات میں جسم انسانی کو ان سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، اب اوزون کی یہ قدرتی پرت زمین سے خارج ہونے والی کثیف گیسوں کی وجہ سے رقیق ہوتی اور پھٹتی جا رہی ہے اور اس کی وجہ سے مختلف امراض خصوصاً جلدی کینسر کے عام ہو جانے کا اندیشہ ہے، اصل میں تو یہ مغربی اقوام کی شامت اعمال ہے کہ انھوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی عہد میں اس طرف کوئی توجہ نہیں کی؛ لیکن اب جب مشرق کی ترقی پذیر اقوام نے ان ہی قدرتی وسائل کو روبہ کار لانا شروع کیا ہے، تو مغرب کو ماحولیاتی حفاظت کی بابت بڑی ''بے قراری'' سی پیدا ہو گئی ہے۔

بہر حال یہ کسی ایک قوم، ایک علاقہ اور ایک مذہب کے ماننے والوں کا مسئلہ نہیں؛ بلکہ یہ عالمی اور بین قومی مسئلہ ہے، اسلام جو ایک عالمگیر، جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء اور زمانہ وعہد کی قید سے آزاد مذہب ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس اہم مسئلہ سے صرف نظر کرے، اسلام کی

تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایات و ارشادات سے اس سلسلے میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے، آپ ﷺ نے ہر ایسی بات سے منع فرمایا جو ماحول کو گندہ اور آلودہ کرتی ہے اور انسانی سماج کے لئے روحانی یا جسمانی لحاظ سے مضرت رساں ہے۔

چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین مقامات پر قضاءِ حاجت سے منع فرمایا، ایسی جگہ پر جہاں مسافرین سرراہ پڑاؤ کرتے ہوں، راستے پر اور درخت کے سایہ میں، (ابوداؤد: ۱۴۱:۶۲) اسی طرح آپ ﷺ نے اس کی بھی تلقین فرمائی کہ قضاءِ حاجت کے لئے آبادی سے دور کی جگہ کا انتخاب کیا جائے؛ بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ ضرورت کے لئے مکہ سے قریب دو میل کی دوری پر واقع مغمس نامی مقام پر تشریف لے جاتے تھے، (مجمع الزوائد: ۲۰۴/۱) آپ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی برتن میں پیشاب کرکے اسے گھر میں رکھا جائے۔ (طبرانی عن عبداللہ بن یزید)

پانی کی حفاظت کی خاص طور پر آپ ﷺ نے تاکید فرمائی؛ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہرے اور رکے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے، (ترمذی) اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے، (مجمع الزوائد: ۲۰۴/۱) اور خاص طور پر آپ ﷺ نے حمام اور غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (ابوداؤد و ترمذی عن عبداللہ بن مغفل)

جن چیزوں سے ماحول آلودہ ہوتا ہے، ان کو زمین میں دفن کرنے کی ہدایت دی گئی، اسلام میں مردوں کی تدفین کا نظم قائم کیا گیا، جو حیوانی مردہ اجسام سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے، اسلام نے جیسے مسلمانوں کی تدفین کا حکم دیا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کی نعش کو بھی دفن کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر غور کیجئے کہ قرآن مجید نے ہابیل و قابیل کے واقعہ میں کوے کو زیر زمین دبانے کا ذکر کیا ہے، (المائدۃ: ۳۱) یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ مردار کو بھی یوں ہی نہ چھوڑنا چاہئے؛ بلکہ ان کو بھی مٹی کے نیچے دبا دینا چاہئے اور کچھ اسی پر موقوف نہیں، دوسرے اجزاءِ جسم جن سے تعفن پھیل سکتا ہو اور آلودگی پیدا

ہوتی ہو، ان کو بھی دفن کر دینے کا حکم دیا گیا ہے؛ چنانچہ حضرت اُم سعد ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خون کو دفن کرنے کا حکم فرمایا، (مجمع الزوائد: ۵/۹۲، بحوالہ طبرانی) اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ناک سے نکلنے والی آلائش کو دفن کرنے کا حکم فرمایا، (مسند بزار، مجمع الزوائد: ۸/۱۱۴) اسی لئے فقہاء نے خواتین کو ماہواری کے زمانہ کے آلودہ کپڑوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

درخت کی حفاظت کی بھی آپ ﷺ نے خصوصی ہدایت دی اور شجر کاری کی ترغیب بھی دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے، تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔(بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ)

اسی لئے بعض صحابہ ﷺ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے، امام احمدؒ نے حضرت ابو درداء ﷺ سے نقل کیا ہے کہ وہ خاص اسی نیت سے درخت لگایا کرتے تھے، (مجمع الزوائد: ۴/۶۷-۶۸) اسی لئے اسلام میں افتادہ سرکاری اراضی کے بارے میں یہ اُصول مقرر کیا گیا کہ جو شخص بھی اس میں کاشت کرنا چاہے، حکومت کی اجازت سے کر سکتا ہے، (ابوداؤد) اگر کوئی شخص ایسی اراضی قبضہ میں لے کر پھر اُسے آباد کرنا چھوڑ دے، تو زمین اس سے لے کر دوسرے کے حوالہ کر دی جائے گی؛ تاکہ وہ اس میں کھیتی کرے۔(خلاصۃ الفتاوی: ۴/۳)

جہاں آپ ﷺ نے شجر کاری اور زراعت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، وہیں آپ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ درخت بے ضرورت کاٹے جائیں، عرب میں زیادہ تر ببول اور بیری ہی کے درخت ہوا کرتے تھے، آپ ﷺ نے بیری کے درخت کے بارے میں فرمایا کہ اس کو کاٹنے والے اوندھے منہ جہنم میں جائیں گے، (مجمع الزوائد: ۸/۱۱۵) ایک ضعیف حدیث میں ایسے شخص پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے، (طبرانی عن علیؓ) یہاں تک کہ جنگ میں بھی اسلام نے کھیتیوں اور درختوں کو جلانے اور نقصان پہنچانے کو ناپسند فرمایا ہے، قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جو کسی علاقے پر غلبہ پانے کے بعد وہاں کے کھیتوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (البقرۃ: ۲۰۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مجاہدین کو خاص طور پر درختوں

اور کھیتوں کے برباد کرنے سے منع فرمایا۔ (ترمذی عن ابی بکر الصدیقؓ)

یہی حال حیوانات کا ہے، آپ ﷺ نے بلا ضرورت، محض شوقیہ شکار کرنے اور حیوانات کے ہلاک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے، آج کل جو مضر صحت گیسیں، مشینوں اور موٹروں سے خارج ہوتی ہیں، ظاہر ہے عہد نبوی میں یہ وسائل انسانی تصرف میں نہیں آئے تھے؛ لیکن اس سلسلے میں بھی احادیث میں اشارہ موجود ہے، خواہ مخواہ چراغ کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا گیا، حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ صبح کے وقت چراغ جلانے کو ناپسند فرماتے تھے، (طبرانی، مجمع الزوائد: ۱۱۲/۸) اسی طرح آپ ﷺ نے سوتے وقت چراغ کو گل کرنے کا حکم فرمایا، (مسند احمد، مجمع الزوائد: ۱۱۱/۸) ظاہر ہے کہ اس تدبیر سے تیل کا دھواں کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کے برتنے اور استعمال کرنے کے سلسلے میں دو بنیادی اُصول بتائے گئے ہیں، ایک یہ کہ کسی بھی شئے کا اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچے ''لاضرر ولاضرار'' دوسرے جن چیزوں کا استعمال جائز ہے اور جو وافر مقدار میں آدمی کو فراہم ہوں، ان کو بھی بے محل استعمال نہ کیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے، اسی کو قرآن کی زبان میں ''اسراف وتبذیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے، حضور ﷺ نے پانی تک کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے منع فرمایا اور وضوء وغسل میں بھی محتاط طریقے پر پانی کے استعمال کا حکم فرمایا، جو شریعت پانی میں اسراف کو گوارا نہیں کرتی ہو، وہ پٹرول، ڈیزل، کیروسین اور المونیم گیس وغیرہ جیسے قیمتی قدرتی وسائل کے استعمال کو کیوں کر گوارا کرسکتی ہے، جس میں وسائل کا ضیاع بھی ہے اور دوسروں کے لئے مضرت اور نقصان بھی، یہ بنیادی اُصول ہیں، جن سے ماحول کو آلودہ کرنے اور نقصان پہنچانے والی اشیاء کے غیر محتاط اور بے جا استعمال کا حکم جانا جاسکتا ہے۔

(۱۹؍جون ۱۹۹۸ء)

عبادت گاہوں سے صوتی آلودگی پھیلنے کا مسئلہ

۳۰/اگست ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ عبادت کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے، اس فیصلہ میں عبادت گاہوں میں ڈھول پیٹنے اور لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''کوئی بھی مذہب اس کی تلقین نہیں کرتا یا ترغیب نہیں دیتا؛ کیوں کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال امن وسکون میں خلل ڈالتا ہے، ضعیف ومعذور افراد، طلبہ اور شیر خوار بچوں کو بھی پُرسکون فضا میں نیند لینے کا فطری حق حاصل ہے اور یہ غیر متوازن آواز صوتی آلودگی کا سبب ہے'' — یہ فیصلہ چرچ آف گاڈ مدارس کی اپیل کے پس منظر میں سامنے آیا ہے، مدارس ہائیکورٹ نے حکومت تمل ناڈو کو ہدایت دی تھی کہ شور شرابہ پر تحدیدات سے متعلق قوانین کی پابندی کرائی جائے اور مذکورہ چرچ کو اس بات کا پابند بنایا جائے کیوں کہ کے، کے، آر میجسٹک کالونی، ویلفر ایسوسی ایشن کی درخواست کے مطابق یہ چرچ صوتی آلودگی پیدا کر رہا تھا۔

چوں کہ فیصلہ کا پورا متن اخبارات میں نہیں آیا ہے اور تفصیلات غیر واضح ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عدالت نے اس بارے میں کیا تحدیدات عائد کی ہیں؟ کیوں کہ حسب ضرورت سامعین تک آواز پہنچانے کا نظم ایک بنیادی ضرورت بھی ہے اور بنیادی انسانی حق بھی، یقیناً عدالت کا مقصد ایسی جائز صورت پر امتناع عائد کرنا نہیں ہوگا اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صوتی آلودگی کا تعلق صرف مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ غیر مذہبی مقاصد کے لئے بھی وہ اسی قدر مضر اور تکلیف دہ ہے اور شاید سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اس سلسلہ میں نصح وہدایت کی زیادہ مستحق ہیں؛ لیکن مسئلہ بہر حال اہم ہے اور اس پر اعتدال اور عدل کے ساتھ عمل کرانے کی ضرورت ہے، عدل کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ

اکثر و بیشتر اس طرح کے قوانین اقلیتوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں اور اکثریت کے سات خون معاف ہوتے ہیں، حکومت نقض امن کے نام پر پہلو تہی برتتی ہے اور عدالت بھی ان کے معاملہ میں بے بس ہوتی ہے، اس وقت حیدر آباد میں گنیش تہوار کی تیاری چل رہی ہے، اور گلی کوچوں میں کان کو بہرا کر دینے والی آوازوں کا گویا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے جو تھامے نہیں تھمتا ہے، یہ شور اکثر اوقات بلا وقفہ چوبیس گھنٹہ جاری و ساری رہتا ہے، پہلے لوگ خود گاتے اور نعرے لگاتے تھے؛ اس لئے قدرتی طور پر ایک حد قائم رہتی تھی؛ لیکن اب آدمی کی جگہ ٹیپ ریکارڈ نے لے لی ہے، اس لئے وہ بلا تعب و تھکن دن ورات نغمہ ریز رہتا ہے اور بہت سے لوگ جو آواز کے معاملہ میں نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، وہ کروٹ بدلتے اور نیند کو مناتے صبح کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا عدالتیں اور حکومتیں ان مواقع پر بھی اسی طرح حرکت میں آئیں گی جیسا کہ انھوں نے ایک چرچ کے بارے میں "فرض شناسی" کا اور بچوں اور معذوروں کے حقوق کی پاسداری کا ثبوت دیا ہے۔

جہاں تک آواز کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو وہ یہی ہے کہ آواز حد اعتدال میں رہنی چاہئے، ضرورت سے زیادہ آواز کے بلند کرنے کو اسلام پسند نہیں کرتا، عربوں کا ایک عجیب مزاج تھا کہ وہ آواز کی بلندی کو باعث افتخار جانتے تھے اور پست آواز کو وجہ ذلت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ عرب شعراء بھی کسی انسان کے جانور کی طرح بلند آواز ہونے کو بہ طور مدح و تعریف کے ذکر کرتے تھے، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱۴؍۷۲) قرآن مجید نے اس غلط سوچ پر متنبہ کیا اور ارشاد فرمایا :

> اپنی چال میں اعتدال رکھو، اور اپنی آواز کو پست رکھو کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے۔ (لقمان: ۱۹)

گدھے کی آواز چوں کہ بہت تیز اور ناہموار ہوتی ہے، اس لئے اس کو سب سے مکروہ آواز قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ضرورت سے زیادہ اونچی آواز میں تکلف بھی ہے اور دوسرے کے لئے تکلیف بھی: "**فان الجهر باكثر من الحاجة**

تکلف یؤذی ''(الجامع الاحکام القرآن:۱۴/۷۱) علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی آواز کو گدھے کی آواز سے مشابہ قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معتدل آواز ناجائز اور مذموم ہے۔(ابن کثیر:۳/۴۴۶)

عام حالات میں تو آواز کو معتدل رکھنے کا حکم ہے ہی، عبادات اور دین کے افعال میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، آپ نے ایک بار رات کے وقت باہر نکلے تو حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ مصروف نماز ہیں اور بہت ہی دھیمی آواز میں قراءت کررہے ہیں، پھر حضرت عمرؓ کے پاس سے گذر ہوا، وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے اور بہت زور زور سے قرآن کی تلاوت فرمارہے تھے، جب آپ کے یہ دونوں برگزیدہ رفقاء حاضر خدمت ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے آہستہ قرآن پڑھنے کی وجہ پوچھی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ جس ذات سے میں سرگوشی کررہا تھا، میں نے اس کو تو سنا دیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو میری آواز سن لی، حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا کہ تم اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو تلقین فرمائی، کہ وہ کسی قدر اپنی آواز کو بلند کریں اور حضرت عمرؓ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی آواز کو پست کریں (ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۳۲۹) معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں بھی آواز کو معتدل ہونا چاہئے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں معتکف ہوئے اور لوگوں کو زور زور سے قراءت کرتے ہوئے سنا تو پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا کہ تم سب اپنے رب سے سرگوشی کررہے ہو، تم ایک دوسرے کو تکلیف نہ دو اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو۔(ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۳۳۲) بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع پر قرآن کو زور سے پڑھنے کی خصوصی ہدایت نہیں ہے، ان مواقع پر آہستہ قرآن پڑھنا افضل ہے: چنانچہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کو زور سے پڑھنے والا کھلے عام صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور قرآن کو آہستہ پڑھنے والا چھپا کر

صدقہ کرنے والے کی مانند ہے: "الجاهر بالقرآن كالجاهر بالصدقة والمسر بالقرآن كالمسر بالصدقة"۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۳۳۳)

فقہاء نے بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے؛ چنانچہ مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

ويجهر الامام وجوبا بحسب الجماعة فان زاد عليه اساء. (الدر المختار مع الرد:۲/۲۴۹)

امام جماعت کے اعتبار سے ہی جہر کرے گا، اگر اس سے زیادہ زور سے پڑھے تو اس نے نامناسب عمل کیا۔

اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ اتنی بلند آواز جو خود اس کو تھکا دے اور دوسرے کے لئے اذیت کا باعث ہو، اچھی بات نہیں، (رد المختار:۲/۲۴۹) —— اس سے معلوم ہوا کہ بعض سیدھے سادھے مسلمان بھائی جو مسجد میں نماز کے لئے بیرونی مائک کا استعمال کرتے ہیں، جس کی آواز مسجد سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں پھیلتی ہے، یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں؛ کیوں کہ جیسا کہ مذکور ہوا خود رسول اللہ ﷺ نے قراءت قرآن میں آواز کے بہت بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے، دوسرے اس میں قرآن مجید کی اہانت کا اندیشہ بھی ہے؛ کیوں کہ قرآن کے احترام کا تقاضا ہے کہ سننے والے پوری طرح قرآن کی طرف متوجہ اور یکسو رہیں اور غور سے سنیں؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں، بات چیت کرتے رہتے ہیں، کاروبار کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور قرآن کے سننے کا حق ادا نہیں ہوتا، گویا ہم لوگ بالواسطہ قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بنتے ہیں۔

اسلام میں صرف اذان کے لئے بلند آواز کو پسند کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کا مقصد ہی اظہار و اعلان ہے اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اسی لئے اس خدمت پر مامور فرمایا کہ ان کی آواز بلند تھی، (ترمذی) لیکن اذان میں بھی ایسی ہی آواز مطلوب ہے جو اہل محلہ تک پہنچ جائے، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صاحب نے اذان دی اور آواز کو بلند کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس پر ناپسندیدگی کا

اظہار فرمایا (تفسیر قرطبی: ۱۴/۱۷۱) —— پھر اذان ایک مختصر سا عمل ہے، جو زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے، جو غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی اذیت کا باعث نہیں ہوتی۔

رہ گیا گانا بجانا، ڈھول باجے، رقص و سرور، نعرہ بازی، بے وقت اور بے محل محلہ کا آرام غارت کر دینے والی تقریریں اور شور و ہنگامے، تو اسلام ان کا قائل نہیں؛ بلکہ ایسے تکلیف دہ رویہ کو ناپسند کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو بازار میں اور میدان جنگ میں بھی بے جا شور و شغب پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بازار میں شور و ہنگامے کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں: ''ان اللہ یبغض ...... صخابا فی الاسواق'' (موارد الظمان، حدیث نمبر: ۱۹۷۵) ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج میں اسلامی زندگی کے صحیح خد و خال پیش کریں۔

جانور اور اسلامی تعلیمات

اسلام کا ابر رحمت صرف انسانوں پر ہی نہیں برسا؛ بلکہ اس نے پوری کائنات کو آبیار کیا، جہاں اس نے ناطق انسان کو اپنے کرم سے سرفراز فرمایا، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال کیا، انسان جب شقاوت پر اُتر آتا ہے اور ظلم و جور اس کی طبیعت بن جاتی ہے، تو پھر اس کے ظلم و جور کی کوئی نہایت نہیں رہتی، وہ بے زبان جانوروں پر بھی مشق ستم کرنے لگتا ہے اور تہذیب و شائستگی کا دامن چھوڑ دیتا ہے، اسلام سے پہلے عربوں کے گزر بسر کا ذریعہ یہی جانور تھے، ان کا دودھ غذا کا کام دیتا، ان کی پشت سواری اور بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ان کی تجارت کا دارومدار ان ہی سواریوں پر تھا، ان کے چمڑوں سے بھی مختلف کام لئے جاتے تھے؛ لیکن ان سب کے باوجود جانوروں کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ اور جفاکارانہ تھا۔

آپ ﷺ نے ایسے غیر انسانی سلوک کو منع فرمایا، جانور کے منھ پر مارنے کی ممانعت کی، لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس درندگی کو روکا، جانور کی خوراک اور ضروریات کی رعایت کرنے کا بھی حکم دیا، ایک اُونٹ کو دیکھا کہ اس کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، اسی سلسلہ میں ایک معجزہ بھی ظاہر ہوا، ایک اُونٹ نے اپنے مالک کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اس کے مالک کو تنبیہ فرمائی، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر سرسبز و شاداب موسم میں سفر کرو تو آہستہ چلاؤ اور جانور کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دو اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ، آپ ﷺ نے اس بات کی بھی تلقین کی کہ جو جانور جس کام کے لئے ہے اس سے وہی کام لو، آپ ﷺ نے ''منبر'' کے طور پر جانور سے کام لینے سے منع فرمایا، جانور کو منبر نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جانور اسٹیج

کے طور پر استعمال نہ کیا جائے کہ اس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کی جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بیل پر ایک آدمی سواری کر رہا تھا، اللہ کی قدرت خاص سے بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا میں اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں "انی لم اخلق لھذا"۔

آپ نے فرمایا کہ آخرت کا ثواب وعذاب جانوروں کے ساتھ اچھے اور بُرے سلوک سے بھی متعلق ہے، قیامت کے دن ایک عورت محض اس لئے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ خود کھائے اور چر کر اپنی ضرورت پوری کرے اور ایک شخص اس بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دور کی ہوگی اور اسے پانی پلایا ہوگا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتیوں میں سے چرندو پرند جو کھالیں اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

اسلام نے گوشت خوری کی اجازت ضرور دی ہے؛ لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے، کسی صاحب نے ایک گوریا پکڑ رکھی تھی اور اس کی ماں بے قرار تھی، آپ ﷺ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا ضرورت ایک گوریا کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے، اسی لئے جو چیزیں انسانی کام نہیں آتیں، آپ ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ھُدھُد وغیرہ کے مارنے کی آپ ﷺ نے صراحتاً ممانعت فرمائی، کسی ذی روح کے جلانے کو آپ ﷺ نے شدت سے روکا ہے، ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولہا سلگایا جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ ﷺ نے چولہا بجھانے کا حکم دیا، خود قرآن مجید میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے، جن کے حکم سے چیونٹیاں جلائی گئی تھیں، اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے، اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دُنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا

گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی — سوائے ''جین مذہب'' کے، حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے، آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے؛ لیکن یہ محض اپنے مذہب اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے، رگ وید میں ہے :

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینسیں پکائیں۔

(رگ وید:۶/۱۱-۱۷)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجر وید، ادھیائے:۲۰/۷۸)

منوسمرتی میں کہا گیا ہے :

مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک،
بھیڑیئے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے
پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی، ادھیائے:۳/۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانہ تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تاراچند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنے یعنی ''جیو ہتیا'' کا باعث بنتا ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے، غور کریں کہ کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے، آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اُتارتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبانِ حال سے پروانہ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو

مضرِ صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے ہوں، ان کا خاتمہ کر دیں، پس جیو ہتیا کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں، خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے، سوامی دیانند جی نے ''آواگون'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں، جن میں ایک نباتات بھی ہے، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہو تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت کا مطالبہ ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے؛ بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستی قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا؛ لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے، اس کی مثال امریکہ اور یورپ ہیں، ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاص تحدیدات ہیں؛ لیکن دُنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے، آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں، رہنمایانِ عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح علیہ السلام کو عدمِ تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے؛ لیکن کیا یہ

برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ بھی گوشت خور تھے، گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے؛ بلکہ دم آخر میں گوشت کھا کر ہی ان کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور نا سمجھی ہی کہی جاسکتی ہے، جب تک دلوں کی دُنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو، محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کر سکتیں۔

(۱۶/اکتوبر ۱۹۹۸)

ہڑتال — اسلامی نقطۂ نظر

آج کل احتجاج اور مظاہرہ کا حق جمہوریت کی پہچان اور شناخت بن گئی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں علامتی احتجاج کیا جاتا ہے، مثلاً ایک منٹ کے لئے قلم رکھ دینا، پانچ دس منٹ کام کرنے سے باز رہنا، حکومت کو میمورنڈم پیش کرنا وغیرہ؛ لیکن ترقی پذیر ممالک کے لئے کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، طویل سے طویل تر مدت کا بھی احتجاج ہو سکتا ہے، احتجاج اشتعال کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے، احتجاج کے نام پر پرتشدد مظاہرے کئے جاتے ہیں اور سرکاری اور عوامی املاک کی بربادی احتجاج میں کامیابی کی علامت متصور ہوتی ہے، بعض محکموں کے ملازمین مہینوں احتجاج کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، حتیٰ کہ لازمی اور ناگزیر خدمات کے ملازمین بھی احتجاج کرنے سے نہیں چوکتے، ہسپتال ہفتوں بند رہتے ہیں، پوسٹ آفس کا کام کاج ٹھپ پڑ جاتا ہے، ٹرینیں اور بسیں بند ہو جاتی ہیں، غرض کہ غریب اور پسماندہ ملکوں میں احتجاج عملاً ہر طرح کے قواعد وضوابط سے آزاد ہے، ابھی کچھ دنوں پہلے ٹرک کی ہڑتال ہوئی، جو ایک قیامت سے کم نہیں تھی، ضروریات زندگی کی قیمتیں جو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی ہیں، آسمان سے باتیں کرنے لگیں، بازار میں طلب اور رسد کا توازن بگڑ گیا، ملک کو اس سے جو شدید نقصان ہوا، وہ بہت ہی سنگین اور افسوس ناک ہے، اس ہڑتال سے پہلے بعض سرکاری ملازمین کی ہڑتال تھی اور اب خبر ہے کہ آٹو کی ہڑتال ہونے والی ہے، غرض ہڑتال ہماری روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں سے ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ملک کے کسی حصہ میں کوئی نہ کوئی ہڑتال نہ پائی جاتی ہو۔

ہڑتال کا اصل مقصد ظلم وناانصافی پر احتجاج کرنا ہے، ظلم پر احتجاج اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر ناراضگی کا اظہار یقیناً انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اسلام بھی

اس حق کو تسلیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا. (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ کوئی مظلوم ہو، اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظلم و ناانصافی کے خلاف مناسب طریقہ پر احتجاج و مظاہرہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں عدالت سے چارہ جوئی، احتجاجی جلسہ، پرامن احتجاجی ریالی تو شامل ہے ہی، آج کے ذرائع ابلاغ کے پس منظر میں اخبارات، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے اپنے موقف کی وضاحت اور حکومت کے ناروا رویہ سے اختلاف کا اظہار بھی اس میں داخل ہے، اسی طرح حکومت سے نمائندگی اور دوسرے قانونی ذرائع سے اپنی خفگی اور برہمی کا اظہار بھی اس میں شامل ہے۔

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے، اس کی بھی گنجائش ہے، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچاتا رہتا ہے، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا استفسار حال کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں نے یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گذرنے والا کہتا اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا، (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷۱) یہ بھی گویا احتجاج کا ایک طریقہ ہے، فقہاء نے بیوی کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر مہر فوراً قابل ادائیگی تھا اور شوہر نے ادا نہیں کیا، تو جب تک شوہر مہر ادا نہ کر دے، عورت کے لئے یہ درست ہے کہ وہ شوہر کو اپنے نفس پر قدرت نہ دے، یا شوہر کے گھر نہ جائے، اس کے باوجود اس کا حق نفقہ شوہر سے متعلق رہے گا، یہ بھی گویا احتجاج

ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کل احتجاج کی اکثر صورتیں ایسی ہیں، جو بیک وقت کئی طبقوں کے لئے سخت نقصان اور مضرت کا باعث ہوتی ہیں اور وہ قومی اور اجتماعی نقصان کا سبب بنتی ہیں، مثلاً یہی گاڑی کی ہڑتال ہے، یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے؛ لیکن ہڑتال میں جو ڈرائیور اور متعلقین شریک ہوتے ہیں وہ عام طور پر نہایت قلیل آمدنی کے حامل ہوتے ہیں، روز کمانے اور روز کھانے کے اُصول پر ان کی زندگی گذرتی ہے، خود ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آجاتی ہے؛ لیکن اجتماعی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کی مخالفت نہیں کر سکتے، دوسرا نقصان کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا ہوتا ہے، مال کی پیدائش جاری رہتی ہے اور اس کی ترسیل اور فروخت رکی رہتی ہے، بعض زراعتی اشیاء تو ایسی ہوتی ہیں کہ سڑنے لگتی ہیں اور بالکل ہی ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان دونوں سے بڑھ کر نقصان عوام کا ہوتا ہے، چوں کہ بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور سامان کی رسد کم ہو جاتی ہے، اس لئے قیمتیں غیر متوازن ہو جاتی ہیں، دس روپے کی چیز سو روپے میں فروخت ہوتی ہے اور لوگ اسے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام کے نظام تجارت میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قیمتوں میں توازن کو متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی لئے ''احتکار'' کو منع کیا گیا، احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، یعنی تاجر اشیاءِ ضروریہ کو خرید کر روک لے، بازار میں نہ لائے؛ تاکہ مصنوعی قلت پیدا کی جاسکے، اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں اور دو کی چیز دس میں فروخت کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کی سخت مذمت فرمائی ہے اور شدت سے منع کیا ہے، اسی طرح حدیثوں میں ''تلقی جلب'' سے منع فرمایا گیا ہے، ''تلقیِ جلب'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں عام طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، یہی ایک مارکٹ سے دوسری مارکٹ میں سامان کے پہنچنے کا ذریعہ تھے، ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شہر کو کوئی قافلہ آنے والا ہوتا تو چند سرمایہ کار شہر سے باہر نکل کر پہلے ہی سامان خرید کر لیتے اور کھلے بازار میں سامان پہنچ نہیں پاتا، اس طرح اشیاءِ ضرورت پر چند تاجروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی اور گرانی میں اضافہ ہوتا، یہ بھی ایسی

صورت ہے جو قیمتوں کے فطری توازن کو متاثر کر دیتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، اسی طرح کی ایک اور صورت بھی ہے، جس سے منع فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر آتے اور جلد واپس جانا چاہتے، اس لئے وہ اپنا مال نسبتاً سستا فروخت کرتے، عوام کو یہ فائدہ ہوتا کہ سامان سستا ملتا اور کاشت کاروں کو یہ فائدہ ملتا کہ درمیانی شخص اور بچولئے کے نہ رہنے کی وجہ سے ان کو پوری قیمت براہِ راست مل جاتی، شہر کے تاجروں کو یہ بات پسند نہ آتی تھی، وہ دیہات سے مال لانے والوں کو کہتے تھے کہ تو اپنا مال ہمارے حوالہ کر دے، ہم کچھ دنوں ٹھہر کر اسے بہتر قیمت میں فروخت کر دیں گے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ قیمتوں کے فطری اُتار کو روکا جائے، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، جس کو حدیث میں "بیع حاضر للبادی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان احکام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے طلب و رسد میں توازن برقرار رکھنے اور قیمتوں میں غیر فطری اتار چڑھاؤ کو روکنے کی کیا کچھ تدبیریں کی ہیں، ذرائع مواصلات یا کسی خاص شعبہ کی تجارت کی ہڑتال سے سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں غیر متوازی ہو جاتی ہیں، جہاں سامان کی پیدائش ہوتی ہے وہاں کاشتکار اور صنعت کار کو اصل لاگت بھی حاصل نہیں ہوتی اور دوسرے مقام پر عوام کو وہی چیز اصل قیمت سے دو چند؛ بلکہ کئی چند قیمتوں میں خرید کرنا پڑتا ہے، یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان اور قومی خسارہ ہے۔

اس سے زیادہ نازک صورت حال اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب لازمی خدمات کے کسی شعبہ میں احتجاج ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال، پوسٹ آفس کی ہڑتال وغیرہ، ان شعبوں سے انسان کی ناگزیر ضروریات متعلق ہیں، جن سے عوام کو محروم رکھنا نہایت ہی شقاوت قلبی اور ظلم کی بات ہے، اسلام میں انسان کی لازمی ضروریات کی بڑی اہمیت ہے؛ بلکہ خدا کی عبادت اور بندگی پر بھی اس کو ترجیح حاصل ہے، اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر وہ نماز نہیں توڑے گا تو کوئی شخص جل یا ڈوب جائے گا یا گر جائے گا تو نماز کا توڑنا اور اس شخص کی مدد کرنا واجب ہے، کم و بیش یہی احکام مال اور عزت و آبرو کی حفاظت سے

متعلق بھی ہیں، اس لئے عام لوگوں کو لازمی خدمات سے محروم کر دینا قطعاً جائز نہیں۔

احتجاج کی جو روایت ہمارے سماج میں پڑ چکی ہے، اس میں دونوں پہلو تکلیف دہ ہیں، احتجاج کرنے والے اوّل تو ناروا مطالبات پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے احتجاج کے لئے تکلیف دہ اور اجتماعی سطح پر معضرت رساں طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ بھی ناقابل فہم ہوتا ہے، آخر حکومت صلح کرتی ہے، "لو اور دو" کی بنیاد پر معاملہ طے کرتی ہے؛ لیکن "بعد از خرابیٔ بسیار!" اس طرح خود حکومت بھی عوام کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے، اسلام کا اُصول یہ ہے کہ ضرر و نقصان بہر قیمت دفع کیا جائے: "الضرر یزال" نیز اسلام کی نگاہ میں ایک شخص کے نقصان کے مقابلہ ایک جماعت اور ایک طبقہ کے نقصان کے مقابلہ پورے سماج کا نقصان زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ ہے، فقہاء لکھتے ہیں:

"اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضرر بارتكاب اخفهما" (الاشباہ:۴۴)

احتجاج ایک جائز حق ہے؛ لیکن ضروری ہے کہ اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہوں، وہ ایسا عفریت نہ بن جائے کہ غریب عوام کو نگل جائے اور قوم و ملک کو اجتماعی سطح پر ضرر پہنچنے کا باعث بن جائے۔

حفاظت خود اختیاری — اسلامی نقطۂ نظر!

انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا مالک نہیں، امین ہے، جان ہو یا مال اور عزت وآبرو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور اسے ان کا نگہبان بنایا گیا ہے، اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا کی ان نعمتوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ ان نعمتوں کو احکام شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کیا جائے اور محض اپنی خواہش کو رہنما نہ بنالیا جائے، دوسرے ان نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے، ایسی چیزوں میں خرچ کرنے سے بچا جائے جن کو شریعت نے ناپسند کیا ہے، تیسرے اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے۔

اسی لئے شریعت نے خودکشی کو بھی حرام قرار دیا؛ کیوں کہ انسان اپنی زندگی کا امین اور محافظ ہے، اس کا کام زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ ہلاکت، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے خودکشی کرنے والے شخص پر نماز جنازہ تک نہیں پڑھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں یہ کس قدر مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے، مالی نعمتوں کے بارے میں بھی اسی احتیاط اور قدردانی کی تعلیم دی گئی، اگر کوئی شخص نہر کے کنارے بیٹھا ہو، تب بھی آپ نے وضو میں اسراف اور فضول خرچی کو منع فرمایا، کیوں کہ یہ تقاضۂ امانت کے خلاف ہے، اسلام امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا نقیب ہے؛ لیکن اس امن کا جو سماج کے تمام افراد واشخاص اور طبقات کو عافیت فراہم کرتا ہو نہ یہ کہ ایک طبقہ کی بالادستی اور دوسرے کی مجبوری ولاچاری پر قائم ہو، اسی لئے اگر ایک شخص دوسرے شخص پر اور سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر زیادتی کرے، تو اسے اپنی مدافعت کا پورا پورا حق حاصل ہے؛ کیوں کہ یہی عدل کا تقاضا ہے اور حقیقی امن وہی ہے جس کی عمارت عدل وانصاف کی مضبوط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، اس سلسلہ میں قرآن مجید

کی تعلیمات بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے بلا وجہ آمادۂ پیکار ہوں، تم بھی ان سے اسی طرح مقابلہ کرو، ہاں البتہ ایسے جذباتی مواقع پر بھی انتقام کی رو میں بہہ کر ظلم وزیادتی کا راستہ اختیار نہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ بہر حال زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرمایا ہے: ''وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ''۔ (البقرۃ:۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اسی کے بقدر اس کا جواب دو: ''فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ'' (البقرۃ:۱۹۴) یہ مدافعت، مقابلہ اور ظالم کے پنجۂ ظلم تھامنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اسی میں امن کا بقاء اور انسانیت کا تحفظ ہے، قرآن مجید نے قتل کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر کے بدلہ کا قانون مقرر کیا ہے (البقرۃ:۱۷۸) اور اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ''وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ'' (البقرۃ:۱۷۹) کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ قاتل کو قتل کرنے میں ایک کے بعد دوسری جان کا ضیاع ہے؛ لیکن درحقیقت اس میں انسانی جانوں کی حفاظت اور قتل کے واقعات کا سدباب ہے۔

اگر کسی سماج میں ظلم کے لئے آگے بڑھنے والے ہاتھ ہوں؛ لیکن ان کو قلم کر دینے والی تلواریں نہ ہوں، لباسِ حیاء کو تار تار کر دینے والی آنکھیں ہوں؛ لیکن انھیں پھوڑنے والی انگلیاں نہ ہوں، بربریت کا راستہ اختیار کرنے والے قدم ہوں اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو قید میں لانے والی زنجیریں نہ ہوں، تو وہ سماج ظلم و بربریت کی آماجگاہ بن جائے گا اور عدل وانصاف کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے رختِ سفر باندھنا ہوگا، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ سماج کے اچھے لوگ ایسے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں اور جو لوگ مشقِ ستم بنائے جاتے ہوں، وہ طاقت بھر اپنی مدافعت کے لئے تیار رہیں، کہ اس سے صرف ان کی شخصی حفاظت ہی متعلق نہیں؛ بلکہ انسانیت اور انصاف کا تحفظ متعلق ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی اختیاری عمل نہیں؛ بلکہ ایسا کرنا اس پر شرعاً واجب ہے۔

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جان و مال، مذہب، اہل وعیال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والوں کو شہید قرار دیا، حضرت سعید بن زید سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا :

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد ، ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد . (ترمذی:۱۲/۲۶۱، باب ما جاء من قتل دون ماله فهو شهيد)

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مال ناحق لینے کی کوشش کی جائے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید ہے: "من اريد ماله بغير حق فقاتل فقتل فهو شهيد". (ابوداؤد:۲/۶۵۸، ترمذی:۱/۲۶۱)

جان کی حفاظت تو ظاہر ہے، مال کی حفاظت میں یقیناً دوکان، کاروبار، سواریوں وغیرہ کی حفاظت شامل ہے، دین کی حفاظت میں مساجد و مدارس، خانقاہیں، مسلمانوں کے مقابر اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا سب شامل ہیں؛ کیوں کہ یہ سب شعائر دین کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان سب کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے اور اگر ان کی حفاظت و صیانت میں کسی مسلمان کی جان جاتی ہے تو یقیناً وہ شہید ہے، اہل وعیال کی حفاظت میں ان کے جان و مال کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت بھی شامل ہے؛ کیوں کہ عزت و آبرو کی اہمیت انسان کے حق میں اس کی جان اور زندگی سے کم نہیں؛ بلکہ ایک غیرت مند انسان کے لئے بعض اوقات جان کا دیدینا، عزت و آبرو کی پامالی کو قبول کرنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

تحمل و بردباری الگ چیز ہے، بزدلی اور خود سپردگی الگ چیز، کسی بھی قوم میں بزدلی کا

پیدا ہو جانا، ایک ایسا مرض ہے جو اس کو میدان عمل میں تگ و دو سے روک دیتا ہے، شجاعت و بہادری، بلند حوصلگی، قوت ارادی کسی بھی زندہ قوم کے لئے ضروری وصف ہے، مسلمان مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں؛ لیکن مؤرخین نے سب سے زیادہ ماتم تاتاری فتنہ کا کیا ہے، تاتاریوں کے حملہ نے مسلمانوں کو صرف پسپا ہی نہیں کیا؛ بلکہ ان کو کم ہمت اور پست حوصلہ کر کے بھی رکھ دیا تھا اور نوبت یہ تھی کہ ایک ایک تاتاری عورت بیسیوں مسلمان مردوں کو کھڑا کر دیتی اور اپنے گھر سے ہتھیار لے کر آتی، پھر باری باری انہیں تہہ تیغ کرتی اور یہ مسلمان نہایت بزدلی اور دون ہمتی کے ساتھ قتل ہوتے رہتے اور مدافعت کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

اسی حق مدافعت کا نام ''حفاظت خود اختیاری'' ہے، جسے دنیا کے تمام مذہب اور جدید وقدیم نظامہائے قانون میں تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مقصد ظلم کو روکنا اور امن کو پائیدار بنانا ہے، نہ کہ امن کو پارہ پارہ کرنا اور دوسروں پر ظلم وجور کو روا رکھنا، حفاظت خود اختیاری کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہو تو ہم قصوروار و بے قصور اور مجرم و بے گناہ میں فرق کیے بغیر اس قوم کے لوگوں پر ہلہ بول دیں اور قتل و غارت گری مچائیں، اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اگر کچھ لوگوں نے اپنی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں کو بے آبرو کیا ہو تو مسلمان بھی ایسے ہی ناشائستہ اور غیر شریفانہ حرکت پر اتر آئیں، یہ وہی ''اعتداء'' یعنی حد سے گزر جانا ہے، جس کو قرآن مجید نے منع کیا ہے؛ لیکن جو لوگ واقعی مجرم اور قصوروار ہوں، ان سے اپنی حفاظت اور ان کے خلاف مناسب ردعمل ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، جس سے پہلوتہی کسی طور مناسب نہیں۔

حفاظت خود اختیاری کے مختلف ذرائع ہیں، اول خود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ ناگہانی حملوں کا مقابلہ کرسکیں اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت کے اسباب مہیا رکھنا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جن سے جسم میں توانائی پیدا ہو؛ چنانچہ آپ نے کشتی، دوڑ، گھوڑ سواری وغیرہ کو پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ طاقتور مؤمن کمزور مومن سے بہتر ہے: ''المومن القوی خیر

من المومن الضعیف " رسول اللہ ﷺ اسباب حفاظت کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ استنجاء کے لئے تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا؛ تا کہ کیڑے، مکوڑوں سے حفاظت ہو سکے، یہ رجحان کہ گھر میں سانپ مارنے اور کتوں کو بھگانے کے لئے لاٹھی تک میسر نہ ہو نہایت ہی غیر دانشمندانہ بات ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جو کچھ ہو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہو۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمان اپنے محلہ میں اجتماعی مدافعت اور حفاظت کا ماحول بنائیں، یعنی اگر ایک بے قصور شخص پر حملہ ہو، یا محلہ کے کسی مکان پر یلغار ہو جائے تو تمام لوگ جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کریں، ہر شخص اس کو اپنے آپ پر حملہ تصور کرے اور مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو، یہ بات کہ ہر آدمی اپنی باری کا انتظار کرے اور یکے بعد دیگرے خود سپردگی اختیار کرتا جائے، غیر دانشمندانہ، خود غرضی اور ہلاکت خیز بزدلی بلکہ خودکشی ہے، اجتماعی قوت مؤثر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شریک حال رہتی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہے: "ید اللہ علی الجماعة " البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسی اجتماعیت کی قیادت صالح، سنجیدہ اور دور اندیش لوگوں کے ہاتھوں ہو، نہ کہ شر پسند، بدمعاش اور مشتعل مزاج لوگوں کے ہاتھ میں، کہ ایسی صورت میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

حفاظت کا تعلق آبادیوں کی ہیئت سے بھی ہے، جہاں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول ہو اور مفسد مزاج لوگ امن کو درہم برہم کرنے کے درپے رہتے ہوں، وہاں خاص کر مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان آباد ہونا اور مسلم آبادی کے جزیرے بنانا ضروری ہے، اس سے وہ اپنی جان و مال، کاروبار اور عزت و آبرو ہی کی حفاظت نہیں؛ بلکہ اپنے عقیدۂ و ایمان اور تہذیب و ثقافت کی بھی حفاظت کر سکیں گے، اسی لئے حضرات انبیاءؑ کو ایسے شہروں سے، ہجرت کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، جہاں دین حق سے عداوت و عناد رکھنے، والوں کا غلبہ ہو اور اہل ایمان کو اپنی بستی بسانے کی تلقین کی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو مشرکین کے ساتھ اپنا رہن سہن رکھے میں اس سے بری ہوں۔

حفاظت کا تعلق قانون و آئین سے بھی ہے، یہ بدقسمتی ہے کہ قانونی پیشہ اختیار کرنے کا رجحان مسلمانوں میں کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر قانون ملکی کا شعور پیدا کریں، کون سے جرم پر کون سی دفعہ عائد ہوتی ہے؟ کس دفعہ کے تحت اپنا مقدمہ درج کرایا جائے؟ پولیس میں فرقہ پرست عناصر دھوکہ دینے اور مقدمہ کو کمزور کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کرتے ہیں اور شہادتوں کو کس طرح کمزور کرتے ہیں؟ مسلمانوں کو اس سے آگاہ ہونا چاہئے، یہ ناآگہی مجرموں کی جرأت بڑھاتی اور مظلوموں کی بیکسی میں اضافہ کرتی ہے۔

حفاظت کا تعلق قیادت سے بھی ہے، اس بدبختی پر جس قدر رویا جائے کم ہے کہ مسلمان نہایت تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے باوجود اپنے مشترک مسائل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا نہیں جانتے، اشتراک اور اجتماعیت سے قیادتیں بنتی اور اُبھرتی ہیں، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قیادت سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت وفرمانبرداری سے قیادت طاقتور ہوتی ہے: ''**لا جماعة الا بامارة ولا امارة الا بطاعة**'' جب آپ کا ایک یا ایک سے زیادہ لیڈر ہو، یا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم ہو اور اس کے ساتھ پوری قوم کا اعتماد اور تائید وتقویت ہو تو اس سے اس قیادت کا وزن حکومت میں اور دوسری قوموں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، اس کی بات سنی جاتی ہے، اس کی رائے کو وزن دیا جاتا ہے اور اس کی آواز کی قوت محسوس کی جاتی ہے، گجرات کے فساد نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہاں مسلمان قیادت کے فقدان کی وجہ سے فرقہ پرست حکومت اور پولیس نے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد سمجھا اور اس نے جوابدہی کے تصور سے خالی اور بے پردہ ہوکر مظالم ڈھائے، اگر ذرائع ابلاغ نے ان کے ان مظالم کو آشکارانہ کیا ہوتا تو پتہ نہیں اور کیا حال ہوتا۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ ساری باتیں شامل ہیں، جسمانی طور پر بھی حفاظت، قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت و بچاؤ کے اسباب کا مہیا رکھنا، مسلمانوں کا اپنی آبادیاں اور بستیاں بسانا، کسی حادثہ کے موقع پر اجتماعی طور پر حفاظت کے لئے ذہن کو تیار رکھنا، مسلمانوں میں جرم وسزا کے قانون کا شعور پیدا کرنا اور ایک مؤثر اور اجتماعی قیادت کو کم سے کم

مقامی سطح پر وجود میں لانا اور اسے تقویت پہنچانا، یہ سب دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر ہیں اور امکان بھر حفاظت کی تدابیر اختیار کرنا اور اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق مدافعت، دشمن کا مقابلہ اور ظلم سے پنجہ آزمائی صرف مصلحت کا تقاضا نہیں بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے۔

(۲۴ر مئی ۲۰۰۲ء)

مرض اور مریض — اسلامی تصور

ابھی گذشتہ ہفتہ ہم نے عالمی یوم صحت منایا ہے، بے شک صحت سے بڑھ کر اللہ کی کوئی نعمت نہیں اور بیماری سے بڑھ کر شاید کوئی آزمائش نہیں، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور انسانی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک مشغول آدمی کو مایوس، زود رنج اور ناہموار مزاج مریض کی عیادت و تیمارداری پر آمادہ کر سکے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں، ان میں آپ ﷺ نے مریض کی عیادت کا بھی ذکر فرمایا، ارشاد فرمایا کہ جب تک انسان کسی مریض کی عیادت میں مصروف رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغیچوں میں رہتا ہے، ایک موقع پر فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن انسان سے دریافت فرمائیں گے کہ اے فرزند آدم! میں بیمار تھا اور تم نے میری عیادت نہیں کی؟ انسان کہے گا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ بھی بیمار اور عیادت کے محتاج ہوتے ہیں؟ ارشاد ربانی ہوگا کہ اگر تم فلاں مریض کے پاس پہنچتے اور اس کی عیادت کرتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔

آپ ﷺ نے عیادت کو ایک انسانی فریضہ قرار دیا ہے، اس لئے اس میں مسلمان اور غیر مسلم، بڑے چھوٹے، مال دار اور غریب کا کوئی فرق نہیں، آپ ﷺ نے یہودی کی بھی عیادت کی ہے اور مشرک کی بھی عیادت فرمائی ہے، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ اگر کسی علاقہ میں وبائی مرض پھوٹ پڑے تو وہاں سے لوگ بھاگ کھڑے ہوں، کہ ایک تو بھاگنے والوں کے ذریعہ مرض کے جراثیم دوسرے علاقوں تک بھی پھیل جائیں گے، دوسرے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جو لوگ مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے لئے تیماردار اور دیکھ ریکھ کرنے والے نہیں رہیں گے، قرآن مجید نے بیماروں کے لئے خصوصی مراعات دی ہیں، ارشاد ربانی ہے: "وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ" (النور) ایک موقع پر قرآن نے خاص طور پر "نابینا" اور "لنگڑے" کا ذکر کیا کہ

ان پر کوئی حرج نہیں: ''لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ''۔(الفتح:۱۷)

بعض مذاہب میں بیماری کو پاپ کا لازمی نتیجہ سمجھا جاتا تھا، ہندو بھائیوں کے یہاں آواگون کا نظریہ ہے، اس نظریہ کے تحت انسان اس جنم میں جو کچھ تکلیف اٹھاتا ہے وہ پچھلے جنم کے گناہوں کا اثر ہے، اس سے مریض کے تئیں ہمدردی، محبت وخیر خواہی اور رحم دلی کے بجائے نفرت کا جذبہ اُبھرتا ہے، اسلام نے بتایا کہ بیماری اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے، ضروری نہیں کہ گنہگار ہی بیمار پڑے، اللہ کے نیک بندے بھی بیمار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بیماری سے انبیاء ورُسل بھی دوچار ہوتے ہیں؛ بلکہ بعض دفعہ صالحین اور اللہ کے نیک بندوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے انسانی زندگی کے امانت خداوندی ہونے کا تصور پیش کیا، اسی لئے آپ ﷺ نے خودکشی کو حرام اور سخت گناہ قرار دیا، آج تو عدالتیں بھی خودکشی کی اجازت دینے کو آمادہ ہیں؛ لیکن اسلامی ہی نہیں، اخلاقی اور انسانی نقطہ نظر سے بھی یہ ایک سانحہ کا درجہ رکھتا ہے، اسلام نے اس وقت سے انسان کا تحفظ کیا ہے جب کہ وہ ابھی عالم رنگ وبو میں آیا بھی نہ ہو، اسی لئے اس نے معاشی مقصد کے تحت اسقاطِ حمل کو منع کیا، آپ ﷺ نے انسانی آبادی کی افزائش کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، معاشی اندیشوں کے تحت آبادی کی روک تھام کا تصور کچھ نیا نہیں ہے، اسلام سے پہلے بھی عربوں کے یہاں ایسا تصور موجود تھا، قرآن مجید نے اس کی مذمت کی اور فرمایا گیا کہ بھوک اور فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو: ''لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ'' (بنی اسرائیل:۳۱) فیملی پلاننگ کے پیچھے جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ غذائی وسائل محدود ہیں، اگر انسانی آبادی غیر محدود طور پر بڑھتی چلی جائے تو انسان کے لئے بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی ممکن نہیں رہے گی؛ لیکن یہ محض اندیشہ ہائے دور دراز کا درجہ رکھتا ہے اور حالات نے اس کی غلطی کو اظہر من الشمس کردیا ہے، فیملی پلاننگ کے نظریہ کے بانی مالتھوس کی پیشین گوئی کے مطابق آج لوگوں کو بھوکوں مرنا چاہئے تھا؛ لیکن ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ کھانے، پینے، لباس وپوشاک، سفر کے وسائل اور رہن سہن کے اعتبار سے معیار

زندگی میں ایسا اضافہ ہوا کہ آج سے ۲۵ سال پہلے اس کا تصور بھی دشوار تھا، حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے وسائل معاش میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور زمین ایسے ایسے وسائل ثروت کو اگل رہی ہے کہ نصف صدی پہلے کسی نے اس بارے میں سوچا بھی نہ ہوگا۔

آج قتل انسانی کے لئے بھی لوگوں نے نئے نئے عنوان تلاش کئے ہیں اور خوبصورت ناموں کے ذریعہ ان کو جائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس قسم کی ایک ناروا صورت وہ ہے جس کو ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کا عنوان دیا گیا ہے، یعنی جو شخص طویل عرصہ سے بیمار ہو یا تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو، اس کو ادویہ کے ذریعہ موت کی نیند سلا دیا جائے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، کوئی مرض نہیں کہ خدا نے اس کے علاج کی تدبیریں پیدا نہ کی ہوں، معالج کا کام ان تدبیروں کو تلاش کرنا ہے نہ کہ مریض کی زندگی کو بچانے کے بجائے اس کے لئے سامان ہلاکت کا فراہم کرنا، آپ ﷺ نے خودکشی کو بہر حال حرام قرار دیا، ان تعلیمات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی کی کیا حرمت اور اہمیت ہے؟

انسانی صحت وحیات کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے آپ ﷺ نے اطباء اور معالجین کے لئے بھی ضابطے مقرر فرمائے، جو لوگ فن طب سے کما حقہ واقف نہ ہوں، علاج ومعالجہ کی مہارت نہ رکھتے ہوں اور کسی مریض کا علاج کرنے میں ان کو نقصان پہنچادیں تو آپ ﷺ نے ان کو اس نقصان کا ذمہ دار اور ضامن قرار دیا ہے: ''من تطبب ولم يعلم منه طب فهو ضامن''۔

علاج اور صحت انسانی کے مسئلہ کو آپ ﷺ نے ایسی اہمیت دی کہ از راہِ علاج ان چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو عام حالات میں جائز نہیں ہیں؛ لیکن یہ اجازت اس وقت ہے کہ حلال چیز کی صورت میں اس کا کوئی متبادل نہ مل سکے۔

مریض کے لئے ایک اہم مسئلہ راز کی حفاظت کا ہے، بعض دفعہ انسان ایسے مرض میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، آپ ﷺ نے غیبت کے سلسلہ میں جو اُصول بتائے ہیں وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں، غیبت انسان کے جسمانی، فکری یا اخلاقی وعملی

عیب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کا نام ہے، یہ حرام و گناہ ہے، آپ ﷺ نے اس سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ معالجین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ایسے امراض کے معاملہ میں امانت کا ثبوت دیں اور پردہ پوشی سے کام لیں، جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو؛ البتہ اگر کسی شخص کو نقصان اور دھوکہ سے بچانا اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس شخص کی حد تک مرض کا افشاء جائز ہے، خود آپ ﷺ سے ایسے شخص کے سامنے عیب کا اظہار ثابت ہے جو اس سے رشتہ کرنا چاہتا تھا، یہی اسلام کا توازن و اعتدال اور اس کا اصل امتیاز ہے۔

(۱۶/اپریل ۱۹۹۹ء)

✿ ✿ ✿

ایڈز — حقیقی حل کیا ہے؟

کل ۲/دسمبر کی تاریخ تھی، اس تاریخ کو بین الاقوامی سطح پر ایڈز کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ایڈز ایک ایسی بیماری کی حیثیت سے ہمارے سماج میں معروف ہے کہ جس سے لوگ شاید درندہ جانور سے بھی زیادہ خوف کھاتے ہوں، کہا جاتا ہے کہ اس کے جراثیم کا ادراک پہلی بار ۱۹۸۳ء میں فرانس میں ہوا، ابتداءً یہ مرض ان لوگوں میں پایا گیا جو ہم جنسی جیسی بدترین برائی میں مبتلا تھے، اس مرض کی شناخت میں کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے مرض کی دریافت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے، ہندوستان میں پہلی دفعہ اس کا مریض ۱۹۸۶ء مدراس میں دریافت ہوا، یہ مرض ایک ہولناک سیلاب کی طرح بڑھتا جارہا ہے، دسمبر ۱۹۸۲ء میں عالمی تنظیم صحت کا اندازہ تھا کہ ایک کروڑ تیس لاکھ افراد اور دس لاکھ بچے ایڈز کے جراثیم کے حامل ہیں، روزانہ پانچ ہزار نئے انفیکشن زدہ افراد وجود میں آتے ہیں اور ہر اٹھارہ سکنڈ میں ایک نیا فرد انفیکشن سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۹۹۲ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں سرکار کی حاصل شدہ رپورٹ میں گیارہ ہزار افراد اس مرض سے متاثر تھے؛ لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے بموجب غیر دریافت شدہ افراد کو لے کر ان کی تعداد گیارہ لاکھ سے کم نہ تھی، ہندوستان میں مہاراشٹر، دہلی اور تمل ناڈ میں متاثرین کا اوسط سب سے زیادہ ہے، سروے اور اعداد وشمار کے ذریعہ یہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طبقہ میں اسکا کیا اثر ہے؟ چنانچہ اس مرض کے جراثیم ۱۵ فیصد طوائف میں، ۵ تا ۷ فیصد ان سے اختلاط رکھنے والوں میں، ۲۰ فیصد ہم جنسی سے ملوث مردوں میں اور ۵۰ فیصد ڈرگ استعمال کرنے والے مردوں میں اور دوسرے طبقوں میں اس سے کم پائے گئے ہیں، بنیادی طور پر ۴۱ فیصد سے زیادہ غیر قانونی اور غیر فطری جنسی تعلقات اس کا سبب

بنے ہیں اور ۱۵ فیصد سے زیادہ خون کی منتقلی نے اس مرض کو جنم دیا ہے، یہ بھی گویا بالواسطہ اصل مریضوں ہی سے متعدی ہو کر مرض پھیلنے کی صورت ہے، یہ ایک ایسی خطرناک صورت حال ہے جو یقیناً کسی سمندری طوفان سے کم گھبرا دینے والی نہیں، ہر چند کہ ابتداءً اس مرض کا غلبہ مغربی ممالک میں تھا؛ لیکن اب مشرقی ممالک میں بھی اس عفریت نے اپنی جگہ بنالی ہے، بالخصوص مہاراشٹر اور تمل ناڈو میں جسم فروشی اور منی پور، میزورم اور ناگالینڈ میں انٹروینس ڈرگ کی وجہ سے یہ بیماری نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اس مرض کی پیدائش تو غیر اخلاقی رویہ کی وجہ سے ہوتی ہے؛ لیکن آگے یہ مرض مختلف اسباب کے تحت متعدی اور منتقل ہوتا رہتا ہے، خون کی منتقلی سے، اعضاء کی پیوند کاری سے، اس مریض کے جسم میں لگائی گئی سوئی کے استعمال سے، بعض اوقات استرے اور بلیڈ سے، مادہ منویہ کی مصنوعی تخم کاری سے، شوہر و بیوی کو ایک دوسرے سے، مریضۂ ایڈز کے بچہ میں موروثی طور پر، یہاں تک کہ اگر موت کے بعد لاش کو مردہ خانہ میں رکھا جائے تو لاش میں بھی ایک ہفتہ تک یہ جراثیم موجود ہوتے ہیں، اسی لئے ایڈز سے مرنے والوں کو پلوتھنگ کی دو چادروں کے درمیان اس طرح لپیٹنے کی ہدایت دی جاتی ہے کہ دونوں کے درمیان کورائیڈ اور چونے کا پاوڈر ہو۔

ایڈز نے اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سے فقہی سوالات کو بھی اُبھارا ہے، مثلاً یہ کہ جو شخص ایڈز کا مریض ہو، اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے متعلقین کو اس سے مطلع کر دے اور انتقال مرض کے اسباب سے بچے اور بچائے، یا عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرے؟ ایڈز کے مریض کے بارے میں معالج کا فریضہ کیا ہے؟ مریض کے راز کی حفاظت معالج کا فریضۂ منصبی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس مریض کے راز کو چھپائے رکھے، دوسری طرف اگر اس میں پردہ داری کی جائے تو بہت سے لوگوں کو اور سماج کو اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اجتماعی نقصان انفرادی نقصان سے بہر حال اہم ہے، پھر ایسے مریضوں کے بارے میں خود سماج کی کیا ذمہ داری ہے؟ تیمارداری، دیکھ ریکھ، مذہبی اور عوامی تقریبات میں ایسے مریضوں

کی شرکت کا کیا حکم ہوگا ؟ کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہاسٹل بنادیئے جائیں ، جیسا کہ بعض فقہاء نے کوڑھ کے مریضوں کے لئے ہاسٹل کا مشورہ دیا ہے (فتح الباری : ۶۱۳/۱۰) اگر ایڈز کا مریض قصداً کسی اور کو بیماری منتقل کرے تو کیا اس پر تاوان واجب ہوگا ؟ شوہر کو ایڈز ہو تو کیا بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ ایڈز زدہ عورت کا حمل ساقط کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو بچے اس مرض میں مبتلا ہوں ، ان کی تعلیم و تربیت کیوں کر انجام پائے اور کیا ایڈز کے احکام وہی ہیں جو مرض وفات کے ہیں؟ یہ نہایت اہم فقہی سوالات ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہیں ، راقم الحروف نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' (مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند) میں ان سوالات پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

لیکن یہ سوالات ان لوگوں سے متعلق ہیں جو خدانخواستہ اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں ، جو لوگ محفوظ ہوں ، ان کے لئے ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا ؛ کیوں کہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس کے امانت ہونے کا تقاضا ہے کہ ایسے اسباب وعوامل سے بچا جائے جو جسم کو نقصان پہنچائیں یا اس کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنیں ، سب سے پہلی احتیاط تو ظاہر ہے کہ بے حیائی سے باز رہنا ہے ، اسلام میں جس قدر سخت سزا ''زنا'' کی رکھی گئی ہے ، ارتداد کی بھی نہیں رکھی گئی ، یعنی شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے لگائے جائیں ، دوسری سزا کا ذکر قرآن میں ہے (النور : ۲) اور پہلی سزا بکثرت احادیث میں مذکور ہیں اور خلافت راشدہ سے آخری اسلامی عہد حکومت تک اس کا تعامل رہا ہے ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زنا سے بچو کہ اس سے چار باتیں ہوتی ہیں ، چہرے سے رونق کا ختم ہو جانا ، رزق کی تنگی ، اللہ کی ناراضگی اور جہنم کی ہمیشگی ، (مجمع الزوائد عن ابن عباس : ۲۵۵/۶) یہ بات قابل توجہ ہے کہ بشمول ایڈز کے زنا کی وجہ سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں ، وہ چہرہ اور جسم کو بدہیئت بنا دیتے ہیں ، جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حدیثوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو دنیا میں بھی عذاب

خداوندی کا باعث بنتے ہیں، ان میں ایک زنا بھی ہے، بعض روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ جب زنا کی کثرت ہوگی، تو ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی کہ جن کے بارے انسان نے کبھی سنا بھی نہ تھا، یقیناً آتشک، سوزاک، ایڈز وغیرہ اس کی کھلی ہوئی مثال ہیں اور حضور ﷺ نے اس کو بھی علامات قیامت میں سے شمار فرمایا ہے کہ سود، زنا اور شراب نوشی کی کثرت ہو جائے (طبرانی عن ابن مسعودؓ) اسی طرح فعل خلاف فطرت جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت ہے وہیں صحت انسانی کے لئے بھی مہلک و جان لیوا ہے اور اطباء اس بات پر متفق ہیں، خدا کی نگاہ میں یہ فعل کتنا شنیع اور یہ برائی کتنی سنگین اور بدترین ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر خاص اسی کی وجہ سے عذاب خداوندی نازل ہوا اور پوری قوم کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

قانون قدرت اور قانون شریعت کی مطابقت پر بھی غور کیجئے کہ شریعت نے زنا کی ایسی سزا رکھی ہے جس کی اذیت پورے جسم سے متعلق ہے، چاہے کوڑے مارنے کی سزا ہو یا سنگسار کرنے کی اور زنا کی وجہ سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی انسان کے پورے وجود پر اثر انداز ہوتی ہیں، ایڈز اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، جو پورے جسم کی قوت مدافعت کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے اور چہرے کی بے رونقی سے لے کر جسم کا ایک ایک انگ اس سے متاثر ہوتا ہے، یہ گویا قدرت کی طرف سے بدکاروں کی سرزنش کا ایک الٰہی نظام ہے، انسان اللہ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو نافذ کرنا جب چھوڑ دیتا ہے تو قدرت سرزنش کے نظام کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

اس مرض کے منتقل ہونے کے جو دوسرے اسباب ہیں، یعنی خون کی منتقلی وغیرہ شرعاً اس سے بھی احتیاط واجب ہے؛ کیوں کہ یہ بے احتیاطی انسان کی ہلاکت کا موجب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ انسان اپنے آپ کو ہلاک کر لے، ارشاد ربانی ہے: "لا تقتلوا انفسکم"۔ (النساء:۲۹)

حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ جہاں طبی تدابیر اختیار کرے، وہیں اس راستہ کو بند کرنے

کی کوشش کرے جہاں سے بیماری در آرہی ہے، وہ اس اخلاقی بحران پر قابو پائے جس کی سوغات مغرب نے ہمیں دی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک میں (اور کم وبیش یہی حال پوری دنیا میں ہے) ایڈز کو روکنے کی مہم چلائی جارہی ہے؛ لیکن دوسری طرف ایڈز کے محرکات اور اصل اسباب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں ہے، زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بدکاری کو "محبت" کا نام دیا جاتا ہے، اختلاط کی ممانعت کو دقیانوسیت کہا جاتا ہے، بعض ملکوں میں ہم جنسی بلکہ ہم جنس شادی کو قانونی جواز عطا کردیا گیا ہے، اخبارات میں اشتہار اس بات کے نہیں آتے کہ لوگ غیر قانونی جنسی اتصال سے بچیں؛ بلکہ ترغیب دی جاتی ہے کہ محفوظ طریقے اختیار کئے جائیں، منشیات کا بازار گرم ہے، اس پر نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے —— یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے اور بے حسی کی آخری حد ہے کہ خدا کا خوف تو گناہوں سے باز رکھنے میں مؤثر تھا ہی نہیں؛ لیکن اب خدا کی کھلی ہوئی تنبیہ اور آنکھوں دیکھی مضرت و ہلاکت بھی آنکھیں کھولنے سے قاصر رہ جائے اور اب بھی انسان گناہ کے دلدل سے باہر نہ آئے؛ بلکہ گناہ سے بچنے کی بجائے گناہ کے محفوظ طریقے تلاش کرے۔

(۳؍دسمبر ۱۹۹۹ء)

حق آزادی اور اس کی حدیں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن وہ نقل وحرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس وشعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور واحساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل وحرکت کی قوت ہے —— جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کر دئے جائیں، نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگا دیں، انھیں کوئی انکار نہیں اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی اعلیٰ تر مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انھیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ ان سے مختلف ہے، شیر اور ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق وار کرنے یا راہِ فرار اختیار کرنے سے نہیں چوکیں گے اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور اور فہم وادراک کی ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سوواں حصہ بھی حاصل نہ ہو، اس لئے انسان میں آزاد رہنے

کا جذبہ زیادہ ہے اور اس کی فطرت غلامی سے اباء کرتی ہے، انسان کے نومولود شیر خوار بچہ کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضرور ہی احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں رہ سکتا اور مزاج و مذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون وطمانیت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اور وہ سلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظامِ حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانونِ فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو عالم اسلام کے سفیر صحابی رسول نے رستمِ ایران کے دربار میں کہے تھے اور ان پر اپنا مقصد ومنشاء واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں: ”اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة اللہ۔ (البدایہ والنہایہ: ۳۹/۷)

انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کو فرمایا کہ ان کو ان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا، تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا ہے؟ یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان واظہار ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، اس لئے آزادی ایک انسانی اور اسلامی حق ہے۔

آزادی کے تصور کو طاقت پہنچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، محض رنگ ونسل، خاندان ونسب اور علاقہ ووطن کی بنیاد پر ان میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں، بہتری اور کہتری انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے: ”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ“ (الحجرات: ۱۳)—— یہ وہ بنیادی

تصور ہے جس کے بعد ایک انسان کا پیدائشی طور پر حکمراں اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہتیں قائم تھیں، روم، ایران، حبش، یمن، ہندوستان، غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کو حکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا، ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کرتے تھے، مغرب میں رفتہ رفتہ کلیسا نے انسان کو اپنا مکمل غلام بنالیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کو لوگوں کی آخرت کا ٹھیکیدار تصور کرتے تھے؛ بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کو خدائی فیصلہ باور کرتے تھے، اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کر دیا گیا تھا، ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اور لوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے اور دوسری طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر نہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے اور جو ان کی رائے سے سرمو انحراف کرتا ان کو لرزا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا اور زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی، بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس پر یہ ظالمانہ کلیسائی نظام یورپ سے ختم ہوا، گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی، اس لئے یورپ میں جو انقلابی تحریکیں اُٹھیں ان کا خمیر مذہب کی مخالفت اور عناد سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کو سند جواز عطا نہیں کیا اور ایک ایسی آزاد طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا، جس میں رنگ ونسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پر فرمانرواں کا انتخاب عمل میں آئے اور پھر یہ بھی بتادیا کہ حکمراں کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے، اس کے فیصلے غلط بھی ہو سکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حق حکمرانی ''اتفاق'' سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہو جائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے؛ بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور اکتساب سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور اُبھرتا ہے اور غلامی کی نفی ہوتی ہے۔

پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کر دیا جائے تو اس کے وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء:۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم وکرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (النساء:۲۹) —— پھر کسب معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آرہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے، ہاں! اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جاسکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت وآبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے: "لَا يَسْخَرْ قَومٌ مِّن قَوْمٍ" (الحجرات:۱۱) عدل وانصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران ومحکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ پیمانہ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے: "وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا" (المائدہ:۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطاء کی گئی اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران:۱۰) ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے:

"لا يحب الله الجهر بالسوء من القول الا من ظلم"۔ (النساء:۴۱)

اسلام ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، کہ وہ اپنے ضمیر واعتقاد کے

مطابق خود زندگی گذاریں: ''لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) سزا کے نظام میں بھی مساوات و برابری اور ہر بالغ و مکلف کے لئے یکساں سزا رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کی ایک معزز خاتون کا ہاتھ چوری کے جرم میں کٹوایا اور اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سفارش کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی اس کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی گئی ہوتی، اسلام نے ایک ایسے نظامِ مملکت کا تصور دیا جو شورائیت پر مبنی ہو: ''وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ''۔ (الشوریٰ:۳۸)

غرض اسلام ایک ایسے سیاسی نظام کا نقیب و ترجمان ہے جو غلامی کے بجائے آزادی پر مبنی ہو، جو انسانی تفریق کے بجائے مساوات پر قائم ہو، جس میں رنگ و نسل کے بجائے اخلاق و کردار کو تولا جاتا ہو، جس میں انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، جس میں اصحاب اقتدار کے احتساب کی اسی قدر گنجائش ہو، جتنی ایک ادنیٰ رعایا کی، اور جو انسانی کرامت و شرافت کے بنیادی تصور پر استوار ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزادی کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ضروری ہیں، سڑک پر ہر شخص کو چلنے کا حق ہے؛ لیکن اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ آزادی ان کو ٹریفک کے قواعد سے بھی آزاد کرتی ہے تو یقیناً یہ آزادی پروانۂ ہلاکت بن جائے گی، اس لئے آزادی کے بھی دائرے ہیں اور یہ دائرہ اخلاقی اقدار کا ہے، آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اخلاق کے بندھن ٹوٹ جائیں، جو شرم و حیاء کے الفاظ کو انسانی ڈکشنری سے مٹا کر رکھ دے، جو انسان کو ظلم و استبداد کے لئے آزاد کر دے، جو فطرتِ انسانی کی تسلیم شدہ حقیقتوں پر بھی خطِ نسخ پھیر دے، یہ آزادی رحمت نہیں؛ بلکہ زحمت ہے اور سامانِ عافیت نہیں؛ بلکہ ابتلاء و مصیبت ہے، افسوس کہ مغرب میں کلیسائی نظام کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس نے مذہب بے زاری کی ایسی برقی رو دوڑا دی کہ جس نے فکر و نظر کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے اور لوگوں نے سمجھا کہ آزادی یہ ہے کہ انسان مادر و پدر سے آزاد ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمہ اخلاقی قدروں کو بھی غلامی کی علامت سمجھ لیا گیا، مخرب اخلاق اسباب کو بھی آزادی کا پروانہ دیدیا گیا اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہوگئی کہ وہ اپنے

پیکر آزادی پر اخلاق و شرافت کی قید و بند کا کوئی تار لباس باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام و تدبیر انسان کے ہاتھ میں رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی: ''اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ '' (یوسف:۴۰) کیوں کہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کی حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی، یہ آزادی کا ایک متوازن، معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے؛ بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بننا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے، تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی اسے قبول کرنی ہوگی، اسی کو مردِ حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰ر اگست ۲۰۰۱ء)

آزادیٔ تحریر یا آوارہ خیالی؟

خشونت سنگھ ہمارے ملک کے معروف اور کہنہ مشق صحافیوں میں ہیں، چبھتا ہوا طنز اور مخالف کو مشتعل کر دینے والی تعریض اگر فن کا کمال ہو تو اس کمال میں کم اہل قلم ہیں جو ان کی ہمسری کر سکیں؛ لیکن آزاد خیالی بلکہ آوارہ خیالی کی وجہ سے ان کی تحریریں اکثر نزاع کا باعث بنتی رہتی ہیں، انسان کی عملی اور فکری وابستگی کے جتنے مرکز ہیں ان میں سب سے زیادہ مقدس مذہبی وابستگی ہے، ہر شخص اپنے دین و دھرم کے مقابلہ میں بہت جذباتی اور حساس ہوتا ہے، اس لئے ہر سلیم الفکر معاشرہ ایک دوسرے کے مذہبی احساسات کے احترام اور رعایت پر مبنی ہے، خشونت سنگھ چوں کہ دہریہ ہیں، اور فکری اعتبار سے مادر پدر آزاد ہیں، اس لئے شرافت اور انسانیت کے اس عمومی احساس سے بھی محروم ہیں، اس لئے اپنے قلم ناز سے بہتوں کو گھائل کرتے رہتے ہیں، کبھی ہندوان کا نشانہ بنتے ہیں، کبھی سکھ اور کبھی مسلمان، کبھی کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو ہدف بناتے ہیں یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے؛ لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں، آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں؛ لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہر حال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑے اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کر دے، اس کا نام آزادی نہیں؛ بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے، افسوس کہ خشونت سنگھ جس آزادیٔ صحافت کے علمبردار اور حریت فکر کے دعویدار ہیں، وہ کسی قسم کے اُصول و قواعد اور شرافت و سنجیدگی سے آزاد صحافت ہے۔

ابھی حال ہی ان کا ایک ناول The Company of Woman یعنی عورتوں کی

صحبت، کے نام سے لکھی ہے، ظاہر ہے کہ اس نام سے ہی بے حیائی اور بے شرمی جھلکتی ہے، قارئین اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی بے ہودہ قسم کا ناول ہے، اس میں مرد و عورت کے شہوانی جذبات، شہوانی افعال یہاں تک کہ جسم کے حساس اعضاء کی بھی بہت بے حجابانہ تصویر کشی کی گئی ہے، ہمارے ملک میں ایشین اتیج اس قسم کی تحریروں کی تشہیر و اشاعت کے لئے معروف ہے، اسی نے اس ناول کا خلاصہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو شائع کیا ہے، اس فرضی کہانی میں پاکستان کی ایک مسلم خاتون اور ہندوستان کے ایک غیر مسلم نوجوان کا بنیادی کردار ہے، اس میں اس عورت کی زبان سے ہندو مذہب کے کمزور اخلاقی پہلوؤں کو سوالات کے ذریعہ ابھارا گیا ہے، جو یقیناً ہندو بھائیوں کے لئے ایک تکلیف دہ بات ہے، پھر اسلام پر کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں، حجر اسود کے بوسہ لینے کو بت پرستی کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے، پھر یہ فحش منظر بھی پیش کیا گیا ہے کہ کہانی کے یہ دونوں کردار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور بدکرداری کرتے ہیں اور اس برائی کے درمیان وہ عورت اپنے گلے میں آیات قرآنی کا نکلس لٹکائے رہتی ہے اور یہ عورت کہتی ہے کہ وہ عمرہ کر کے اس گناہ کا کفارہ ادا کر دے گی، یہ بات بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ وہ پابند نماز عورت ہے۔

ان مضامین کی بے ہودگی اور ناشائستگی ظاہر ہے کہ اس میں ہندو مذہب کا بھی مذاق اُڑایا گیا ہے اور مسلمانوں کے جذبات کو تو بہت ہی ٹھیس پہنچائی گئی ہے، عمرہ جیسی عبادت کا تمسخر اور ایک پابند نماز خاتون کی بے عزتی کی گئی ہے، ایک کہنہ مشق، جہاں دیدہ اور معروف صحافی سے ایسی اوچھی حرکت کا صدور اور ایسی ناپاک تحریروں کی تخلیق نہ صرف خشونت سنگھ کے لئے شرمناک ہے؛ بلکہ اس سے تمام ہندوستانیوں کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے کہ ہندوستان کی شرم و حیاء اور عفت و عصمت ضرب المثل رہی ہے، جو ملک سیتا کی عفت و پاک دامنی کا امین ہو وہاں علانیہ شہوت انگیز فرضی کہانیاں اور مخرب اخلاق ناول لکھے جائیں تو اس سے زیادہ قابل افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسلامی نقطۂ نظر ان اُمور کے بارے میں بالکل واضح اور بے غبار ہے، قرآن اس بات

کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ایسی بات کہی جائے جو ان کے ماننے والوں کے لئے اشتعال اور دل آزاری کا باعث ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ '' (الانعام:۱۰۸) یعنی مشرکین جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ معاشرہ کو اشتعال اور نقض امن سے بچایا جائے اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو سماج کے کسی طبقہ کے لئے اذیت اور تکلیف کا باعث ہو۔

شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی برائی وقوع پذیر بھی ہوئی ہو، تو اس کا چرچا کرنے سے بچا جائے؛ کیوں کہ برائی کے ذکر سے بھی برائی پھیلتی ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہو تو کوڑوں کی سزا کے علاوہ آپ نے اسے ایک سال کے لئے شہر بدر کر دینے کا بھی حکم فرمایا، مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو موضوع گفتگو بنا رہے گا، اور لوگ اس کی برائیوں کا بھی ذکر کرتے رہیں گے، اس طرح برائی کا چرچا عام ہوگا اور معاشرہ میں برائی پھیلے گی، اسی طرح اگر کوئی بدبخت جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس جانور کو ذبح کر کے جلا دو۔ ظاہر ہے کہ اس میں جانور کا کوئی قصور نہیں؛ لیکن مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اسی ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو لوگ انگشت نمائی کریں گے، اس طرح ایک برائی کا ذکر عام ہوگا اور جب کسی برائی کا چرچا بکثرت ہونے لگتا ہے تو مریضانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ خود اس برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کے سدباب کے طور پر آپ نے جانور ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ تو ان برائیوں کا ذکر ہے جو واقعی پیش آئی ہوں، فرضی کہانیوں کے ذریعہ کسی برائی کو پھیلانا اور اس کے چرچا کو عام کرنا تو ظاہر ہے کہ بہت شدید درجہ کا گناہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کوئی خلاف واقعہ بات کہے، مقصد بدنیتی نہ ہو؛ بلکہ لوگوں کو ہنسانا ہو، تو یہ بھی اس کے لئے رحمت خداوندی سے محرومی کا باعث ہوگا، (دیکھئے: مجمع الزوائد: ۸/۸۹، باب ما جاء فی المزاح) اس سے ظاہر ہے کہ تفریحی مقاصد کے لئے بھی خلاف واقعہ بات کہنا اور فرضی واقعہ نقل کرنا درست نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان

رکھتا ہو، وہ یا تو بھلی بات کہے، یا خاموش رہے، کہ اللہ تعالیٰ دنیا سے بے نیازی برتنے والے بردبار اور زبان کی حفاظت کرنے والے شخص کو پسند فرماتے ہیں اور بدزبان فاجر، الحاح کے ساتھ مانگنے والے کو ناپسند فرماتے ہیں، (مجمع الزوائد: ۸/۶۷) فضول گوئی سے بہتر زبان وقلم کو خاموش رکھنا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی: ''من صمت نجا'' (ترمذی) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خاموشی میں کئی حکمتیں ہیں؛ لیکن کم لوگ ہیں جو اسے اختیار کریں: ''الصمت حکم وقلیل فاعله'' (احیاء العلوم ۳/۱۰۸) ایک روایت میں ہے کہ جب تم کسی مومن کو دیکھو کہ وہ خاموش اور باوقار ہے تو اس سے قربت اختیار کرو، کیوں کہ وہ حکمت کی باتیں بتائے گا: ''اذا رئیتم المومن صموتا وقورا فادن منه ، فانه یلقن الحکمة''۔ (ابن ماجہ)

بدزبانی اور بدگوئی اسلام کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے بہت شدت سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتے: ''ایاکم والفحش ، فان اللہ تعالیٰ لا یحب الفحش ولا التفحش'' یہاں تک کہ بدر میں جو مشرکین قتل کیے گئے ، رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو تو تمہاری بات نہیں پہنچے گی؛ لیکن ان کے جو پسماندگان زندہ ہیں، ان کے لئے یہ بات اذیت کا باعث ہوگی، پس بدگوئی قابل ملامت ہے۔ (احیاء العلوم ۳/۱۲۱)

اس لئے گو کسی شخص کا عمل خراب ہو؛ لیکن ناحق اس کے تذکرہ کو اسلام پسند نہیں کرتا ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ اس کی بدکلامی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہو، اسلام کے جو اُصول ابھی پیش کیے گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مذہب، ہر مہذب قانون اور ہر شریف معاشرہ اس سے متفق ہوگا؛ کیوں کہ اس کے بغیر سماج کے امن وامان کی برقراری ممکن نہیں، اس طرح کی تحریریں لکھنا قلم کی آزادی نہیں؛ بلکہ قلم کی آوارگی کے دائرہ میں آتی ہے اور ضروری ہے کہ ایسی چیزوں پر قانونی اعتبار سے بھی روک لگے اور صحافتی برادری بھی ایسے اہل قلم کا نوٹس لے اور صحافت جیسے پاکیزہ پیشہ کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے۔ (۲۱؍جنوری ۲۰۰۱ء)

ووٹ ــــــ اسلامی نقطۂ نظر

ملک میں الیکشن کا عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ علاقوں میں لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کر چکے ہیں اور ہمارے شہر میں کل لوگ اپنے اس حق کا استعمال کریں گے، مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم انتخاب اور رائے دہی کے اس عمل کے بارے میں اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر جاننے کی کوشش کریں؛ کیوں کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی بابت رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ووٹ کے بارے میں بھی اسلام کے اُصولی احکام سے ہمیں روشنی ملتی ہے، جب کوئی شخص انتخاب میں اُمیدوار بنتا ہے تو وہ بنیادی طور پر دو باتوں کا مدعی ہے، اول اپنی امانت و دیانت کا، دوسرے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا، حضرت یوسف ؑ نے جب حکومت مصر کے سامنے بارِ قیادت اُٹھانے کی پیشکش کی تھی تو فرمایا تھا: ''اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ، اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ '' (یوسف:۵۵) یعنی خزانہ کے انتظام اور انصرام پر مجھے مامور کیجئے کہ میں نگہبان اور آگاہ ہوں، حفاظت و نگہبانی اسی شخص سے ممکن ہے جو دیانت دار اور امین بھی ہو ، جو شخص خود ہی خیانت اور بد دیانتی کا مرتکب ہو، وہ کیا حفاظت اور نگرانی کا فرض انجام دے سکتا ہے؟ اور علم سے اشارہ صلاحیت اور اہلیت کی طرف ہے، جب تک کسی معاملہ سے متعلق علم و آگہی نہ ہو، انسان اس کے انتظام و انصرام اور اس سلسلہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، پس، اُمیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنا اپنے تئیں امانت دار اور باصلاحیت ہونے کا دعویٰ ہے۔

ووٹ رائے دہندوں کی طرف سے اس کے اس دعویٰ کی تصدیق اور اس کے راست گو ہونے کی گواہی ہے، گویا آپ جس اُمیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، اس کے حق میں گواہی دیتے ہیں

کہ جتنے اُمیدوار اس حلقہ سے کھڑے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ دیانت دار اور باصلاحیت ہے اور معلوم ہے کہ جہاں سچی گواہی انسان کے لئے اجر و ثواب کا موجب ہے، جھوٹی گواہی اسی قدر عذاب و عقاب کا سبب ہے، رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ اور جھوٹی گواہی کی سخت مذمت فرمائی ہے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کے بعد تین بار ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم درجہ قرار دیا گیا ہے: ''عدلت شهادة الزور بالاشراک بالله'' پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ''فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ'' (الحج:۳۰) یعنی بت پرستی کی نجاست اور جھوٹی بات کہنے سے بچو، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۵۹۹، ابن ماجہ، حدیث نمبر:۲۳۹۴) اللہ تعالیٰ نے مومن کے خاص اوصاف میں سے اس بات کو بھی قرار دیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتا، (الفرقان:۷۲) لہٰذا کسی اُمیدوار کو نامناسب جانتے ہوئے پھر بھی اس کے حق میں ووٹ دینا گویا جھوٹی گواہی دینا اور ناحق اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ سے دو چار کرنا ہے۔

جہاں جھوٹی گواہی دینا گناہ ہے، وہیں ضرورت کے باوجود گواہی نہ دینا ''کتمانِ شہادت'' ہے اور یہ بھی سخت گناہ ہے، قرآن مجید نے گواہی کے چھپانے کی سخت مذمت کی ہے، ارشاد ہے: ''لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ'' (البقرۃ:۲۸۳) کہ گواہی کو چھپایا نہ کرو، جو گواہی کو چھپائے گا، اس کا دل گنہگار ہوگا، اس لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ووٹ دینا شرعاً واجب ہے اور کسی شدید ضرورت کے پیش آنے یا ضرر شدید کے اندیشہ کے بغیر ووٹ دینے سے پہلوتہی کرنا گناہ کا باعث ہوسکتا ہے اور عند اللہ اس پر سخت مواخذہ کا اندیشہ ہے۔

بعض حضرات پیسے لے کر کسی اُمیدوار کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں، یہ بھی گناہ اور حرام ہے؛ کیوں کہ یہ پیسہ لے کر کسی شخص کے حق میں جھوٹی گواہی دینا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ رشوت ہے اور رشوت کتنا سخت گناہ ہے اور کیسی شدید معصیت ہے؟ یہ کسی مسلمان کے لئے محتاج اظہار نہیں، رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت

بھیجی ہے، ایک حدیث شریف میں ہے کہ رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں دوزخی ہیں، چند پیسوں کے لئے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی لعنت کا مستحق بنالینا اور دوزخ خرید کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہوسکتا، ہمارے ملک کے قانون کے تحت عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، مسلمان خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق سے فائدہ اٹھائیں، اسلامی نقطۂ نظر سے عورت الیکشن میں اُمیدوار نہیں ہوسکتی؛ البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سیٹیں مخصوص کردی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی اُمیدوار بنائیں، تاہم عورت کے ووٹ دینے میں کچھ حرج نہیں، فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ گواہوں کے تزکیہ کا آتا ہے، یعنی جو گواہان عدالت میں پیش ہوئے ہوں ان کے بارے میں معتبر اور نامعتبر ہونے کی گواہی اور اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی کو معتبر مانا گیا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''و یقبل تعدیل المرأۃ لزوجھا و غیرہ اذا کانت امرأۃ برزۃ تخالط الناس و تعاملھم'' (ہندیہ: ۵۲۸/۳) ووٹ بھی اسی قبیل سے ہے۔

ووٹ میں شفاعت وسفارش کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، جب آپ کسی کو ووٹ دیتے ہیں تو گویا اس کے حق میں سفارش کرتے ہیں کہ اسے قوم وملک کے انتظامی اُمور میں نمائندہ بنایا جائے اور شفاعت وسفارش اگر درست ہو تو باعث اجر وثواب ہے اور غلط سفارش کی جائے تو سفارش کنندہ بھی گناہ میں حصہ دار ہوگا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بہتر سفارش کرے گا، اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا اور جو نادرست سفارش کرے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں، (النساء: ۸۵) غلط سفارش کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت اسامہ ؓ نے چوری کے ایک مقدمہ میں مجرم کے لئے سفارش کی، تو آپ ﷺ اتنے برہم ہوئے کہ کھڑے ہوکر اس پر مستقل خطبہ ارشاد فرمایا: کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ جب کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور کوئی معمولی شخص چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۷۳) اس لئے غلط سفارش بھی نہایت

ہی مذموم عمل ہے اور چوں کہ ووٹ کے ذریعہ منتخب ہونے والے نمائندہ کے عمل سے اجتماعی نفع ونقصان متعلق ہے، اس لئے یہاں غلط سفارش کا گناہ بھی نسبتاً زیادہ شدید ہوگا۔

ووٹ میں ایک پہلو وکالت کا بھی ہے، ووٹ کے ذریعہ آپ جو نمائندہ منتخب کرتے ہیں وہی سربراہِ حکومت یعنی وزیر اعظم و وزیر اعلیٰ اور صدرِ مملکت یعنی صدرِ جمہوریہ کا انتخاب کرتے ہیں، پھر وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ ہی کے واسطہ سے ملک کی پوری انتظامیہ تشکیل پاتی ہے اور عدلیہ اور انتظام کے کچھ صیغے صدر کے واسطہ سے وجود میں آتے ہیں، اس طرح ملک کا نظم ونسق اور نظامِ عدلیہ کا بالواسطہ آپ کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ارکان مقننہ ہی پر انحصار ہے، پس گویا ملک کے نظم و اقتدار کے لئے ذمہ داروں کے انتخاب کے باب میں یہی ارکان آپ کے نمائندہ اور وکیل ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ شرعاً وکیل کے ذریعہ انجام پانے والے افعال اس شخص کی طرف بھی منسوب ہوتے ہیں جس نے اس کو وکیل بنایا ہو، اس لحاظ سے غور کیجئے تو کسی اُمیدوار کو ووٹ دینا نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور یہ اس کے اچھے اور بُرے افعال میں شریک وسہیم ہونے کے مترادف ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ووٹ دیتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ سچی یا جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اچھی یا بُری سفارش کر رہا ہے، مناسب یا غیر مناسب شخص کو اپنا وکیل اور نمائندہ بنا رہا ہے، ووٹ دینے پر پیسے لے کر وہ صریحاً رشوت خوری کا مرتکب ہوتا ہے اور بلا عذر ووٹ نہ دے کر گواہی کو چھپانے کا گناہ مول لیتا ہے اور اس کی یہ گواہی سفارش اور وکالت ایک ایسا عمل ہے، جس کا اثر صرف اس کی ذات یا اس جیسے چند اشخاص تک محدود نہیں؛ بلکہ اس کی منفعت اور مضرت اجتماعی ہوگی اور پوری قوم اس سے متاثر ہوگی اور کسی شخص کو انفرادی نقصان پہنچانا کمتر درجہ کا گناہ ہے اور اجتماعی سطح پر ضرر پہنچانا یا اس میں شریک ہونا بہت بڑا گناہ، اس لئے ہر مسلمان کا شرعی اور اسلامی فریضہ ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نسبتاً بہتر، دیانت دار، قوم و ملک کے حق میں مفید اور خیر خواہ اُمیدوار کے حق میں اپنے ووٹ کو استعمال کرے اور ذاتی تعلقات اور شخصی مفاد کے مقابلہ قومی مفادات کو ترجیح دیں!۔ (۱۰ ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

ووٹ — ایک امانت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لئے آزادی اس کی فطرت میں ہے، غلامی اس کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خواہ اس غلامی کے ساتھ اس کی جسمانی راحت کا کتنا بھی سروسامان کیا جائے، ٹھیک ایسے ہی جیسے کسی پرندہ کو سونے کے قفص میں بند کر دیا جائے، اس آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے جہاد کیا اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا، آج ہمارا ملک آزاد ہے، ہم خود اس کے دروبست کے مالک ہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلہ میں شریک ہیں، یہ آزادی اللہ کی بڑی نعمت ہے، ہم آزادانہ اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، ہم جس بات کو غلط سمجھیں اسے برملا غلط کہہ سکتے ہیں، ہم ان لوگوں کا احتساب کر سکتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں متمکن ہیں، ہم اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور محرومانِ ہدایت کو سچائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

اس جمہوریت کا ایک حصہ ''الیکشن'' ہے؛ جس میں ملک کے عوام اپنے لئے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرتے ہیں، جو ایوانِ اقتدار میں ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے سیاہ و سپید کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں، بنیادی طور پر تو اسلام ''الیکشن'' میں اُمیدواری ہی کا قائل نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہیں کروں گا'' اس لئے لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور خواہش کرنا کہ ہمیں اس ذمہ داری کے لئے منتخب کرو، بجائے خود ایک غیر اسلامی؛ بلکہ غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ طریقہ ہے، ہونا یہ چاہئے کہ خود لوگ اس سے خواستگار ہوں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے؛ لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لئے خود اُمیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ورنہ سارے ہی خراب لوگ سیاست کی اس ریل

میں سوار ہو جائیں گے۔

جمہوریت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں، اسلام ان خامیوں کی اصلاح کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے، سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لئے نہ علم و دانش کی شرط ہے، نہ اخلاق و دیانت کی ضرورت ہے، پہلے لوگ اس کا رونا روتے تھے، کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ افراد منتخب ہو جاتے ہیں اور ملک کے حساس مسائل کا فیصلہ ایسے کندہ ناتراش افراد کے حوالے ہوتا ہے، ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکان مقننہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں اور نشان ابہام ہی سے کام چلاتے ہیں، اب بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو نامزد اور نامور مجرم ہیں، ان پر قتل، زنا، غصب اور رہزنی کے علانیہ جرائم ہیں، پہلے پولیس گرفتار کرنے کے لے ان کا پیچھا کرتی تھی، اب ان کی حفاظت و سلامتی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے، کرپشن اور سیاست کا اب چولی دامن کا رشتہ ہے اور اب کسی بھی لیڈر کے بارے میں اسکام کی خبریں سن کر عام شہری کو کوئی حیرت نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہ اب ایک معمول کی بات ہے۔

جو لوگ الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں، ان میں شاید ایک فیصد بھی ایسے نہیں جو حقیقت میں ایماندار کہلانے کے لائق ہوں، جن کی زندگی پاک وصاف ہو اور عوام کی املاک میں خرد برد کرنے کا عزم لے کر اس میدان میں نہ اُترے ہوں، ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے اور جب سبکدوش ہو کر اپنے وطن پٹنہ گئے تو ان کو رہنے کے لئے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا، جواہر لال نہرو دار المصنفین اعظم گڑھ کے رکن تھے، اس وقت فیس رکنیت پانچ سو روپئے تھی، جب مولانا مسعود علی ندوی نہرو جی سے ممبری فیس لینے گئے، تو ان کے پاس پانچ سو روپئے بھی مکمل نہ ہو سکے اور دو قسطوں میں فیس ادا کی اور اپنی پاس بک دکھائی جس میں دو ڈھائی سو روپئے سے زیادہ نہ تھے؛ لیکن آج معمولی عوامی نمائندوں کے محلات پر قصر شاہی اور گھر کی زیبائش و آرائش پر ''جنت شداد'' ہونے کا گمان ہوتا ہے اور پولیس چھاپہ مارتی ہے تو

منوں سونے کے زیورات ان کے مکان سے برآمد ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ووٹ دینا اور اپنے حق رائے دہی سے استفادہ کرنا جہاں قومی فریضہ ہے، وہیں مسلمانوں کے لئے مذہبی فریضہ بھی ہے؛ تاکہ ایسے نمائندوں کا انتخاب ہو سکے جو نسبتاً صالح کردار اور اخلاقی اقدار کے حامل ہوں، جو مجرمانہ سیاست پر یقین نہ رکھتے ہوں اور ملک کے سیکولر کردار کی بابت مخلص ہوں، وہ چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوں؛ بلکہ حق اور سچائی کے طرف دار ہوں، موجودہ حالات میں مکمل ایمان دار اور پاک وصاف کردار کے حامل سیاسی لیڈر کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں، شریعت کا اُصول ہے کہ جہاں ''بہتر'' میسر نہ ہو، وہاں نسبتاً ''کم خراب'' کو اختیار کیا جائے، اس لئے موجودہ حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اُمیدوار کو ووٹ دیا جائے، جو ملک کی مختلف اکائیوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہو، فرقہ پرست نہ ہو اور نسبتاً صالح کردار کا حامل ہو، وہ کم از کم دو شر میں سے کمتر درجہ کا شر ہو۔

ووٹ کی حیثیت دراصل شہادت اور گواہی کی ہے، آپ جب کسی اُمیدوار کے حق ووٹ دیتے ہیں تو گویا آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام اُمیدواروں میں یہی شخص آپ کے نزدیک اپنی دیانت، جذبۂ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبتۃً بہتر اور قوم وملک کے لئے مفید ہے، کسی شخص کی دیانت وامانت کے بارے میں آپ کو اطمینان نہ ہو، آپ کے علم میں ہو کہ یہ کرپٹ اور راشی ہے اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنے اور اپنے خاندان کی خدمت ہی اس کا مقصود ہے، اس کے باوجود آپ اسے ووٹ دیں، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دیں، تو اللہ کے یہاں آپ اس بارے میں جوابدہ ہوں گے، اس میں جھوٹی گواہی دینے کا گناہ ہوگا، یوں تو ہر جھوٹ برائی ہے؛ لیکن جھوٹی گواہی کا گناہ، گناہ کی تمام صورتوں سے بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے بہت بڑے گناہوں میں سے ایک شمار فرمایا ہے۔

ووٹ میں اُمیدوار کی صلاحیت اور کردار کے بجائے محض اس بات کو معیار بنانا کہ یہ ہمارے محلہ کا ہے، ہمارے اس شخص سے تعلقات ہیں، اس نے ہمارا فلاں ذاتی کام کر دیا تھا، یہ ووٹ دینے کے لئے ہمیں پیسے دے رہا ہے، درست نہیں ہے، یہ خیانت اور جھوٹی گواہی ہے

اور یہ پیسے رشوت ہیں، ہر شخص اس کے بارے میں اللہ کے یہاں جوابدہ ہے، ایسا شخص ایک دو نہیں بلکہ پوری قوم کے ساتھ بدخواہی کا مرتکب ہے، اس لئے ووٹ کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، تمام اُمیدواروں پر غور کرنا چاہئے، اس کی گزشتہ زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک اور رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہئے اور پھر جس اُمیدوار کو بہتر اور مفید تصور کرتا ہے اس کے حق میں ''ووٹ'' دینا چاہئے، ووٹر کے لئے یہی اصل کامیابی ہے جس کے حق میں اس نے ووٹ کا استعمال کیا ہے، اگر وہ ہار گیا، تب بھی ''ووٹ'' دینے والا اپنے مذہبی فریضہ اور قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے، وہ اللہ کے یہاں خیانت کا مرتکب تصور نہ کیا جائے گا اور اگر ایسے اُمیدوار کو ووٹ دیا جائے جو قوم کے لئے مفید نہیں، مضر ہے، تو گو اُمیدوار جیت جائے پھر بھی ایک مسلمان ووٹر کے لئے یہ ہار ہی ہے؛ کیوں کہ وہ اپنے اس غلط عمل کی بابت عنداللہ جوابدہ ہے اور خدا کے ترازو میں اس کا یہ عمل قابل مواخذہ ہے!

(۱۳؍فروری ۱۹۹۸ء)

انتخابی اُمیدوار — اسلامی معیار

الیکشن کا ڈنگل بج چکا ہے، جلسے جلوس، اشتہارات، وعدے اور وعیدیں ایک دوسرے کی کردار کشی، بلند بانگ دعووں کا ایک سیلاب ہے، جو ملک کے گوشہ گوشہ میں رواں دواں ہے، کیا شہر اور کیا دیہات؟ گھر گھر اور قریہ قریہ آنے والے الیکشن کی گونج ہے، جیوتشیوں کی بھی بن آئی ہے، اندازے اور پیشین گوئیاں بھی طرح طرح کی کی جارہی ہیں، دعائیں اور آشیرواد بھی لئے جارہے ہیں، جن گندی بستیوں، تنگ اور تیرہ وتاریک گلیوں کی طرف قائدین کبھی پھٹک کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اب قائدین کا ایک ہجوم ہے، جو بن بلائے مہمانوں کی طرح صبح وشام ان مقامات کا چکر لگا رہا ہے، جن غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، ووٹ کی کشکول تھامے بڑے بڑے موٹر نشیں اور برا نہ مانئے تو کہا جائے ''فراعنۂ وقت'' ان کی خوشامدیں کررہے ہیں، ایسے ایسے وعدے کئے جارہے ہیں کہ گویا ہر گھر میں دودھ کی نہر بہادیں گے اور شہد کے چشمے پھوٹ پڑیں گے، اُمیدواروں کا تعلیمی اور اخلاقی معیار بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، بعض حضرات اپنے دستخط بھی ''بہ تکلف'' کرتے ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے ہمیشہ انگوٹھے کے نشان سے کام چلایا ہے، بعض حضرات کی تعلیمی سطح پرائمری اور مڈل اسکول تک ہے، اخلاقی اقدار کا حال اس سے بھی بُرا ہے، کسی پر راہزنی کا مقدمہ ہے، کسی پر قتل کا تو کسی پر آبروریزی کا، رہ گئی رشوت اور مالی خرد برد، تو یہ تو اس طبقہ کے لئے ایک ''معمولی'' سی بات ہے!

ان حالات میں ووٹ کے لئے اُمیدواروں کے انتخاب میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا ان کی سوچ وہی ہو جو عام لوگوں کی ہے، زمانہ جس رُخ پر چل رہا ہو، اسی رخ پر چل پڑنا، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنا تعلقات اور شخصی مفادات کی بناء پر اُمیدوار کا انتخاب کرنا، ان کو ووٹ دینا اور ووٹ دلانا، ان کی تشہیر کرنا، ان کی پروپیگنڈہ مشنری میں شریک ہونا،

کیا مسلمانوں کے لئے بھی درست ہوسکتا ہے؟ یا بہتر امیدوار کا انتخاب مسلمانوں کا شرعی فریضہ ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا اور جس کو ملحوظ رکھنا بحیثیت مسلمان ہمارے لئے ضروری ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ اچھے امیدوار کا انتخاب اور اس کی تائید، اور نا مناسب اور نا اہل اُمیدوار کو رد کردینا اور اس کے ساتھ عدمِ تعاون ایک دینی اور شرعی فریضہ ہے؛ کیوں کہ قرآن نے ایک اُصولی بات کہہ دی ہے کہ اچھی بات اور اچھے کام میں تعاون بھی ضروری ہے اور خراب کام میں عدمِ تعاون بھی واجب ہے: "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"۔ (المائدۃ:۲)

سوال ہے کہ اچھے اُمیدوار کا معیار کیا ہے؟ — اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام اُمیدواری ہی کا قائل نہیں، اس سے زیادہ قبیح اور شنیع بات نہیں ہوسکتی کہ انسان خود عہدہ کا طلب گار ہو اور لوگوں سے خواہش کرے کہ وہ اسے منتخب کریں، یہ تو درحقیقت بے شرمی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے سخت ناپسند فرمایا ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عبدالرحمٰن! امارت کے طلب گار نہ ہو، اس لئے کہ اگر تم مانگ کر عہدہ حاصل کروگے، تو تم اسی کے حوالہ کردیئے جاؤگے، یعنی اللہ کی مدد شریکِ حال نہ رہے گی اور اگر بغیر مانگے ذمہ داری سپرد کی جائے تو من جانب اللہ تمہاری مدد ہوگی، (مسلم، باب النہی عن طلب الامارۃ...... الخ) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچازاد بھائی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ذمہ داریاں عطا فرمائی ہیں، ان میں سے بعض پر ہمیں مامور فرما دیجئے، دوسرے نے بھی یہی بات کہی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "خدا کی قسم! میں ذمہ داری کسی ایسے شخص کے حوالہ نہیں کرسکتا، جو اس کا طلب گار یا اس کا حریص ہو" چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنے رفقاء کے اس مطالبہ پر خفت ہوئی اور انھوں نے آپ ﷺ سے معذرت کی کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح کا مطالبہ کرنے آئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان دونوں کو تو یہ عہدہ نہیں دے سکتا؛ البتہ تم کو ایک ذمہ داری پر متعین کرتا ہوں، پھر ان کو حضرت معاذ بن

جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن بھیجا۔ (حوالۂ سابق)

اسی طرح کی بات عہدۂ قضاء کے بارے میں بھی منقول ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو عہدۂ قضا کا طلب گار ہو وہ اپنے نفس کے داؤ میں آجائے گا اور جو اس عہدہ کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس کے لئے ایک فرشتہ نازل ہوگا جو اس کو راہ راست پر قائم رکھے گا: ''من سئل القضاء وکل الی نفسہ ، ومن جبر علیہ ینزل علیہ ملک یسددہ''۔ (ترمذی)

معلوم ہوا کہ خود کسی عہدہ کا طلب گار ہونا نہایت ہی قبیح بات ہے، اس سے انسان اللہ کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے اور جب مطالبہ کے بغیر لوگوں کے اصرار اور خواہش پر انسان کسی عہدہ کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شریکِ حال رہتی ہے، اس لئے اولاً تو کم سے کم مسلمان اُمیدواروں کا یہ مزاج نہیں ہونا چاہئے کہ عہدہ کی حرص و ہوس میں ان کے درمیان اور غیر مسلم لیڈروں کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہے، موجودہ جمہوری نظام کے مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں انسان کو خود عہدہ ومنصب کا طلب گار بننا پڑتا ہے اور چوں کہ ہمارا قومی نظام بھی اسی اُصول پر مبنی ہے، اس لئے نہ صرف سیاسی انتخابات؛ بلکہ مذہبی جماعتوں اور ملی تنظیموں میں بھی عہدہ ومنصب کی طلب کا یہی رویہ عام ہوگیا ہے، جو نہایت ہی بدبختانہ بات ہے، تاہم موجودہ سیاسی نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اُمیدوار خود الیکشن میں کھڑے ہوں، ان حالات میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک عام لوگ الیکشن میں اُمیدوار بننے کے لئے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو، اُمیدوار بننے سے گریز کیا جائے۔

کسی شخص کو ووٹ دینا اس کو اپنا نمائندہ نامزد کرنا ہے، کیسے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جائے اور کس شخص کو کس عہدہ پر مامور کیا جائے؟ اس کے لئے قرآن نے ایک بنیادی بات بتائی ہے کہ جس کو ذمہ داری سپرد کی جائے اس میں دو باتیں ضرور پائی جانی چاہئیں، ایک تو صلاحیت واہلیت دوسرے امانت ودیانت: ''إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ''۔ (القصص:۲۶)

صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں پہنچنے کے بعد وہ شخص صحیح موقف کی رہنمائی کر سکے، صحیح موقف سے مراد یہ ہے کہ اس کی رائے قرآن وحدیث اور شریعت اسلامی

کے مخالف نہ ہو، دوسرے اس میں مسلمانوں کے ملی مفادات کی رعایت ہو، تیسرے اس کی رائے ملک اور ملک کے تمام شہریوں کے لئے خیر خواہی پر مبنی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں شعور و آگہی ہو، وہ ضروری حد تک شریعت کے احکام سے واقف ہو، زمانہ شناس اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو، دوسرے اپنی بات کو مؤثر انداز میں اور قانون و منطق کی زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جرأتِ اظہار ہو؛ کیوں کہ دلیل کی زبان میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بعض اوقات اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ ایک شخص کی رائے ایک جماعت کی رائے پر حاوی ہو جاتی ہے، یہ سنت نبوی بھی ہے کہ کسی بات کے کہنے کے لئے مناسب شخص کا انتخاب کیا جائے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے مسلمان منتخب ہو کر مجالسِ قانون ساز میں پہنچتے ہیں، کہ خود ان کے شعور آگہی کی سطح بہت پست ہوتی ہے، ان میں مدلل طریقہ پر سوال اُٹھانے اور مخالف سوال کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ عوام میں جذباتی تقریر کرنا آسان ہے؛ لیکن دلیل کی زبان میں اپنی بات کو ثابت کرنا اسی قدر دشوار۔

دوسرا ضروری وصف ''امانت و دیانت'' کا ہے، امانت ایک جامع لفظ ہے، یہ صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہے؛ بلکہ انسان کا ہر قول و فعل اس کی وسعتوں میں داخل ہے، فکر و سوچ میں بھی امانت مطلوب ہے، فکر کی امانت یہ ہے کہ انسان قومی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذاتی مفاد کے بجائے قومی اور ملی مفاد کے پس منظر میں سوچے، امانت زبان سے بھی متعلق ہے، زبان کی امانت یہ ہے کہ سچی اور درست بات کہی جائے، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنی پارٹی اور حکومت کی خوشامد و چاپلوسی سے بچا جائے، قول و عمل میں تضاد نہ ہو، زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق ہوں اور یقیناً امانت و دیانت کا تعلق مال و متاع سے بھی ہے، ایک زمانہ میں چھوٹے درجہ کے ملازمین کو کرپٹ اور رشوت خور سمجھا جاتا تھا؛ لیکن آج لوگوں کو یقین ہے کہ سیاسی قائدین اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے ہیں، اگر اسکینڈل اور رشوت خوری بھی فن کہلانے کا مستحق ہے تو ہمارے ملک کے بعض وزرا؛ بلکہ وزیر اعظم تک ایسے گذرے ہیں، کہ یقیناً وہ اس بات میں انعام کے مستحق ہیں! جواہر لال نہرو مدتوں وزیر اعظم رہے؛ لیکن دلی

میں اپنا مکان نہیں بنا سکے اور چند ہزار روپے بھی ان کے بینک کے کھاتے میں نہیں رہتے تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد دو میقات صدر جمہوریہ رہے؛ لیکن جب پٹنہ واپس ہوئے تو رہنے کو مکان بھی نہیں تھا اور ''صداقت آشرم'' میں مقیم ہوئے، یہ کوئی قدیم عہد کی نظیریں نہیں؛ بلکہ ماضی قریب کی مثالیں ہیں؛ لیکن آج معمولی، ایم-پی، ایم-ایل-اے، یہاں تک کہ بلدیہ کا چیرمین اور کانسلر بھی ایسی دادِ عیش دیتا ہے کہ ان کے پُرکھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، یہ محض کرپشن اور رشوت ستانی کی دین ہے اور سیاسی قائدین کا اس جرم میں ملوث ہونا ایک ''کھلا راز'' ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب نبی بنائے گئے تو آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے دین کو پیش کرنے سے پہلے اپنی ذات کو پیش فرمایا اور دریافت فرمایا کہ میں چالیس سال تمہارے درمیان رہا، تم نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا اور امانت دار پایا یا خیانت کرنے والا؟ لوگوں کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا کہ ہم نے آپ ﷺ کو سچا اور امانت دار پایا ہے، دراصل ہر اُمیدوار کو اس معیار کا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے حلقہ میں لوگوں سے دریافت کر سکے کہ تم نے مجھے کیسا پایا ہے؟ اور اپنی ذات کو ان پر پیش کر سکے، وعدے کرنا، مینوفیسٹو جاری کرنا اور بلند بانگ دعوے کرنا اور اس بات کی ہمت نہ پانا کہ اپنے آپ کو پیش کر سکیں اور اپنے عمل کی میزان لوگوں کے ہاتھ میں دے سکیں، دل کے چور اور کرداری کی خامیوں اور کوتاہیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس دور میں تو یہ شاید ممکن نہ ہو کہ اس معیار پر صد فیصد اترنے والے رہنما مل جائیں؛ لیکن کم سے کم یہ تو ہو کہ وہ نسبتاً اس معیار سے قریب ہوں، اندھوں کے گاؤں میں کوئی ''کانا'' بھی ہاتھ آجائے، تو شکر ادا کرنا چاہئے، اس لئے آج کے بازار ''سیاست'' میں اگر نسبتاً بہتر لوگ میسر آجائیں تو وہی موجودہ اخلاقی گراوٹوں کے پس منظر میں بہتر اُمیدوار سمجھے جا سکتے ہیں —— یقیناً موجودہ حالات میں اس طرح کی باتیں ایک خواب محسوس ہوتی ہیں اور اجنبی سی لگتی ہیں، مگر مسلمانوں کا کام یہ نہیں کہ وہ چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار بن جائیں اور حق وصداقت کے داعی بننے کے بجائے اس بھیڑ کے ساتھ ہو جائیں جو باطل اور جھوٹ کا علَم اُٹھائے ہوئے ہو!

(۱۴ر ستمبر ۱۹۹۹ء)

الیکشن میں اُمیدوار ہونے کے لئے قلیل العیال ہونے کی شرط

اس وقت ریاست آندھرا پردیش میں پنچایت الیکشن کی آمد آمد ہے، حکومت نے اس بار الیکشن کے لئے ایک نیا قانون متعارف کرایا ہے، کہ الیکشن میں وہی لوگ حصہ لے سکیں گے جن کے دو سے زیادہ بچے نہ ہوں، گویا الیکشن کو فیملی پلاننگ کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت ہی نا منصفانہ اور نا معقول اُصول ہے، اور کسی طرح اس کا جواز نہیں، اولاً تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ کیا الیکشن کے سلسلہ میں یہ اُصول ملک کے دستور اور عقلِ عام کے تقاضے کے مطابق ہے؟ دوسرے کیا الیکشن میں اس طرح کی قیود و حدود واقعی فیملی پلاننگ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مؤثر اور مفید ہیں؟ تیسرے خود فیملی پلاننگ کا نظریہ کس حد تک عقل اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے؟

جہاں تک اس قانون کی معقولیت کی بات ہے تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا مقصد قوم کی اجتماعی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر انتظامی صلاحیت اور دیانت ہو، انتظامی صلاحیت کا تعلق انسان کے فہم، سمجھ بوجھ، دماغی صلاحیت اور قوت فکر سے ہے اور دیانت کا تعلق انسان کے قلب وضمیر، جذبۂ خدمت اور خلوص سے ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بہترین ورکر اس شخص کو قرار دیا ہے جو قوی اور امین ہے: ''إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ '' (القصص:۲۶) ''قوی'' سے مراد باصلاحیت اور مفوضہ کام کی اہلیت کے مطابق ہونا ہے اور ''امین'' سے اشارہ امانت و دیانت کی طرف ہے، حقیقت یہ ہے کہ قیادت کے لئے اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا؛ بلکہ اس کے سوا کوئی معیار ہی نہیں ہو

سکتا، اس لئے اگر انتخابی قوانین میں تعلیم کے ایک خاص معیار کی شرط ہوتی یا کردار کی پاکیزگی ملحوظ ہوتی، مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والوں کو اور جاہل اور کندۂ ناتراش قسم کے غنڈوں کو روکنے کی سعی کی جاتی تو یہ یقیناً ایک معقول اور مناسب بات ہوتی؛ لیکن اس کو بچوں کی تعداد سے متعلق کر دینا ایک ایسا معیار ہے جو عقل اور فطرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، کیا دو اور اس سے کم اولاد والے زیادہ سمجھ دار، دیانت دار، معاملہ فہم اور جذبۂ خدمت کے حامل ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

پھر غور کیجئے کہ دستور و آئین اور جمہوری روایات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ دستور تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو الیکشن میں اُمیدوار بننے کا یکساں حق عطا کرتا ہے، اس جمہوری تقاضے کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ جو لوگ کھلے ہوئے مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں، پولیس کے نامزد مجرم ہیں اور جنھوں نے رشوت ستانی کی ایک تاریخ بنائی ہے، انھیں بھی الیکشن میں اُمیدوار بننے سے روکا نہیں جا سکتا، تو آخر یہ کیسا انصاف ہوگا کہ ایک شخص کو محض اس لئے الیکشن میں اُمیدوار بننے سے روکا جائے کہ اس کے بچے زیادہ ہیں اور اتفاق سے اولاد کے بارے میں قدرت اس پر زیادہ مہربان ہے؟ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ملک کا دستور و آئین بھی ایسے قوانین کے حق میں نہیں ہے۔

الیکشن میں اُمیدوار بننے والوں کا تناسب بہت ہی معمولی ہوتا ہے، ان کی تعداد عام لوگوں کے مقابلہ ایک فی لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی، اگر آبادی میں ایسے چند افراد چند بچوں پر قناعت کر لیں، تو اس سے اس مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملے گی، اس کے برعکس اندیشہ یہ ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد جنم لیں گے، ممکن ہے لوگ اپنی اولاد کے سلسلہ میں غلط حلف نامے داخل کریں اور اس کو بنیاد بنا کر آئندہ مقدمہ بازیاں ہوں، بھائی بھائی کے رشتہ کا انکار کرے، جائز اولاد نا جائز قرار دی جائے، مال و زر کی حرص و طمع میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ اپنے ہی بھائی کے نسب کا انکار کر دیا جاتا ہے، اس لئے حکومت جو کچھ چاہتی ہے اس مقصد کے لئے بھی یہ کوئی مفید اقدام نہیں، مزید اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی اس

پالیسی کو وسعت دیتے ہوئے دوسرے شعبوں میں بھی اسی طرح کے قوانین نافذ کرے، تو اگر ملازمتوں اور حکومت کے وسائل سے استفادہ کی صورتوں میں بھی یہ پالیسی اختیار کی گئی، تو یہ نہایت ہی نقصان دہ بات ہوگی، اس سے حق داروں کی حق تلفی ہوگی اور ملک کی لگام نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور کسی بھی ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

خود فیملی پلاننگ ایک ایسا نظریہ ہے جس کو تجربات اور واقعات نے رد کر دیا ہے، جو لوگ اس نظریے کے بانی اور مؤسس تھے، ان کے قیاس کی رو سے اس وقت دنیا کو دانہ دانہ کا محتاج ہونا چاہئے تھا اور انسانیت کے بہت بڑے حصہ کو فاقوں پر گذر کرنی چاہئے تھی؛ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا؛ بلکہ پوری دنیا میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی معیار زندگی بلند ہوا ہے، کھانے پینے، لباس و پوشاک، سواری اور زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ راحت بخش وسائل کا استعمال بڑھا ہے، زمینوں کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور اگر مغربی ممالک اپنی زراعتی ٹکنالوجی ترقی پذیر ممالک کو فراہم کریں تو زرعی وسائل میں نا قابل تصور اضافہ ہوسکتا ہے، جو انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے اور ایسا سبز انقلاب رونما ہوسکتا ہے جو کسی شخص کو بھوکے پیٹ نہ سلائے، گذشتہ سوڈیڑھ سو سال میں بعض ایسے قدرتی وسائل بھی انسانوں کی گرفت میں آئے ہیں، جنھوں نے صحراؤں اور ریگستانوں کو باعث رشک کر دیا ہے، کیا قدرت کی اس فیاضی کے باوجود فیملی پلاننگ کا نظریہ کوئی معنویت رکھتا ہے؟ اور اس کو قانونِ فطرت سے ہم آہنگ قرار دیا جا سکتا ہے؟

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آج دنیا میں ہمارے ملک کو جو اہمیت حاصل ہے، یا حاصل ہوتی جارہی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک اپنی سرمایہ کاری کے لئے ہماری طرف کیوں متوجہ ہیں؟ اور ملٹی نیشنل کمپنیاں کیوں ہماری دلداری کرتی ہیں؟ اسی لئے کہ یہ آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے، یہ اشیاء کی کھپت کے لحاظ سے بہت بڑی مارکیٹ ہے، یہ افرادی وسائل کے اعتبار

سے بہت خوش قسمت خطہ ہے، پوری دنیا کو یہاں سے ماہرین ملتے ہیں اور ہر جگہ یہاں کے محنتی اور ذہین مزدور، ورکرس اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، اگر شرح پیدائش پر بہت زیادہ کنٹرول ہو جائے اور افرادی وسائل ہمارے پاس کم ہو جائیں تو ہم کس طرح اس اہمیت کو برقرار رکھ سکیں گے۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں دو اور دو چار کی طرح واضح ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں؛ بلکہ وہ اس کا رب اور پالنہار بھی ہے، کائنات کے ایک ایک ذرہ پر اس کی نظر ہے، وہ ایک منصوبہ کے ساتھ آبادی کو بڑھاتا اور گھٹاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رزق کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اس کو ایک متعین مقدار میں عطا کرتے ہیں: ''وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ '' (الحجر:۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ضرورت کے لحاظ سے غذائی وسائل فراہم کرتے رہتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کتنے ہی جانور ایسے ہیں، کہ بہ ظاہر ان کی روٹی روزی کا کوئی سامان نہیں؛ لیکن یہ اللہ کی رزق رسانی کا کرشمہ ہے، کہ وہ تم جیسے قوتِ عمل اور فہم و شعور کی حامل مخلوق کو بھی رزق دیتا ہے اور ان کو بھی: ''اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاكُمْ '' (العنکبوت:۶۰) قرآن نے ایک موقع پر یہ بات بڑی وضاحت سے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی چاہت کے مطابق رزق کا سرو سامان فراہم فرماتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اپنے بندوں سے ہر آن باخبر ہیں اور انھیں دیکھ رہے ہیں: ''وَلٰـكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ'' . (الشوریٰ:۲۷)

جب انسان اپنی کوتاہ عملی اور اپنی فکر و نظر کی محدودیت کے باوجود ایک نظام کے ساتھ ہر کام انجام دیتا ہے اور دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بجٹ بناتی ہیں تو کیا خدائے علیم و بصیر اور رزاق و قدیر کو اپنے بندوں کی ضرورت اور کائنات میں اس کے پیدا کیے ہوئے وسائل کا کچھ اندازہ نہ ہوگا؟۔

(۹؍ستمبر ۲۰۰۰ء)

خواتین کے لئے تحفظات —— اسلامی نقطۂ نظر

اس وقت ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز میں خواتین کے لئے تحفظات کا مسئلہ پورے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے، ذرائع ابلاغ کچھ ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا اس مسئلہ کے حل ہوتے ہی قوم کی تقدیر بدل جائے گی اور ملک کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جو سیاسی قائدین اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھتے، خواہ یہ مناسب نہ سمجھنا ملک کے فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے ہو یا رائے عامہ کے دباؤ سے، وہ بھی کھلے عام اس تجویز کی مخالفت سے ڈر رہے ہیں اور دبے لفظوں میں شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ تجویز قانون بن جاتی ہے تو مستقبل کی سیاست پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے، پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے لئے یہ ضرب کاری کا درجہ رکھتی ہے، ان طبقات میں خواتین کا تعلیمی تناسب اتنا معمولی ہے کہ بظاہر مناسب خاتون اُمیدواروں کا ملنا دشوار ہے، پھر جو خواتین منتخب ہوں گی، وہ پالیمنٹ میں کما حقہ ان کمزور طبقات کی ترجمان کر سکیں، یہ اس سے زیادہ دشوار ہے، یہ بات بھی بعید نہیں کہ سیاست میں حصہ لینے والی خواتین سے خلاف جرائم کا رجحان بڑھ جائے، جیسا کہ پچھلے دنوں مغربی بنگال میں ہوا ہے؛ کیوں کہ آج کل سیاست میں پڑھے لکھے اور باکردار افراد کی بجائے شر پسند عناصر اور کندۂ ناتراش قسم کے لوگوں کا غلبہ ہے، بڑا لیڈر بننے کے لئے اسی درجہ کا غنڈہ اور مکروفریب کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، ایسے لوگ احساسِ محرومی کا شکار ہو کر ان خواتین کو اپنا نشانہ بنائیں جو سیاست میں ان کی رقیب بنتی ہوں، تو کچھ عجیب نہیں۔

اگر واقعی سیاست داں عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مسیحائی کرنے میں سنجیدہ ہیں، تو اس کا صحیح طریقہ الیکشن میں تحفظات نہیں؛ بلکہ ان کی حقیقی مشکلات کو دور کرنا ہے،

اگر ملک بھر سے سوڈیڑھ سو خواتین پالیمنٹ میں پہنچ جائیں، تو یقیناً ان میں نوے فیصد وہ خواتین ہوں گی جو متمول اور صاحب ثروت خاندانوں سے تعلق رکھتی ہوں، وہ نہ غریب و مفلس عورتوں کے دُکھ درد سے واقف ہیں اور نہ ان کی سماجی مشکلات سے آگاہ، اس لئے کہ عام طور پر ظلم وجور کا شکار وہ خواتین ہوتی ہیں، جو خط غربت سے نیچے ہیں یا زیادہ سے زیادہ متوسط الحال ہیں، نہ ان کے پاس دولت ہے، نہ تعلیم اور نہ خاندانی پس منظر۔

خواتین کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی وسائل فراہم کئے جائیں، یتیم لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا مفت انتظام کیا جائے، ایسی بچیوں کے لئے ہوسٹل قائم کئے جائیں، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے لئے خصوصی وظائف جاری کئے جائیں؛ تاکہ وہ عزت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں، مخلوط تعلیم کے بجائے جداگانہ نظام تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے؛ تاکہ لڑکیاں اپنے آپ کو جس نفسانی دباؤ کا شکار پاتی ہیں، وہ اس سے آزاد رہ سکیں، عورتوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ شادی میں گھوڑے جوڑے کی رسم ہے، اس کو روکنے کی مؤثر کوشش کی جائے، فسادات اور دنگوں میں اکثر عورتوں کی جان جاتی ہے، ایسے واقعات پر خصوصی ایکشن لیا جائے، لڑکیوں کی شرح پیدائش کم کرنے کے لئے قبل از وقت اسقاط حمل کی تدابیر میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اس کو روکا جائے، بہت سے لوگ بہنوں اور بیٹیوں کو میراث سے محروم کر دیتے ہیں، اس کا سد باب کیا جائے، یہ اور اس طرح کے سماجی مسائل ہیں جو خواتین کی حقیقی مشکلات ہیں، ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے، ان مشکلات کو حل کرنا خواتین کی ایک بڑی تعداد کے مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش ہوگی، ورنہ پالیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی کا بڑھ جانا چند عورتوں کے مسائل کا حل تو ہو سکتا ہے؛ لیکن یہ عمومی طور پر نہ خواتین کے لئے مفید ہے اور نہ ہمارے سماج کے لئے۔

جہاں تک مجالس قانون ساز میں تحفظات کی بابت اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے، تو عہدوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اہلیت اور صلاحیت کو دیکھا جائے اور اسی کو بنیاد بنا کر ذمہ داریاں سپرد کی جائیں، ایک موقع پر آپ ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ امانتیں ضائع کی جانے لگیں، حضرات صحابہ ﷺ نے عرض کیا کہ امانتوں کے ضائع کرنے سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو جس کام کا اہل نہ ہو اس کو وہ کام سپرد کیا جائے: "اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة"۔(بخاری:۱۴/۱)

یہ نہایت بنیادی اور اہم بات ہے، کوئی بھی شعبہ ہو، اس کے کام اور انتظام میں اصل بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کی تقسیم میں صلاحیت اور اہلیت کی بجائے رشتہ داریاں، قرابت مندیاں، حیثیت عرفی، شخصی و سیاسی مفاد کی توقع، کوئی عہدہ نہ دینے کی صورت میں اس سے نقصان اور مضرت کا اندیشہ، ذات برادری، علاقہ و وطن وغیرہ کو معیار بنایا جائے، مثلاً ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے بعض شعبوں میں ذات پات کی بناء پر ریزرویشن ہے، اس ریزرویشن کے نتیجہ میں بعض حضرات ستر اور اسی فیصد نمبر لا کر بھی داخلہ سے محروم رہتے ہیں اور جن لوگوں کو تحفظات حاصل ہیں، اگر ان میں اُمیدوار کم ہیں تو پچیس فیصد نمبر لانے کے باوجود داخلہ کے مستحق ہو جاتے ہیں، جب ایسے لوگ ڈاکٹر اور انجینئر بنیں گے اور قوم کو تختۂ مشق بنائیں گے، تو یہ ملک و قوم کے مفاد میں ہوگا یا ان کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا؟ یہ محتاج اظہار نہیں۔

ہندوستان کی خواتین میں تعلیمی تناسب بہت کم ہے اور جو کچھ ہے وہ شہروں میں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سوسائٹی سے زیادہ میل جول نہیں رکھ سکتیں، اس لئے فطری بات ہے کہ سماج کے حالات سے وہ نسبتاً کم واقف ہوتی ہیں، پھر مشترکہ مجمع میں خواتین کے لئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار دشوار ہوتا ہے، ان حالات میں خواتین کو نمائندہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سماجی مشکلات اور بالخصوص دیہات و قریہ جات کے مسائل کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکے گی، نیز مخلوط ماحول میں ان کے لئے کام کرنا اخلاقی نقطۂ نظر سے خود ان کے لئے دشواری کا باعث ہوتا ہے؛ جیسا کہ آفسوں اور دفتروں میں تجربہ ہے؛ اس لئے درحقیقت بنیادی طور پر تحفظات کا تصور ہی غلط تصور ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ عہدہ داروں کے انتخاب میں تعصب کے

رویہ کو ختم کیا جائے، تمام قوموں کو مساوی طور پر ترقی کرنے کے موقع فراہم کئے جائیں، نہ یہ کہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل ہو یا نہ ہو، اس کو وہ ذمہ داری سونپ دی جائے ، کسی طبقہ کا کمزور ہونا یا اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کے واقعات کا نسبتاً زیادہ پیش آنا، اس بات کا جواز پیدا نہیں کرتا کہ ملک وقوم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی جائے ، اگر ذمہ داریاں سپرد کرنے کے لئے ایسی باتوں کو معیار بنایا جائے ، تو پھر بتدریج معذوروں اور اپاہجوں کے لئے بھی کچھ تحفظات دینے ہوں گے اور سن رسیدہ اور معمر لوگوں کا بھی ایک کوٹہ رکھنا ہوگا۔

پس، اسلام بنیادی طور پر تحفظات کے فلسفہ ہی کا قائل نہیں ہے — جہاں تک خواتین کی بات ہے، تو اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سماج میں مردوں اور خواتین کا دائرہ کار الگ الگ ہے، گھر سے باہر کی سرگرمیاں مردوں کے ذمہ ہے اور عورتوں کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں ، (الاحزاب: ۳۳) اس لئے نفقہ و کفالت اور کسب معاش کی ذمہ داری مردوں کے سر رکھی گئی اور بال بچوں کی پرورش و پرداخت کا حق دار عورتوں کو قرار دیا گیا، مردوں کو جہاد کا حکم دیا گیا اور بہترین عورت اس بیوی کو قرار دیا گیا جو شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے مال اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے، مردوں کے لئے جماعت سے نماز واجب قرار دی گئی اور عورتوں کے لئے گھر کی نماز کو ترجیح دی گئی، اس لئے اُصولی طور پر اسلام بیرونی زندگی میں عورتوں کے لانے کو صحیح نہیں سمجھتا؛ بلکہ اس کو عورتوں کے لئے ظلم اور اس کی صحیح حیثیت اور پوزیشن پر زیادتی تصور کرتا ہے۔

بعض حلقوں سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ خواتین کو اس طرح کے سیاسی اور سماجی کاموں سے روکنا '' عدل'' کے خلاف ہے، بعض حضرات خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کو '' برابر'' کا درجہ دیا ہے، یہ محض مولویوں کا ڈھکوسلا ہے کہ وہ خواتین کو آگے بڑھنے دینا نہیں چاہتے ؛ لیکن یہ محض غلط فہمی کی باتیں ہیں ، اسلام مردوں اور عورتوں میں مساوات کا نہیں '' عدل '' کا قائل ہے، عدل کے معنی برابری کے برتاؤ کے نہیں ہیں ؛ بلکہ عدل سے یہ مراد ہے کہ جو جس صلاحیت کا حامل ہو اسی کے مطابق اس کی ذمہ داری بھی مقرر کی

جائے، جیسے مریض مرغن غذاؤں کا متحمل نہیں ہوسکتا اور صحت مند اسے ہضم کرسکتا ہے، مریض کو سادہ غذا دینا مساوات تو نہیں کہلا سکتا؛ لیکن عدل یہی ہے کیوں کہ ہر شخص کے لئے وہی غذا بہتر ہوسکتی ہے جو صحت کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں اور قابل برداشت ہو، کسی کلینک میں ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر اور ایک ناخواندہ مزدور پہنچیں تو ڈاکٹر کا تقرر بحیثیت طبیب ہوگا اور مزدور کا بحیثیت جاروب کش، ظاہر ہے یہ مساوات نہیں ہے؛ لیکن یہی تقاضۂ عدل ہے اور اسی میں سماج کا مفاد ہے۔

اسلام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان عدل کا قائل ہے نہ کہ مساوات کا، یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان فطری طور پر صلاحیتوں کا فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہیں، جیسے جسمانی مشقت، دوڑ دھوپ، شجاعت و بہادری، جرأت و بے باکی، قوتِ فیصلہ، اقدامی صلاحیت اور مدافعت کی طاقت، عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں، قوتِ فیصلہ بھی ان میں کم ہوسکتی ہے، اسی لئے طبی اعتبار سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عورتوں کے دماغ کا حجم مردوں سے کم ہوتا ہے، مردوں کا مغز دماغ عورتوں کی بہ نسبت سو گرام زیادہ ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا، عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے، قلب جو زندگی کا مرکز ہے، عورتوں کا مرد کے مقابلہ ساٹھ گرام چھوٹا ہے، بعض طبی ماہرین کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی قویٰ میں کم سے کم ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے۔

جہاں بعض اوصاف اور صلاحیتوں میں مردوں کو تفوق حاصل ہے، وہیں بعض پہلوؤں سے عورتوں کو مرد پر فوقیت حاصل ہے، عورتوں میں حیاء کا غلبہ ہوتا ہے، محبت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں، لطافت و نزاکت سے بھی قدرت نے عورتوں کو زیادہ حصہ دیا ہے، عورتوں میں جذب و کشش زیادہ ہے اور اسی باعث وہ مردوں کے قلب و ذہن پر بھی چھا جانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہیں، صلاحیتوں کے اسی فرق کی وجہ سے اسلام نے اندرونِ خانہ کی ذمہ داریاں عورتوں کو سپرد کی، کہ وہ اپنی اولاد کو، اپنے شوہر کو، بھائی بہنوں

اور اہل خاندان کو جو تحفۂ محبت دے سکتی ہیں اور گھر میں محبت و سکون کی فضاء کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ مرد نہیں کر سکتا اور بیرونِ خانہ کی جدوجہد اور جانفشانیوں کو جس طرح مرد انجام دے سکتا ہے، عورتیں انجام نہیں دے سکتیں۔

یہ ایک فطری تقسیم ہے اور اس میں خاندانی نظام کا بقاء ہے، مغربی معاشرہ میں خاندانی نظام کا کوئی وجود باقی نہیں رہا، اس بکھرنے ان کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے، مرد ہو یا عورت، نہ ان کو گھر کے اندر سکون نصیب ہے اور نہ گھر سے باہر، اسی لئے مغربی سماج میں منشیات عام ہیں، جرائم کا رجحان روز افزوں ہے اور لوگ امن و سکون کی دولت کے لئے اسی طرح بے چین ہیں جیسے سخت دھوپ میں خوب پیاسا آدمی ٹھنڈے پانی کے لئے۔

پس، کیا ہم مغرب سے اس کی بے سکونی اور اضطراب و بے چینی کو خرید کرنا چاہتے ہیں؟

(۱۷ر جولائی ۱۹۹۸ء)

مردم شماری میں حصہ لینا — ایک اہم دینی فریضہ!

سیرت نبوی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اسلام کی تائید وتقویت اور مسلمانوں کے ملی وجود کی حفاظت کے لئے تمام اسباب اختیار کرنے چاہئیں، جو اس زمانہ میں مروج ہوں اور ان میں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بہ کثرت اس کی مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نے دعوتِ توحید کے لئے پہلی دفعہ صفا کی پہاڑی کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر اہل مکہ کو اکٹھا کر کے اپنی بات کہی، یہ کوئی اتفاقی انتخاب نہ تھا؛ بلکہ پہلے سے اہل مکہ کا طریقہ چلا آرہا تھا، کہ کسی اہم بات کی اطلاع دینے کے لئے اسی مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلاتے تھے، گویا یہ اس زمانے کا ذریعۂ ابلاغ تھا اور مکہ شہر کی حد تک اس سے زیادہ وسیع الاثر کوئی اور ذریعہ ابلاغ موجود نہیں تھا، عرب میں دو ایسے اجتماعات ہوتے تھے، جن میں پورا جزیرۃ العرب امڈ آتا تھا، ایک حج اور دوسرے عکاظ کا تجارتی میلہ، ان دونوں اجتماعات میں بہت سی منکرات اور فواحش کا ارتکاب کیا جاتا تھا، حج میں تو بہر حال ایک پہلو عبادت کا بھی تھا، گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل اسوہ میں بہت کچھ آمیزشیں کردی گئی تھیں؛ لیکن عکاظ کے میلے کی نوعیت مذہبی نہیں تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ ''کل عرب سطح'' کے ان دونوں اجتماعات میں جاتے اور لوگوں پر دعوت اسلام پیش فرماتے، کیوں کہ اس وقت اس سے زیادہ موثر، زود رفتار اور وسیع الاثر کوئی اور میڈیا نہیں تھا۔

عربوں کا ایک قدیم قبائلی نظام تھا، جس کے مطابق قبیلہ کے ایک شخص کو پورے قبیلہ کی پناہ حاصل ہوتی تھی اور اگر قبیلہ کے ایک شخص کے خلاف بھی کوئی زیادتی کی جاتی تو پورا قبیلہ اسے اپنے آپ پر حملہ تصور کرتا تھا، آپ ﷺ بنو ہاشم میں تھے اور اس وقت اس قبیلے کی قیادت ابو طالب کے ہاتھ میں تھی، جو آپ کے چچا تھے؛ لیکن اولاد سے بڑھ کر آپ سے محبت رکھتے

تھے؛ اس لئے باوجودیکہ بنو ہاشم کی اکثریت ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور ابولہب جیسا بدترین دشمنِ اسلام اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا؛ لیکن اس کے باوجود ابوطالب کی وجہ سے آپ کو اس خاندان کی ایسی حمایت وحفاظت حاصل رہی کہ شعب ابی طالب جیسے دل گداز اور صبر آزما واقعہ میں بھی بنو ہاشم نے آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا اور عرب کے اس قبائلی پناہ دہی اور پناہ گیری کے نظام سے آپ نے بھرپور فائدہ اُٹھایا، اسی طرح آپ کے سب سے جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابن الدغنہ کی پناہ حاصل کرنے میں کوئی تکلف نہیں برتا۔

مدینہ جانے کے بعد آپ ﷺ نے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان بقاء باہم اور مدینہ کے مشترکہ دفاع کا ایسا معاہدہ کرایا جو اسلام کے سیاسی تصورات کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے؛ کیوں کہ اس معاہدہ کے مطابق مدینہ کے غیر مسلم قبائل کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دی گئی، ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام کا سبق دیا گیا اور بہ وقت ضرورت غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کسی علاقہ کی حفاظت اور دفاع کو قبول کیا گیا، اسی طرح فتح مکہ سے پہلے متعدد ایسے مشرک قبائل جو اس وقت تک اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، سے آپ ﷺ نے ناجنگ معاہدہ کیا؛ بلکہ مشکل وقتوں میں بحیثیت حلیف ایک دوسرے کی مدد کرنے کے معاہدے بھی کئے، بہ ظاہر اسلام میں "موالات" وغیرہ کے سلسلہ میں جو احکام ہیں، ہوسکتا ہے کہ بادیٔ النظر میں یہ معاہدات اس کے خلاف محسوس ہوں؛ لیکن در اصل ان سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے، کہ ہر عہد کی ضرورت، تقاضہ اور رسم و رواج کے مطابق اسلام کو سربلند کرنے اور اُمتِ مسلمہ کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ اعداءِ اسلام کے مقابلہ میں قوت بھر تیاری کرو: "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" (الانفال:۶۰) کیا اس کا مطلب صرف اسلحہ اور جنگی طاقت کا فراہم کرنا ہے؟ غالباً ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ہر طرح کی طاقت اس میں داخل ہے، کبھی علم کی طاقت ہتھیار کی طاقت پر فائق ہوتی ہے، جس کی مثال آج جاپان ہے، کبھی سیاسی طاقت کے ذریعہ قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، ہندوستان میں برہمن ازم اسی کا جیتا جاگتا

نمونہ ہے، کبھی معاشی طاقت کی بنیاد پر انگلیوں پر گنی جانے والی قوم پوری دنیا کو اپنے چشم و ابرو کا تبع بنا کر رکھتی ہے؛ جیسا کہ اس وقت صیہونی طاقت کا حال ہے، غرض کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق اپنی طاقت کو بڑھانا اس طاقت کو مذہب وملت کی سربلندی کے لئے استعمال کرنا اور ظالموں کے تسلط سے بچنے کے لئے اس کو ڈھال اور نیام بنانا اُمت کا فریضہ اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ ہے۔

آج کی دنیا میں معیار کے ساتھ ساتھ تعداد و مقدار کی بھی بڑی اہمیت ہے، اس سے کسی قوم کا سیاسی مقام متعین ہوتا ہے، نظام مملکت کے نقشہ میں اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے، جو زبان کسی علاقہ میں بولی جاتی ہو، اس زبان کی قدر و قیمت بھی بولنے والوں کی تعداد پر منحصر ہے، اسی پس منظر میں تمام ہی ممالک میں اور خاص کر جمہوری ملکوں میں مردم شماری کو خاص اہمیت حاصل ہے، ہندوستان میں اس وقت ۹ رفروری سے چھٹی مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے، جو ۲۸ رفروری تک جاری رہے گی اور یکم مارچ نظر ثانی اور تبدیلی کی مہلت ہوگی، اس مردم شماری پر ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے، اس بار مردم شماری نسبتاً زیادہ تفصیل سے عمل میں آرہی ہے، جس میں مذہب، زبان اور معاشی حالات کے علاوہ معذورین اور ان کے حالات بھی مرکز توجہ ہوں گے اور ان ہی اعداد و شمار کی روشنی میں ملک میں آئندہ سیاسی، تعلیمی اور معاشی منصوبہ بندی ہو سکے گی۔

اُردو ہماری مادری زبان ہے اور عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جس میں علوم اسلامی کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو؛ بلکہ بعض موضوعات پر اردو میں ایسی کتابیں بھی آچکی ہیں، کہ شاید عربی میں بھی اس جیسی کتاب نہ ہو، فارسی حالاں کہ صدیوں سے مسلمانوں کی زبان ہے، اور ایک بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے؛ لیکن اردو نے صرف ڈیڑھ دو سو سال میں نہ صرف فارسی کی برابری حاصل کر لی ؛ بلکہ اسلامی فکر و عقیدہ، علم و عمل اور تہذیب و ثقافت کی نمائندگی میں غالباً فارسی سے بہت آگے جا چکی ہے، بدقسمتی سے آزادی کے بعد سے مسلسل اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے اور اس لئے حکومت کو بھی اردو کی طرف سے دانستہ

تغافل کا بہانہ ہاتھ آرہا ہے، مردم شماری میں اگر ہم اہتمام کے ساتھ مادری زبان کی حیثیت سے اُردو کا نام لکھائیں اور اعداد و شمار اس بات کو واضح کر دیں کہ اُردو بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، تو اس سے ہمیں اپنی زبان کی حفاظت میں سہولت بہم پہنچے گی اور ہماری اگلی نسلوں کو اپنے سلف کے اتنے عظیم الشان علمی اور دینی سرمایہ سے محروم نہیں کیا جاسکے گا۔

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ حالات میں مردم شماری میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک اہم ترین فریضہ ہے اور یہ اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کی مدافعت کی بے جا کوششوں کی ایک آئینی تدبیر ہے، اگر ہم نے اس موقع پر غفلت کی اور کوتاہی سے کام لیا، تو خاص کر موجودہ حالات میں یہ بہت ہی خسران کی بات ہوگی اور اپنی طاقت کے ضائع کرنے اور اپنی قیمت آپ گرانے کے مترادف ہوگا۔

یوں مردم شماری کا تصور بہت قدیم ہے؛ چوں کہ اس سے عوام کے مسائل کو سمجھنے اور خاص کر عوام کے مسائل کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، بائبل میں ہے کہ ''پہلی اسم نویسی سوریا کے حاکم رکوِ ریئس کے عہد میں ہوئی اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے'' (لوقا: ۲/۲،۳) یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کا ہے؛ لیکن غالباً اس کا تعلق سلطنت روما یا یہودا کی آبادی سے ہے، مردم شماری تو اس سے پہلے بھی ہوئی ہوگی؛ کیوں کہ بائبل کے عہد عتیق میں بھی مختلف موقعوں پر مختلف قوموں کے اعداد و شمار مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی مدینہ میں مردم شماری کرائی تھی اور اس کا ذمہ دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے لئے ان تمام لوگوں کے نام لکھو، جنھوں نے اسلام کا اقرار کیا ہے: ''اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام من الناس'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے شمار کیا تو اس وقت یہ تعداد پندرہ سو نکلی (بخاری، حدیث نمبر: ۳۰۶۰) بہ ظاہر یہ تعداد صلح حدیبیہ کے کچھ آگے یا پیچھے کی ہوگی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے فتح مکہ کے مجاہدین کی تعداد بھی بیان فرمائی ہے اور بعض روایتوں میں حجۃ الوداع کے موقع سے شرکاء کی تعداد جو ایک لاکھ سے کچھ

اوپر تھی، مذکور ہوئی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اعداد و شمار کے اکٹھا کرنے پر نظر رکھی جاتی تھی، خلافت راشدہ میں خاص کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی مختلف شہروں کے اعداد و شمار ملتے ہیں، مدینہ میں آباد لوگوں کے لئے تو آپ نے مستقل رجسٹر ہی مرتب کرا رکھا تھا اور اسی رجسٹر کے مطابق حسبِ مراتب اور حسبِ خدمت مال غنیمت اور باہر سے آنے والی اِعانتیں تقسیم کی جاتی تھیں، بعد کو بھی مسلمانوں کے دور میں مردم شماری کا سلسلہ رہا ہے، اسی لئے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے پس منظر میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس وقت اس بہار آفریں شہر کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔

اپنی قوت کا اظہار اسلام کی نگاہ میں کوئی اچھی بات نہیں ہے، کہ اس سے کبر کی بو آتی ہے؛ لیکن بعض دفعہ قومی اور ملی مصالح کے تقاضہ کے تحت یہی ناپسندیدہ بات پسندیدہ اور ناروا بات روا قرار پاتی ہے، غور کیجئے کہ جب رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ کے دوسرے سال عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے اور مشرکین —— جن کی نظر ایمانی اور روحانی قوت کے بجائے صرف جسمانی قوت پر ہوتی تھی —— نے مسلمانوں کے تواضع اور انکسار کو دیکھتے ہوئے ان کے کمزور ہونے کا طعنہ دیا، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو کسی قدر اکڑفوں کے ساتھ طواف کرنے کا حکم فرمایا، جو آج تک ''رمل'' کے نام سے حج کی ایک اہم ترین سنت ہے، فتح مکہ کے موقع سے اہل مکہ کو مرعوب کرنے اور قائد مشرکین ابوسفیان کو متاثر کرنے کی غرض سے آپ نے ایک خاص ترتیب سے مختلف قبائل کے الگ الگ فوجی دستے مرتب فرمائے اور ایک تنگ وادی سے جوش ایمان سے معمور اور جذبہ جہاد سے بھرپور قافلہ کو گذارا، نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ایسی تدبیر کرائی کہ ابوسفیان کو پھٹی آنکھوں اس لشکرِ جرار اور اس کے ہمت و حوصلہ اور جذبۂ و جوش کو دکھلایا؛ تاکہ اہل مکہ کو مقابلہ کی ہمت نہ ہو اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کی شب خاص طور پر آپ نے مسلمانوں کی فوج کو دور دور تک بکھر جانے، زیادہ سے زیادہ چولھے سلگانے اور کھانے پکانے کا اشارہ بھی دیا؛ تاکہ جب رات کی تاریکی میں مشرکین مکہ تا حد نگاہ اس لشکر کے چولہوں

کو دیکھیں اور عربوں کے طریقہ کے مطابق چولہوں کی تعداد کے مطابق افراد کا اندازہ کریں تو ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور ان کی ہمتیں شکستہ ہو جائیں، ان تدبیروں کا مقصد کبر اور اپنی برتری جتانا مقصود نہیں تھا؛ بلکہ یہ اس وقت کی مصلحت تھی اور اسے اسلام کی تائید و تقویت اور مسلمانوں کی حفاظت کے ایک مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

پس ہر دور میں اپنی قوت بڑھانے، اپنی طاقت کا اظہار کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کا دفاع کرنے کے الگ الگ ذرائع ہوتے ہیں، اس دور میں ان ہی ذرائع کو اختیار کرنا حکمت، فراست ایمانی اور اسوۂ نبوی کا تقاضا ہے۔

(۲۳؍فروری ۲۰۰۱ء)

❁ ❁ ❁

کلوننگ — اسلامی نقطۂ نظر

فروری ۱۹۹۷ء سائنس اور ایجاد و اکتشاف کی دنیا میں ایک ایسا مہینہ بن کر آیا، جسے شاید کبھی فراموش نہ کیا جا سکے، اسی مہینہ میں اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر ایان ولمٹ نے روزلین انسٹی ٹیوٹ کے تحت ایک ایسی بھیڑ کی پیدائش کا تجربہ کیا جس میں نر جانور سے کوئی مدد نہیں لی گئی، صرف مادہ کے ذریعہ یہ بھیڑ وجود میں آئی اور اس کا نام ''ڈولی'' رکھا گیا، یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو ۲۷۸ دفعہ ناکامی سے دوچار ہو کر کامیابی کی منزل تک پہنچا تھا، جہاں اس تجربہ نے سائنسی تجربہ کرنے والوں کو شادکام کیا، وہیں اس نے عام لوگوں کو محوِ حیرت کر کے رکھ دیا۔

اس تجرباتی عمل کو ''کلوننگ'' کا نام دیا گیا، کلوننگ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو یونانی لفظ ''کلون'' (Klon) سے ماخوذ ہے، کلون کے اصل معنی ''نئی پھوٹنے والی شاخ'' کے ہیں، کلوننگ (Cloning) کا لفظ اس وقت ہم شکل کی پیدائش یا نقل اُتارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے عربی میں اس کو ''استنساخ'' کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں ''فوٹو کاپی کرنا'' نباتات میں کلوننگ ایک زمانہ سے مروج ہے اور حیوانات پر ایک عرصہ سے اس کے تجربہ کا سلسلہ جاری ہے، ۱۹۵۲ء میں دو امریکی سائنس دانوں رابرٹ برگس اور سرتھامس کنگ نے کلوننگ کے ذریعے مینڈک کی پیدائش کو ممکن بنایا، ۱۹۹۳ء میں انسانی کلوننگ کی کوشش کی گئی اور اس میں ایک حد تک پیش رفت بھی ہوئی؛ لیکن اسے رحم میں نہیں ڈالا گیا، گویا تجربہ کو آخری مرحلہ تک پہنچانے سے اجتناب برتا گیا، فروری ۱۹۹۷ء میں ایک اور پیش رفت ہوئی اور ''ریگون یونیورسٹی، امریکہ'' میں کلوننگ کے ذریعہ دو ہم شکل بندروں کی پیدائش عمل میں آئی، بندر کا جسمانی نظام انسان کے جسمانی نظام سے بہت قریب تصور کیا جاتا ہے اور اسی مماثلت نے ڈاروِن کو اس غلط نظریہ تک پہنچایا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا اور ارتقائی منازل طے کرتے

ہوئے وہ انسان بنا ہے؛ حالاں کہ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص لکڑی کی کرسی اور میز کو دیکھ کر یہ قیاس کرنے لگے کہ کرسی اصل میں میز ہی تھی، میز ہی نے ترقی کر کے کرسی کا روپ اختیار کیا ہے۔

لیکن ''ڈاروِنزم'' سے قطع نظر یہ ضرور ہے کہ بندروں میں کلوننگ کے کامیاب تجربہ نے انسان پر اس تجربہ کے کامیاب اور بار آور ہونے کو امکان سے بہت قریب کر دیا ہے اور اگر مستقبل قریب میں انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی اطلاع ملے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے، سائنس کی اس نئی پیش رفت سے متعدد اعتقادی اور سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور کئی سوالات ہیں جو غور و فکر کے منتظر اور جواب کے متقاضی ہیں اور اس وقت ان تمام سوالات پر غور کرنا اور ان کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا غالباً قبل از وقت ہوگا، جب تک کہ اس کے نفع و نقصان کے تمام پہلو سامنے نہ آجائیں۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے نظام کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، قرآن مجید نے بار بار اللہ ہی کے خالق ہونے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق اللہ خود ہی فرماتا ہے: ''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ '' (الزمر:۶۲) ارشاد ہے کہ تخلیق کا تمام تر فیصلہ خدا ہی کے لئے مخصوص ہے: ''اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ '' (الاعراف:۵۴) قرآن چیلنج کرتا ہے کہ تمام لوگ مل کر بھی ایک مکھی تک کی تخلیق نہیں کر سکتے: ''لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ '' (الحج:۷۳) قدرت کا نظامِ تخلیق ایک ایسا رازِ سربستہ ہے کہ نہ ماضی میں اس سے پردہ اُٹھایا جاسکا ہے اور نہ مستقبل میں اُٹھ سکے گا، ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ مرد و عورت میں تولید کی بھرپور صلاحیت موجود ہے؛ لیکن پھر بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور ڈاکٹرس محرومی کے راز کو جاننے اور سمجھنے سے عاجز ہیں، تو کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش خدا کے نظامِ تخلیق میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ ہی کے خالق ہونے کی نفی ہوتی ہے؟ یہ ایک اہم اعتقادی سوال ہے!

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں خود کلوننگ کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا، کلوننگ کے عمل

کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا جسم بے شمار خلیوں سے مرکب ہے، جسم میں یہ خلیے مسلسل ٹوٹ کر ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے جاتے ہیں، یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ خلیہ کا ہر جزء خود ایک مکمل خلیہ بن جاتا ہے، ہر ایک خلیہ میں "مرکزہ" (Nuclus) اور ہر مرکزہ میں چھیالیس "کروموزوم" (Chromosome) ہوا کرتے ہیں، لیکن جنسی خلیے یعنی نر کے مادۂ منویہ اور مادہ کے بیضۃ المنی میں تیئیس تیئیس کروموزوم ہی ہوتے ہیں، یہ بھی قدرت کی ایک نشانی ہے، اس طرح نر و مادہ سے مل کر چھیالیس کی تعداد مکمل ہوتی ہے؛ تا کہ جب بچے کی تخلیق ہو تو اس میں ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات پیدا ہوں اور اسی لئے بچوں میں صورت وشباہت، رنگ وروپ اور مزاج واخلاق میں ماں اور باپ دونوں ہی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کلوننگ کا بنیادی فعل یہ ہے کہ مادہ کے بیضہ میں کسی خلیہ سے مرکزہ نکال لیا جاتا ہے اور جسم کے کسی اور حصہ کے خلیے سے مرکزہ نکال کر اس خلیہ میں ڈال دیا جاتا ہے، یہ مرد کے جسم سے بھی لیا سکتا ہے اور عورت کے جسم سے بھی، جسم کے دوسرے حصوں میں ایک مرکزہ چھیالیس کروموزوم کا حامل ہوتا ہے، اس طرح مرد وعورت سے مل کر کروموزوم کی یہ تعداد مکمل ہو جاتی ہے، اس لئے جنین کے وجود میں آنے کے لئے یہ فعل کافی ہو جاتا ہے، اب اگر کسی مادہ کے بیضہ میں اسی کے جسم سے حاصل کیا ہوا مرکزہ ڈال دیا جائے تو نر سے اتصال کے بغیر بچہ کی پیدائش عمل میں آسکتی ہے اور چوں کہ اس میں صرف اس مادہ کے کروموزوم ہیں، اس لئے وہ بچہ شکل وصورت کے اعتبار سے اسی عورت کے مشابہ ہوگا، اگر مادہ کے بجائے کسی نر کا "کروموزوم" رکھا گیا ہو، تو چوں کہ بچہ کے جسم کی تشکیل صرف اس نر کے کروموزوم سے ہوئی ہے، اس لئے بچہ میں پوری مماثلت اسی نر کی ہوگی، پھر جب بار آوری کا مرحلہ طے ہو جائے تو جنین کی افزائش کے لئے اسے مادہ کے رحم میں ڈالنا ہوگا اور عام تولیدی نظام کے مطابق مادہ بچہ کو جنے گی، چاہے اسی مادہ کے رحم میں ڈالا جائے جس کا بیضہ ہے یا کسی اور مادہ کے رحم میں،

یہ بات بھی واضح رہے کہ کلوننگ سے جسمانی مماثلت پیدا ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ فکر وشعور اور مزاج واخلاق کے اعتبار سے بھی ان میں مماثلت پائی جائے؛ کیوں کہ ان اُمور کا تعلق محض

مادۂ تخلیق سے نہیں ہوتا؛ بلکہ تعلیم و تربیت، سماجی اور خاندانی ماحول ان اُمور میں زیادہ مؤثر اور دخیل ہوتے ہیں۔

کلوننگ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کلوننگ سے پیدائش کے لئے بھی مادہ کا بیضہ ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ بیضہ کے بار آور ہونے کے بعد اسے مادہ کے رحم میں ڈالا جائے اور عام تخلیق نظام کے مطابق چھیالیس کروموزوم کا وجود بھی ضروری ہے؛ البتہ اس طریقہ پیدائش میں نَر کا واسطہ ضروری نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انسان نے تخلیق کی قدرت حاصل کر لی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو تدبیر کی قدرت دی ہے، شوہر و بیوی کا اتصال بھی ایک تدبیر ہے، جو بچہ کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے، اس تدبیر کو نتیجہ خیز بنانے کا نام تخلیق ہے، اس پر کسی انسان کو قدرت نہیں، اسی ڈولی کی پیدائش کی کوشش میں ۲۷۸ تجربات ناکام ہوئے اور سائنس داں اس بات کو بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ تجربات کیوں ناکام ہوئے اور اسی طرح کا ایک تجربہ کیوں کامیاب ہوسکا؟ ایک صاحب ایمان کے لئے یہ کامیابی اور ناکامی نہ اچنبھے کی بات ہے اور نہ حیرت و تعجب کی، اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر تدبیر امر الٰہی کے تابع ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نہ ہو، کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی، قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو مرد سے اتصال کے بغیر تنہا عورت سے بچہ کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، حضرت حوا علیہا السلام کے بارے میں کہا ہے کہ تنہا مرد سے ان کی پیدائش عمل میں آئی، اس لئے اگر کلوننگ کے ذریعہ تنہا عورت سے کسی بچہ کی پیدائش کا واقعہ پیش آئے تو یہ قرآن کی تصدیق ہوگی نہ کہ تکذیب اور یہ اسلام کے تصورِ تخلیق کی موافقت ہوگی، نہ کہ اس کی مخالفت۔

کلوننگ سے متعدد شرعی مسائل بھی متعلق ہیں: کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش کی صورت میں نسب ثابت ہوگا؟ نسب اس عورت سے متعلق ہوگا جس کا بیضہ لیا گیا ہے یا اس عورت سے جس کے رحم میں جنین کی پرورش ہوئی ہے؟ کیا یہ بات درست ہوگا کہ کسی اجنبی مرد کے مرکزہ کو عورت کے بیضہ میں رکھا جائے؟ کیا خود شوہر و بیوی کے درمیان ایسا عمل کیا جاسکتا

ہے؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ وہ لا ولد ہوں ؟ کسی شخص کے کروموزوم سے جس بچہ کی پیدائش ہوگی وہ اس شخص کا بھائی تصور کیا جائے گا یا بیٹا؟ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی صورت میں اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

بادیٔ النظر میں انسان کے معاملہ میں کلوننگ ایک خطرناک اور مضرت رساں تجربہ ہوگا، اس کی وجہ سے اولاد کے لئے نکاح کی احتیاج کم ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ اس طرح نکاح کی شرح بھی کم ہوگی، اس سے جو سماجی مسائل پیدا ہوں گے وہ محتاجِ اظہار نہیں، کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچے اپنی شناخت اور خاندان سے محروم ہوں گے اور اس طرح خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا، اسلام میں زنا کی حرمت اور نکاح کی اہمیت کا منشاء اس کے سوا کیا ہے کہ نسب کی حفاظت ہو اور خاندان کی تشکیل عمل میں آسکے؟ اس سے تلبیس اور فریب کا دروازہ کھلے گا، جرائم پیشہ لوگ اپنے ہم شکل بچوں کے وجود میں آنے کی تدبیریں کریں گے؛ تا کہ فریب اور دھوکہ دہی سے کام لے سکیں، اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس تدبیر سے پیدا ہونے والے بچے بعض فطری صلاحیتوں سے محروم اور نقائص کے حامل ہوں؛ کیوں کہ جب کوئی کام فطرت کے عام اُصول سے ہٹ کر کیا جاتا ہے تو ضرور وہ منفی اثر سے دوچار ہوتا ہے، اس لئے قدرت نے تخلیق کا جو عام طریقہ رکھا ہے، اس کو چھوڑ کر غیر فطری راستہ تلاش کرنا بے وقوفی بھی ہے اور انسانیت کے ساتھ ظلم بھی۔

تاہم کلوننگ کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جن سے طبی فوائد اُٹھائے جاسکتے ہیں اور وہ صورت ہے ''جین کلوننگ'' (Gene Cloning) کی، کروموزوم دراصل چھوٹے چھوٹے دانوں سے مرکب ہوتا ہے، یہی دانے جین (Gene) کہلاتے ہیں، انسان کی صحت اور بیماری سے ان دانوں کا گہرا تعلق ہوتا ہے، اب یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ کسی جین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا جین رکھ دیا جائے، لہٰذا اگر کوئی جین کسی خاص مرض کا باعث ہو اور اسے نکال کر اس کی جگہ دوسرا صحت مند جین رکھ دیا جائے تو اس طرح اس بیماری کا علاج ممکن ہے، ظاہر ہے کہ کلوننگ کی یہ صورت جائز ہوگی اور یہ علاج کی قبیل سے ہوگا اور شاید اس طریقۂ علاج سے

ایسے امراض کا علاج بھی ممکن ہو جن کو لا علاج سمجھا جاتا ہے، جیسے کینسر اور ایڈز وغیرہ اور یہ اس حدیث کی تصدیق ہوگی جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج پیدا نہ کیا ہو۔

(۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء)

لائی ڈیٹکٹر — اسلامی نقطۂ نظر

جرائم میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے، جرائم کی تحقیق و تفتیش کے لئے بھی نت نئے آلات و وسائل ایجاد کئے جا رہے ہیں، ایسے ہی آلات میں ایک وہ برقی آلہ ہے جسے لائی ڈیٹکٹر (Lie Detector) ، یعنی ''جھوٹ کا مخبر'' کہا جاتا ہے، مغربی ممالک میں اس کا استعمال زیادہ ہے اور عرصہ سے جاری ہے؛ لیکن ہندوستان میں ماضی قریب ہی میں یہ آلہ متعارف ہوا ہے، یہ آلہ دراصل انسان کی ان اندرونی کیفیات کا چغل خور ہے جن کو انسان چھپانا چاہتا ہے۔

اس طریقۂ تفتیش کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر مجرم کسی سوال کا خلاف واقعہ جواب دے اور جھوٹ بولے تو اس کی اندرونی کیفیت میں فرق آجاتا ہے، دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، سانس پھولنے لگتی ہے، پھر اندرونی کیفیت کا اثر جسم کے بیرونی حصے پر بھی پڑتا ہے، اس کا ہاتھ انجانے میں گردن اور چہرے کی طرف اُٹھتا ہے، گفتگو میں ہچکچاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، کبھی کبھی کاندھے کو اُچکاتا ہے، وہ اپنے مخاطب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات اسے پسینہ بھی آجاتا ہے، گویا جسم کا اندرون اور بیرون دونوں ہی اس کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیتے ہیں، اگر انسان اپنی بیرونی کیفیت پر کسی طرح قابو بھی کر لے تو اندرونی کیفیت پر قابو پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اس میں ایک پہلو تو عبرت و موعظت کا ہے اور دوسرا پہلو فقہی اور قانونی ہے کہ شرعاً کسی جرم کو ثابت کرنے کے لئے یہ آلہ کس حد تک معتبر ہو سکتا ہے؟ عبرت و موعظت کا پہلو یہ ہے کہ انسان اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح گواہوں کے درمیان گھری ہوئی ہے؟ ایسے گواہ جن کی آنکھیں خلوت وجلوت یہاں تک کہ اس کے دل و دماغ کو بھی اپنے

احاطہ میں لئے ہوئی ہیں، انسان کوئی کام ہزار پردوں میں کرے پھر بھی خدا کی طرف سے ایسے گواہ موجود ہیں جو ان پردوں کو تار تار کر کے واقعہ تک پہنچ جاتے ہیں، دُنیا میں ان گواہوں نے اپنے آپ کو مہر بہ لب کر رکھا ہے؛ لیکن آخرت میں پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ یہ تمام رازہائے دروں کو کھول کر رکھ دیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دائیں اور بائیں کاندھوں پر ان فرشتوں کو بیٹھا رکھا ہے، جو ان کی نیکیوں اور برائیوں کو مسلسل لکھ رہے ہیں اور انسان کی آخری سانس تک لکھتے رہیں گے، پھر یہ ریکارڈ محفوظ ہو جائے گا اور قیامت کے دن انسان کے سامنے ان کی نیکیوں اور برائیوں کا میزانیہ پیش کیا جائے گا، انسان اپنے نامۂ اعمال کو دیکھتا جائے گا اور اقرار کے سوا چارہ نہیں پائے گا؛ لیکن کچھ لوگ اتنے ڈھیٹ ہوں گے کہ اس وقت بھی جھوٹ بولنے سے نہیں شرمائیں گے اور اپنی بداعمالیوں سے انکار کرنا چاہیں گے، تب ان کی زبان بند ہو جائے گی اور قوت گویائی ساتھ چھوڑ دے گی، جسم کا ایک ایک عضو اس کے خلاف گواہی دینے کے لئے بول پڑے گا اور ہر عضو یہ کہانی سنائے گا کہ اس شخص نے اس کو کن کن برائیوں کے لئے استعمال کیا تھا؟ یہاں تک کہ زمین اور جمادات بھی ان کی نیکیوں اور برائیوں کے احوال سنائیں گے اور انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

ایک زمانہ میں لوگ اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ انسان کی پوری زندگی کا نامۂ اعمال مرتب ہو تو اس کے لئے کتنی ہی جلدیں درکار ہوں گی، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ قیامت میں اس نحیف و نزار انسان کے ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال تھما دیا جائے؛ لیکن آج کے کمپیوٹر عہد میں اس قسم کا اعتراض بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، جب انسان ایک معمولی دو تین انچ کی ڈسک میں ہزاروں صفحات محفوظ کر سکتا ہے تو خدائے خبیر و علیم کے لئے ایک مختصر سے اعمال نامہ میں پوری انسانی زندگی کو محفوظ کرنا کیا دشوار ہے؟ اسی طرح جب دُنیا میں انسان کی اندرونی اور بیرونی کیفیات اس کے مجرم ہونے کی گواہی دیتی ہیں تو آخرت میں انسان کے اعضاء کا گواہ بننا کوئی ایسی بات نہیں جو ایک حقیقت پسند انسان کے لئے حیرت کا باعث ہو —— اگر انسان غور و تدبر

سے کام لے تو جتنی نئی سائنسی تحقیقات سامنے آرہی ہیں وہ اسلام کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے ذریعہ اسلام کے تصور آخرت کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جھوٹ کے اس آلہ کی رپورٹ کے مطابق جھوٹ کی وجہ سے سب سے زیادہ انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے اور قلبی کیفیات میں تغیر پیدا ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کے قلب پر اس کے گناہوں کا اثر پڑتا ہے، جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑتا ہے، اگر آدمی توبہ کرلے تو یہ دھبہ دُھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے، پھر جب دوبارہ وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور انسان اتنا بے توفیق ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گناہ پر ذرا بھی ندامت اور پشیمانی نہیں ہوتی، اسی طرح آپ ﷺ نے گناہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہر وہ بات گناہ ہے جس سے دل میں کھٹک پیدا ہو: ''الاثم ماحاک فی نفسک'' (ترمذی: باب الزہد) پس ارتکابِ جرم کی وجہ سے قلب کی کیفیات میں ظاہری تغیر معنوی تغیر کی دلیل اور تصدیق ہے۔

جھوٹ اسلام کی نظر میں غیر معمولی اور بدترین گناہ ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن سے سب کچھ ہو سکتا ہے؛ لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا، (احیاء علوم الدین: ۱۳۵/۳) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنا کسی بھی درجے میں مسلمانوں کے شایان شان نہیں، آپ ﷺ جو دُعائیں فرمایا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خداوندا! میرے قلب کو نفاق سے محفوظ رکھئے، بے عفتی سے حفاظت فرمایئے اور میری زبان کو جھوٹ سے بچایئے!! (احیاء علوم الدین: ۱۳۵/۳) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کو روا نہیں رکھا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولیں، (ابوداؤد: ۶۸۱/۲) بلکہ آپ ﷺ نے اس کو بھی منع فرمایا کہ آدمی بلا تحقیق ہر سنی ہوئی بات کو نقل کرتا جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے نقل کردے۔ (ابوداؤد: ۶۸۱/۲)

غرض جھوٹ ایک سنگین جرم ہے اور جیسے روحانی اعتبار سے انسان پر گناہ کا اثر پڑتا ہے، اسی طرح انسان جسمانی اور ذہنی طور پر بھی اس گناہ سے متاثر ہوتا ہے — بدقسمتی سے یہ گناہ اس وقت سماج میں اتنا عام ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص ملے گا جس کا دامن اس سے پاک ہو، آپ ﷺ نے بدترین جھوٹ، جھوٹی گواہی کو قرار دیا اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ چاول اور گیہوں کی طرح سماج میں جھوٹے گواہ بھی مل جاتے ہیں اور وہ بھی بہت ہی سستے داموں پر، قانون داں باضابطہ گواہوں کو جھوٹ بولنے کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کی تربیت دیتے ہیں، صحافت جس کا کام واقعات کو کسی کمی بیشی کے بغیر عام لوگوں تک پہنچانا ہے اور جسے بہر حال ناطرفدار اور حقائق کا ترجمان ہونا چاہئے، وہ بھی غیر واقعی خبریں شائع کرنے؛ بلکہ خبریں وضع کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتی، اربابِ سیاست کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک عیب نہیں؛ بلکہ ہنر ہے اور ہتھیلیوں میں جنت دکھانا سیاست کا اوج کمال، جھوٹے وعدوں اور جھوٹے دعووں کا اگر کوئی مقابلہ ہو تو شاید ہی کوئی طبقہ اہل سیاست پر بازی لے جاسکے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آخرت میں جوابدہی کا احساس اور عند اللہ حساب و کتاب کا یقین کمزور پڑ گیا ہے اور انسان نے اس دنیا سے آگے دیکھنا چھوڑ دیا ہے، جو لوگ خدا کے خوف اور جواب دہی کے احساس سے عاری ہوں، کوئی چیز ان کو جرم سے روک نہیں سکتی اور جو لوگ اپنی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوں، معمولی تنبیہ بھی ان کے لئے تازیانۂ عبرت بن سکتی ہے۔

جہاں تک اس آلہ کی وجہ سے کسی کو جھوٹا قرار دینے کی بات ہے تو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے اصل میں کسی جرم کے ثابت ہونے کے چار ذرائع ہیں: اول یہ کہ ملزم اقرار کرلے، اگر وہ اقرار نہ کرے تو مدعی اس کے خلاف گواہان پیش کرے، پھر مختلف معاملات میں گواہان کا نصاب الگ الگ ہے، زنا کے ثبوت کے لئے چار مرد گواہان مطلوب ہیں، قصاص اور حدود یعنی وہ جرائم کہ جن کی سزا شریعت کی جانب سے متعین ہے، کے مقدمات میں کم سے کم دو مرد گواہ ہونے چاہئیں، دوسرے مالی اور غیر مالی معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عوتوں کی گواہی

کافی ہے، اگر گواہان موجود نہ ہوں تو ملزم سے قسم کھلائی جائے گی اور قسم کھا کر وہ بری ہو جائے گا، فیصلہ کی چوتھی بنیاد قسم سے انکار ہے، یعنی اگر ملزم قسم کھانے سے انکار کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے جرم کا اقرار متصور ہوگا، اسی طرح اگر ملزم موقع دیئے جانے کے باوجود رفع الزام سے گریز کرتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے جرم کا اقرار تصور کیا جائے گا۔

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے یہ بنیادی ذرائع ہیں؛ لیکن اس کے علاوہ متعدد اور طریقے ہیں جن سے دعوے ثابت کئے جاتے ہیں، ان میں ایک ''قرائن قاطعہ'' ہیں، یعنی کسی بات کو ثابت کرنے والی ٹھوس علامتیں، جیسے کوئی شخص کسی مکان سے نکلے، اس کے ہاتھ میں خون سے لت پت چھری ہو، چہرہ سے خوف نمایاں ہو اور رفتار تیز ہو، پھر اسی وقت لوگ گھر میں داخل ہوں تو ایسی لاش دیکھیں جو تازہ خون سے لت پت ہو اور گھر میں کوئی اور شخص نہ ہو، تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ یہی شخص اس کا قاتل ہے، (البحر الرائق: ۲۰۵/۷) —— لائی ڈیٹکٹر کے ذریعہ کسی شخص کے جھوٹ کی تحقیق بھی در اصل قرائن ہی کی قبیل سے ہے اور کوئی ماہر نفسیات ہی ایسے شخص کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس آلہ کی رپوٹ کس درجہ اس کے سچ اور جھوٹ کو ظاہر کرتی ہے؟

تاہم میرا خیال ہے کہ سنگین جرائم کے ثبوت میں محض اس آلہ کی رپورٹ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ یہ آلہ اصل میں سچ اور جھوٹ کو ظاہر نہیں کرتا؛ بلکہ اندرونی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے، جھوٹے آدمی پر ایک طرح کا خوف طاری ہوتا ہے، یہی خوف ہے جس کی وجہ سے کیفیات میں تغیر رونما ہوتا ہے، اگر ملزم کسی اور وجہ سے دہشت زدہ ہو اور نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو، تب بھی اس میں یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؛ کیوں کہ بے خوفی کی وجہ سے ان کی کیفیات میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، گویا یہ نفسیاتی کیفیت خوف و وحشت کا مظہر ہے، نہ کہ جھوٹ کا یقینی ثبوت، اس لئے اس آلہ سے جرم کی تحقیق میں مدد تو لی جا سکتی ہے؛ لیکن محض اس آلہ کی رپورٹ جرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲۵؍ستمبر ۱۹۹۸ء)

محافظین قانون کے لئے لاقانونیت کا جواز

حکومت اور مملکت کی تشکیل کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم انسانی بستیوں کے بسنے اور آباد ہونے کی ہے؛ کیوں کہ انسانی سماج کے لئے یہ ایک فطری ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی شکل میں پیدا فرمایا ہے جو ایک دوسرے کی حد درجہ محتاج ہے، یوں تو ہر جاندار کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے؛ لیکن بہ مقابلہ انسان کے وہ ایک دوسرے کے کم محتاج ہیں، گائے اور بکری کے بچے چند دنوں میں خود مکتفی ہو جاتے ہیں، نہ ان کو اپنے چارہ کے لئے خود زراعت کرنی ہوتی ہے کہ مزدوروں کے محتاج ہوں، نہ ان کو کسی تاجر سے خوراک و پوشاک خریدنی ہے، اور نہ کسی باورچی سے پکوان کرانا ہے؛ لیکن انسان اپنی ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ہی جیسے کتنے ہی انسانوں کا محتاج ہے، اسے سامان خریدنے کے لئے تاجر کی، اناج کے لئے کاشتکار کی، پکوان کے لئے باورچی کی، سلائی کے لئے درزی کی، اور سواری کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے اور نجانے زندگی کے مختلف مسائل میں وہ کتنے ہی لوگوں کا محتاج ہے، اپنے ہم جنسوں پر ظلم و زیادتی کا غصہ بھی انسانوں میں بہ مقابلہ بہت سی مخلوقات کے زیادہ ہے، حکومت سماج کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے، تاکہ ان کی ضرریات پوری ہوسکیں، اور سماج میں عدل و انصاف قائم رہ سکے، قیام حکومت کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں، اگر حکومت کسی طبقہ کے ظلم کو جواز عطا کر دے، تو اس سے زیادہ کوئی امر باعث افسوس نہیں ہوگا۔

اس وقت ہندوستان میں پولیس اور سیکوریٹی عملہ کی ظلم و زیادتی ضرب المثل بنی ہوئی ہے، ان حضرات کی طرف سے عوام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، عام طور پر ان کے سلسلہ میں گواہان کا ملنا دشوار ہوتا ہے: کیوں کہ گواہی دینے والوں کو بھی اپنی خیر منانی پڑتی ہے، بعض

واقعات میں لوگ بہ تقاضۂ حیا بھی سکوت اختیار کر لیتے ہیں، چند ہی مقدمات عدالتوں اور انصاف کے اداروں تک پہنچ پاتے ہیں، پھر مجرم کو شبہہ کا فائدہ پہنچنے کی وجہ سے اِکا دُکا کیس ثابت ہو پاتا ہے، اس پر جو سزائیں دی جاتی ہیں، ان کی نوعیت بھی اکثر بہت معمولی ہوتی ہے، مظلوم تو بے چارہ جان سے بھی گیا؛ لیکن ظالم زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں کے لئے معطل کر دیا گیا، یا چند مہینوں کی قید ہوگی۔

ہماری حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ سرکاری عملہ سے ان کے مظالم کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی ہو اور ان کے انسانیت سوز مظالم پر معمولی گوشمالی بھی کی جائے؛ چنانچہ حکومت بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کر رہی ہے کہ سیکوریٹی فورس سے متعلق انسانی حقوق کی پامالی کی بابت مقدمات میں انھیں چھوٹ دی جائے اور ان کے جرم سے درگذر کیا جائے ، یہ گویا مجرموں کی پیٹھ تھپکنا ہے، کہ تم نے جو کچھ کیا، خوب کیا ہے، یہ بالکل ناقابل فہم بات ہے، سیکوریٹی فورس امن فراہم کرنے ، مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے ہاتھ تھامنے اور معاشرہ میں عدل وانصاف کو نافذ کرنے کے لئے ہے، اس اعتبار سے اگر سیکوریٹی فورس کے لوگ ایسے جرائم کے مرتکب ہوں تو وہ نسبتاً زیادہ سزا کے مستحق ہیں؛ کیوں کہ وہ نہ صرف ایک جرم کے مرتکب ہیں؛ بلکہ وہ جس کام کی روٹی کھا رہے ہیں، انھوں نے عین اس کے برعکس حرکت کا ارتکاب کیا ہے، چوکیدار اس لئے ہے کہ وہ چور کو روکے؛ لیکن اگر چوکیدار خود چور بن جائے، تو پھر کون ہوگا جو چور کا ہاتھ تھام سکے؟

اسلامی تعلیمات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ مجرم بہر حال مجرم ہے اور کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، یہاں تک کہ سربراہ مملکت بھی اسی قانون کا پابند ہے، جو دوسروں سے متعلق ہے، اس کے لئے بھی کوئی چھوٹ اور استثناء نہیں، اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عرب کے ایک معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے چوری کا ارتکاب کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، لوگوں کو یہ بات بہت گراں گذری، انھوں نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں سفارش کریں؛ لیکن سفارش کون

کرے؟ چنانچہ آپ کے محبوب حضرت زید بن حارثہؓ کے محبوب بیٹے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو سفارش کے لئے وسیلہ بنایا گیا، جب حضرت اسامہؓ نے آپ ﷺ سے سفارش کی، تو آپ بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ اگر ان کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتیں تو ان کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔

خلفاء راشدین نے بھی تمام لوگوں کے لئے انصاف کی ایک ہی ترازو رکھی، حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو قاضی مقرر فرمایا تھا، ایک مقدمہ میں ایک صاحب نے حضرت عمرؓ کو مدعی علیہ بنایا، قاعدہ کے موافق اگر مدعی گواہان پیش نہ کر سکے، تو مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے؛ چنانچہ اس اعتبار سے حضرت عمرؓ کے ذمہ قسم کھانا تھا؛ لیکن حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت عمرؓ کے مقام کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے فریق سے خواہش کی کہ امیر المومنین کو قسم سے سبک بار کر دیں، حضرت عمرؓ کو حضرت اُبی بن کعبؓ کی یہ بات پسند نہیں آئی، کہ وہ عدل کے معاملہ میں ان کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کریں اور مقدمہ کے دو فریق کے درمیان یکسانیت میں فرق آنے دیں؛ چنانچہ آپ نے اس پر اپنی ناگواری اور ناخوشی کا اظہار فرمایا۔

حضرت علیؓ کے زمانہ کے ایک مشہور قاضی قاضی شریح ہیں، جنھیں طویل عرصہ اور کئی خلفاء کے عہد خلافت میں کار قضاء انجام دینے کا موقع ملا، حضرت علیؓ کے خلاف خود ان کے عہد خلافت میں ایک یہودی نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، حضرت علیؓ نے اپنی طرف سے دو گواہان پیش کئے، حضرت حسنؓ، جو آپ کے صاحبزادہ ہیں اور جن کی توثیق وتحسین خود دربار نبوت سے ہو چکی تھی اور قنبرہ جو آپؓ کے غلام تھے، قاضی شریح نے بے تکلف دونوں شہادتیں یہ کہہ کر رد کر دیں، کہ بیٹے کی شہادت باپ کے اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں اور اس طرح فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف ہو گیا، وہ یہودی اسلامی عدالت کے اس بے باک انصاف سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مشرف بہ اسلام ہو گیا، ایسی کتنی ہی مثالیں ہمیں نہ صرف عہد صحابہ میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی ملتی ہیں، عہد اموی میں حضرت عمر

بن عبد العزیزؒ کے یہاں، عباسی دورِ حکومت میں اور خود ہندوستان کے مغلیہ عہد میں آپ کو اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گی، یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر ہے؛ بلکہ یہ بنیادی انسانی مسئلہ ہے، انصاف کا پیمانہ تو اپنوں ہی کے لئے نہیں، بیگانوں کے لئے بھی ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی گروہ تمہاری نگاہ میں بڑا ہو، تب بھی تمہیں انصاف اور عدل کے معاملہ میں کوئی دوئی نہیں برتنی چاہئے اور ایک ہی سلوک روا رکھنا چاہئے، (المائدۃ:۸) حضرت عمرؓ نے خود اپنے بیٹے پر حد جاری فرمائی اور بعض روایتوں کے مطابق اسی میں ان کی وفات ہوگئی۔

حضرت عمرؓ کی شہادت 'فیروز' نامی ایک مجوسی کے ہاتھوں پیش آئی، حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبید اللہ بن عمرؓ نے اس جوش میں دو غیر مسلموں ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا، حضرت عثمانؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس سلسلہ میں مشورہ کیا، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ قصاص کے بہ طور عبید اللہ بن عمرؓ کو قتل کر دیا جانا چاہئے، اس وقت کسی طور وہ بچ گئے، تو پھر حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان سے قصاص لینا چاہا؛ لیکن وہ حضرت معاویہؓ کی طرف چلے گئے اور جنگ صفین میں مارے گئے۔

یہ بات کہ کسی خاص طبقہ کو ان کی زیادتیوں سے بری کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں ان کو جرم کی چھوٹ دے دیتا ہے، بالخصوص جو لوگ قیام امن کے ذمہ دار ہوں، اگر انھیں کو بد امنی اور قانون شکنی کی چھوٹ دے دی جائے، تو کسی اور سے کیوں کر توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ عدل و انصاف پر قائم رہ سکیں گے۔

عدل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ انسان عام معاملات میں عدل کو قائم رکھے؛ بلکہ انسان کی صلاحیت کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اشتعال کے مواقع پر بھی عدل کی روش سے منحرف نہ ہو، جب فریق مخالف کا رویہ آپ کی انا کو ٹھیس پہنچائے اور جذبات کو برانگیختہ کر دے، اس وقت بھی آپ اپنے آپ پر قابو رکھیں، غصہ کو پینا اور بے قابو کر دینے والے افعال و محرکات کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھنا انسان کا بہت بڑا اخلاقی جوہر ہے، اسی کو قرآن نے ''صبر'' اور ''کظم غیظ'' سے تعبیر کیا ہے، (آل عمران:۱۳۴) رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے؛ بلکہ اصل بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ہمارے جوانوں کو اس بہادری کا سبق دیا جانا چاہئے۔

کیا بہتر ہوتا کہ حکومت لاقانونیت کو قانونی جواز دینے کے بجائے ہمارے فوجیوں اور پولیس جوانوں کے لئے اخلاقی تربیت کے کیمپ منعقد کرتی، اس میں مذہبی اور اصلاحی شخصیتوں کی خدمات سے بھی استفادہ کرتی، انھیں تشدد کے بغیر جرائم کے سدباب کی تدابیر سے روشناس کراتی اور ان کو اپنے عمل اور ردعمل کے بارے میں زیادہ جواب دہ بناتی، اس وقت ہمارے ملک میں صورت حال یہ ہے کہ پولیس اور فورسیز نہایت ہی ''خوفناک طبقہ'' سے عبارت ہے، جن کے نام سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے کسی بھی طرح بہتر نہیں کہا جا سکتا، یہ نہایت بدبختی کی بات ہوگی کہ جو لوگ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں لڑا دیتے ہیں، اپنا خون اور لہو نثار کر کے مادر وطن کی حفاظت کرتے ہیں، نہایت ہی مشکل ترین حالات میں قوم کی مدد کے لئے آگے آتے ہیں، ان کی شبیہ کسی قدر اخلاقی تربیت کے فقدان کی وجہ سے قوم کی نگاہ میں اتنی خراب اور قابل نفرت ہو جائے اور ہم اس صورت حال کی اصلاح کے بجائے ایسے قوانین بنائیں جس سے اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہو، نہ کہ کمی۔

اس لئے کوئی بھی ایسا قانون جو امن کے نام ہر ظلم کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہو، جو قانون کے نام پر لاقانونیت کے لئے گرین سگنل ہو اور جو انسانی قدروں کی پامالی اور جواب دہی سے بلا سبک باری، مجرموں کے بجائے معصوم شہریوں پر دست درازی اور خود مجرموں کے خلاف جرم کی مقدار سے بڑھ کر ردِعمل کا جواز فراہم کرتا ہو اور کسی انسانی گروہ کو اپنے رویہ کے بارے میں غیر ذمہ دار ہونے کا موقع فراہم کرتا ہو، انسانیت کے ساتھ بدترین ظلم اور جنگل راج قائم کرنا ہے اور ملک کے تمام محب وطن شہریوں کا فریضہ ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حکومت کے ایسے عزائم کو روکنے کی کوشش کریں۔

(۱۴ر ستمبر ۲۰۰۱ء)

میچ فکسنگ — مرض اور علاج

جب کسی سماج میں برائی در آتی ہے تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتی؛ بلکہ ہر جگہ آہنی پنجہ گاڑ دیتی ہے، اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن کا کچھ ایسا ہی حال ہے، پہلے نیچی سطح کے ملازمین تھوڑی بہت رشوت لیا کرتے تھے، پھر پولیس والوں نے اس میں قدم رکھا، اور اس فن میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ جیسے گالی گلوج اور بدزبانی سے پولیس پہچانی جاتی تھی، اب کرپشن بھی اس طبقہ کے لئے ''وجہ شناخت'' ٹھہری، پھر اعلیٰ عہدیداروں میں اس مرض نے سرایت کیا، یہاں تک کہ وزراء اور مقننہ نے سوچا کہ عوامی نمائندہ ہو کر ہم اس ''کارِ خیر'' میں پیچھے کیوں رہیں؟ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء اور چوٹی کے سیاست داں اس میں ملوث ہوئے اور ایسے ایسے اسکینڈل سامنے آئے کہ ماضی میں کسی وزیر اور مقتدر سیاسی رہنما کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اب صورت حال یہ ہے کہ جو محکمہ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے ہے بعض اوقات وہ خود اس میں ملوث ہو جاتا ہے اور اس وقت ایک معزز جج بھی رشوت کے مقدمہ میں ماخوذ ہیں، جب عدل و انصاف اور بُرائی کے سدباب کے ایسے باوقار ادارے اور ملک کے اعلیٰ ترین رہنما اور قائدین اس حمام میں بے لباس ہوں تو اوروں کا پوچھنا ہی کیا ہے؟

اس وقت ایک نیا قضیہ کرکٹ بورڈ کا اٹھا ہے، کھلاڑی تو بہر حال کھلاڑی ہی ہیں، جن کی پوری زندگی تماشابینوں کے لئے وقف ہے، جیسے ہی میچ فکسنگ کا ایک واقعہ سامنے آیا اور ایک کھلاڑی نے اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے پیسے لے کر قصداً اپنے کھیل کود کو کمزور کرنے کا اعتراف کیا، ایسا لگا کہ گویا ایک طوفان سا آگیا اور میچ فکسنگ میں ہند و پاک کے بڑے بڑے نامی گرامی اور ناظرین کے محبوب و پسندیدہ کھلاڑیوں کا نام آنے لگا، یہاں تک کہ حکومت کو کرکٹ بورڈ کے شائقین کے جذبات کی تسکین کے لئے تحقیقات کی بابت فیصلہ کرنا

پڑا، حکومت ہند نے سابق آل راونڈر منوج پربھاکر کو تیقن دیا ہے کہ اگر وہ ۱۹۹۴ء میں ایک میچ میں خراب مظاہرہ کے لئے رشوت پیش کرنے والے ساتھی کھلاڑی کا نام بتادیں تو انھیں مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا، بعض قتل کے مشتبہ واقعات کے بارے میں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اس کا مقصد میچ فکسنگ کی شہادتوں کو مٹانا ہے اور اتنے کھلاڑیوں کے نام اس ضمن میں آرہے ہیں کہ گورنمنٹ کا ایک بیان یہ بھی آیا ہے کہ جو کھلاڑی اپنی غلطی کا اعتراف کرلے انھیں معاف بھی کیا جاسکتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رشوت خوری کس طرح ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کرگئی ہے اور اس کی اصل وجہ ظاہر ہے کہ جوئے بازی ہے، ٹیموں کی جیت ہار پر شائقین کا بازی لگانا اور جوے کھیلنا ایک ایسا مرض ہے جس نے بہت بڑے طبقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور اس طرح لاکھوں کروڑوں روپے جو یقیناً سخت محنت سے حاصل کئے جاتے ہیں، وہ لایعنی اور بے مقصد طریقہ پر خرچ ہوجاتے ہیں، جو یقیناً قوم کے لئے نقصانِ عظیم سے کم نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کھیل میں مقابلہ کی جو جائز صورتیں ہیں ان میں بھی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ جوئے سے پاک ہو، قرآن مجید نے جوئے کی سخت مذمت کی ہے، جوے کا ذکر شراب اور مشرکانہ افعال کے ساتھ کیا ہے، پھر اسے نجاست اور ناپاکی "رجس" قرار دیا ہے، نیز آگے اس کو فعل شیطانی قرار دیا گیا ہے: "رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ" (المائدۃ:۹۰) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جوا اور قمار اسلام کی نگاہ میں کتنی بدترین چیز ہے؟ قرآن مجید نے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جوا سماج میں بغض و عداوت کو جنم دینے اور اس کو بڑھانے کا شیطانی ذریعہ ہے (المائدۃ:۹۱) قمار کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ دوسرے کا مال حاصل کرنے کا غیر فطری طریقہ ہے، کمائی کے بنیادی طور پر دو ہی فطری ذرائع ہیں، یا تو مال کے بدلے مال ہو، یا انسانی محنت کے بدلہ، جوئے کی صورت میں مال کا حاصل ہونا اور نہ ہونا محض ایک اتفاقی امر ہوتا ہے، نہ مال دے کر مال حاصل کیا جاتا ہے، نہ محنت کرکے مال حاصل کیا جاتا ہے، اس سے انسان بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کا عادی ہوجاتا ہے اور تمام

مجرمانہ افعال کی بنیاد اصل میں یہی ذہنیت ہے، پھر جس کو نقصان ہوتا ہے اس کو بھی یہ بات گراں گذرتی ہے کہ ایک شخص نے بغیر کسی سعی و محنت کے میرا قیمتی مال ہتھیا لیا، اس سے دلوں میں نفرت و عداوت کی تخم پڑتی ہے اور بغض و حسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور بعض اوقات نہایت ہی ناگفتہ بہ واقعات پیش آجاتے ہیں، جوئے کے لئے کوئی عقلی جواز بھی نہیں، غور فرمایئے کہ فتح وشکست تو ''الف'' اور ''ب'' کے درمیان ہوئی، ''ج'' اور ''د'' کا نہ جیتنے میں کوئی دخل ہے اور نہ ہارنے میں؛ لیکن ہوا یوں کہ ''ج'' نے ''د'' کو محض ایک زبانی شرط کی بنیاد پر کثیر رقم ادا کی، غور کیجئے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی عقلی جواز ہے؟؟

جیت اور ہار میں بھی اسلامی تصور یہ ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف طریقہ پر ہو، کوئی ایسا مصنوعی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو کھیل کے مقابلہ میں غیر حقیقی نتیجہ کو ظاہر کرے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لا جلب ولا جنب'' (ابوداود، کتاب الزکوۃ باب این تصدق لاموال) یعنی جلب اور جنب درست نہیں ہے ''جلب'' سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص گھوڑ دوڑ کے مقابلہ میں شریک ہو، اس کے گھوڑے پر اس طرح چیخا اور آواز لگایا جائے کہ اس میں دوڑ کی خصوصی اُمنگ پیدا ہو جائے اور ''جنب'' سے مراد یہ ہے کہ جس گھوڑے کو دوڑ کے مقابلہ میں شریک کیا گیا ہے، اس گھوڑے کے ساتھ دوسرا گھوڑا بھی رکھا جائے، یہاں تک کہ جب سواری کا اصل گھوڑا سست گام ہو تو سوار چالاکی کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جائے، (بدل المجهول : ۲۶/۳، ط:ہند) گویا ہار جیت میں دھوکہ سے کام لیا جائے یا خارجی طریقہ پر اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھائی جائے۔

اس حدیث سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف ہونا چاہئے، خارجی عوامل کے ذریعہ مقابلہ کو متاثر کرنا درست نہیں، پھر کھیل میں اپنی کارکردگی کو متاثر کرنے کے پیچھے مالی حرص وطمع کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور رشوت لے کر معاملات طے کئے جاتے ہیں، جو بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو: ''لعنة الله على الراشي والمرتشي'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۲۳۱۳) بعض

احادیث میں رشوت کو دوزخ کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے؛ بلکہ جو شخص رشوت میں واسطہ بنتا ہو اور بچولیئے کا کردار ادا کرتا ہو اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی لعنت بھیجی ہے: ''والرائش الذی یمشی بینھما '' (مسند احمد: ۲۷۹/۵) اس لئے یہ نہایت ہی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی حرکت ہے، اصل یہ ہے کہ جب انسان کے اندر حرص و طمع گھر بنالیتی ہے، تو پھر انسان کی پیاس بجھتی نہیں ہے، اگر اسے ہفت اقلیم بھی ہاتھ آجائے تب بھی اس کی طلب ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتی رہے گی، عام طور پر کھلاڑیوں کی آمدنی بڑے بڑے تاجروں اور اعلیٰ ترین سرکاری ملازمین اور عوامی نمائندوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور جو شہرت انھیں حاصل ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے باوجود مال کی ایسی نہ بجھنے والی پیاس ناقابل فہم نظر آتی ہے!

اس پس منظر میں یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی استحکام، معاشی بہبود، سائنسی ترقی، عوام کے لئے وسائل سہولت کی فراہمی وغیرہ پر تو دن رات محنت ہو رہی ہے؛ لیکن سماج میں اخلاقی قدروں کو بلند کرنے اور انسانوں کو انسان بنانے کی کوئی منظم اور منصوبہ بند سعی نہیں ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سنگین جرائم میں ملوث پائے جا رہے ہیں، کرپشن نے عدل و انصاف اور قانون کے اعلیٰ ترین اداروں تک رسائی حاصل کرلی ہے، ملک کے انٹرنیشنل کھلاڑی جو آج کے مزاج کے مطابق ملک کا وقار اور اس کے لئے عزت و آبرو کا اثاثہ سمجھے جاتے ہیں، وہ ملک سے باہر جا کر چند پیسوں میں قوم کی عزت اور خود اپنی عزت و آبرو کا سودا کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے، قانون اور مادی وسائل کے ذریعہ ان بیماریوں کا علاج نہیں ہوسکتا، جب تک ہم سماج کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے اور ہر طبقہ میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں، ایسے واقعات کا سدِ باب بھی نہیں ہوسکتا اور جب تک ضمیر نہ جاگ جائے کوئی دوا ان بیماروں پر کارگر نہیں ہوسکتی!

(۵ / مئی ۲۰۰۰ء)

کھیل — آداب واحکام

انسان کی فطرت میں قدرت نے جو دواعی اور تقاضے رکھے ہیں، ان میں ایک تفریحِ طبع بھی ہے، چاہے وہ شعر وادب اور طنز ومزاح کے ذریعہ ہو یا کھیل کود کے ذریعے، اس لئے کھیل کود بھی ایک حد تک انسانی فطرت کا حصہ ہے، اسی لئے بچے جو ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور براہِ راست فطرتِ انسانی کے آغوش میں پلتے ہیں، وہ بھی کھیل کود کی طرف رغبت رکھتے ہیں، پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو دیکھئے کہ لڑکے اپنے بچپن ہی سے ایسے کھیل کا رجحان رکھتے ہیں جو مردانہ مزاج ومذاق کے حامل ہیں، جیسے: دوڑنا، کودنا وغیرہ، لڑکیاں بچپن ہی سے ایسے کھیل کی طرف راغب ہوتی ہیں جو زنانہ مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں، جیسے: بچے کھلانا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ۔

اسلام سے پہلے کھیل کود کے معاملہ میں بھی بڑی بے اعتدالی پائی جاتی تھی، یورپ جو اپنے آپ کو تہذیب وتمدن کا ''ازلی معلم'' سمجھتا ہے، اس کا حال یہ تھا کہ غلاموں کے باہم قاتلانہ مقابلے کرائے جاتے، درندہ جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا، جو آخر ان کی بے دردانہ ہلاکت پر ختم ہوتا، لوگ اس سنگ دلانہ قتل کا تماشہ شوق سے دیکھتے اور تالیاں بجاتے، یہ کھیل ''سیافی'' کہلاتا تھا اور یورپ میں اس کے لئے بڑے بڑے اسٹیڈیم بنے ہوئے تھے، پروفیسر لیکی نے ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسلام مذہبِ فطرت ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں طبعی تقاضوں کی رعایت کی ہے اور جہاں کہیں بے اعتدالی پیدا ہوئی ہے، وہاں افراط وتفریط کو دور کر کے ایک معتدل اور متوازن طریقہ کی رہنمائی کی ہے، اس نے کھیل کود کی بھی بالکل نفی نہیں کی؛ بلکہ مناسب حدود وقیود کے ساتھ اس کی اجازت مرحمت فرمائی، کھیل کے سلسلے میں جو بنیادی شرعی اُصول

ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کھیل میں ان اُمور کی رعایت کی جائے :

(۱) کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو، یعنی مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو، اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے؛ کیوں کہ حصۂ ستر کو چھپانا شرعاً واجب ہے۔

(۲) ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جا سکتا ہو، جیسے فٹ بال، والی بال، ایسا طویل کھیل نہ ہو، جو آدمی کو شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے، جیسے: شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، تاش! ایسے کھیل مکروہ ہیں، لوڈو وغیرہ بھی کراہت سے خالی نہیں، فقہاءِ حنفیہؒ کے یہاں شطرنج بغیر جوے کے بھی مکروہ ہے اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے جس میں جسمانی توانائی صرف نہیں ہوتی اور انسان گھنٹوں کھیل میں لگا رہتا ہے، یہ چیز انسان کو نکما بنا دیتی ہے اور اپنے اصل مقصد سے غافل کر دیتی ہے، کرکٹ کے شائقین سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آج کل یہی کیفیت؛ بلکہ اس سے بڑھ کر کرکٹ دیکھنے والوں کا حال ہے، یہ کھیل شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے کہ نتیجہ حاصل ہونے میں کئی کئی دن لگ جاتے ہیں اور نہ صرف اسٹیڈیم میں آنے والے؛ بلکہ پوری دنیا میں کرکٹ کے شائقین ٹی وی پر آنکھیں اور ریڈیو پر کان لگائے رہتے ہیں، کہیں بھی کام کر رہے ہوں ذہن کرکٹ کی طرف لگا رہتا ہے، طلبہ کے امتحان کا وقت ہے؛ لیکن کرکٹ کا بخار اس پر غالب ہے، وہ مزدور جس کی حالت یہ ہے کہ ”دن میں کمائے تو رات کو کھائے“ وہ بھی بال بچوں کی فکر سے آزاد کرکٹ دیکھنے اور کمنٹری سننے میں محو ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس میں ہزاروں لوگ دو وقت کے کھانے کو ترستے ہوں، ایسے کھیل مناسب نہیں اور شاید اسی لئے ترقی یافتہ ممالک میں یہ کھیل مقبول نہیں۔

(۳) ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسرے کے لئے ایذاء رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ: ایسے کھیل بھی جائز

نہیں ہیں۔

(۴) مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی کبڈی درست نہیں ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

(۵) کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو جائز نہیں؛ کیوں کہ جوا حرام ہے، جوے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کھلاڑی آپس میں یہ شرط باندھیں کہ جو ہارے گا وہ جیتنے والے کو اس شرط کے مطابق مال ادا کرے گا یا دوسرے لوگ کھلاڑی پر آپس میں شرط کرلیں کہ اگر فلاں کھلاڑی جیتا تو الف، ب کو اور اس کا مخالف جیتا تو ب، الف کو اتنی رقم ادا کرے گا، یہ صورت قطعاً ناجائز اور سخت گناہ ہے، اگر چند کھیلنے والے ہوں اور دو طرفہ شرط نہ ہو؛ بلکہ ایک طرفہ شرط ہو، مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تم کو اتنی رقم دوں گا اور میں جیت گیا تو تم کچھ نہیں دینا، یہ صورت جوے میں داخل نہیں اور جائز ہے، اسی طرح کھیلنے والے آپس میں شرط نہ باندھیں؛ بلکہ ایک تیسرا شخص کہے کہ تم دونوں میں سے جو جیت جائے گا میں اسے اتنی رقم دوں گا، یہ صورت بھی درست ہے؛ کیوں کہ یہ جوا نہیں، انعام ہے۔

(۶) ایسے کھیل جس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو، جو صحت انسانی کے لئے مفید ہو اور جس سے انسان کے اندر قوتِ مدافعت بہم پہنچتی ہو، مستحب ہے اور اسلام ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

یہ کھیل کے سلسلے میں بنیادی شرعی اصول ہیں اور ان کی روشنی میں مختلف قسم کے کھیلوں کے بارے میں حکم شرعی جانا جاسکتا ہے۔

کچھ کھیل جن کا احادیث سے ثبوت ہے، یہاں ان کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے:

✪ ''دوڑ'' کو آپ ﷺ نے پسند فرمایا، خود آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے، حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ میں پہلے حضور ﷺ سے بڑھ جاتی، جب میرا جسم بھاری ہوگیا تو آپ ﷺ مجھ پر سبقت لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس کا بدلہ ہوگیا:

"ھذہ بتلک السبقة" حضرت سلمہ بن اکوعؓ راوی ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ مدینہ تک دوڑ کا مقابلہ کرے؟ یہ شخص اتنا تیز دوڑتا تھا کہ لوگ اس پر سبقت حاصل نہیں کر پاتے تھے، میں نے اس سے کہا کہ تم کو کسی کی عزت وشرافت کا بھی خیال نہیں، یعنی تم ہر بڑے چھوٹے کو دعوت مقابلہ دے رہے ہو، اس نے کہا کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے میں کسی اور کو دعوتِ مقابلہ دینے سے باز نہیں آسکتا، حضرت سلمہؓ نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی اور مقابلہ کیا، تو سبقت حاصل کر لی، (نیل الاوطار: ۹۲/۸) اسی لئے فقہاء اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

✿ اسلام کشتی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے، رکانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے، انھوں نے آپ ﷺ کو دعوتِ مقابلہ دی، آپ ﷺ نے قبول فرمائی، کشتی ہوئی، آپ ﷺ جیت گئے اور یہی شکست حضرت رکانہؓ کے قبولِ اسلام کا باعث بنی۔ (نیل الاوطار: ۹۲/۸)

مگر کشتی سے مراد یہاں صرف وہ کشتی ہے جس میں فریق مخالف کو زمین پر گرا دیا جائے، وہ فری اسٹائل کشتی نہیں جس کا آج کل رواج ہے اور جس میں فریق مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ وار کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ شدید جسمانی نقصان پہنچایا جاتا ہے، اخلاقی اور انسانی حدود سے متجاوز ایسی کشتیاں بالکل جائز نہیں اور حرام ہیں، موجودہ زمانے میں جوڈو کراٹے بھی کشتی کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے؛ البتہ کراٹے کا ایسا مقابلہ جائز نہیں جس میں دوسرے فریق کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے کی اجازت ہو۔

✿ تیراکی کو بھی حضور ﷺ نے پسند فرمایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا ہر چیز لہو ولعب ہے سوائے چار چیزوں کے: شوہر اپنی بیوی سے دل لگی کرے، اپنے گھوڑے کی تربیت کی جائے، دو مقرر نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا، (الجامع الصغیر: ۲۳/۵) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھانے کی ترغیب دی، حضرت عمرؓ نے اہل شام کو خاص طور پر تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری سیکھنے کی نصیحت

فرمائی تھی اور اس سلسلہ میں ان کو ایک خط لکھا تھا۔ (فیض القدیر: ۴/۳۲۷)

✿ گھوڑ دوڑ بھی جائز ہے، آپ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ کراتے، جو گھوڑے چھریرے اور ہلکے بدن کے ہوتے ان کے لئے دوڑنے کی حد "حفیہ" سے "ثنیۃ الوداع" تک ہوتی اور جو بھاری بدن کے ہوتے ان کی "ثنیۃ الوداع" سے "مسجد بنو زریق" تک (بخاری مع الفتح: ۱/۲۱۴) گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانور جیسے اونٹ کی دوڑ بھی جائز ہے، خود حدیث میں اونٹ کی دوڑ کا ذکر موجود ہے: "لا سبق الا فی نصل او خف او حافر" (ابوداؤد) لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ہے جب کہ اس میں قمار اور جوے کی صورت نہ ہو، آج کل جو گھوڑ دوڑ ہوتی ہے، جس کا اصل مقصد جوا ہی ہوتا ہے، یہ جائز نہیں۔

✿ تیراندازی کی بھی آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر کام جو تفریح طبع کے طور پر کیا جاتا ہے، ناروا ہے، سوائے تین باتوں کے، ان میں ایک تیراندازی کا ذکر فرمایا (ترمذی) ابھی روایت گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے بچوں کو تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بچوں کو تیراندازی سکھانے کا حکم فرمایا، گو یہ روایت ضعیف ہے، (الجامع الصغیر: ۴/۲۸-۳۲۷) موجودہ زمانے میں بندوق وغیرہ کی نشانہ بازی بھی اسی حکم میں ہے۔

(۱۹ رفروری ۱۹۹۹ء)

ٹریفک ــــ شرعی ہدایات

گذشتہ ہفتہ حکومت کے اعلان کے مطابق ہمارے شہر میں ٹریفک سیفٹی کا ہفتہ منایا گیا ہے، حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً لوگوں میں ٹریفک کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے اس طرح کے ہفتے منائے جاتے ہیں، جو یقیناً ایک مستحسن قدم ہے، واقعہ ہے کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی، بے اُصولی اور نامناسب حد تک جلد بازی کی وجہ سے حادثات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں اخبار سڑک حادثہ کی اطلاع سے خالی ہو اور کچھ ہلاکتیں اس کی وجہ سے پیش نہ آئی ہوں، اسلام نے اس سلسلہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے اور قرآن وحدیث میں ہمیں اس سلسلہ میں اُصولی ہدایات مل سکتی ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور کچھ باتوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے، ان باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا ضروری ہے، ان میں کسی کمی یا اضافہ کی گنجائش نہیں، کچھ چیزیں وہ ہیں کہ نہ ان کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا گیا ہے، ان سے ایسی مصلحت متعلق ہے کہ نہ صراحتاً شریعت میں اس کے معتبر ہونے کا ذکر ہے اور نہ نامعتبر ہونے کا، ان چیزوں کے بارے میں حکومت کو حق ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی انتظامی قانون بنائے اور حسب ضرورت لوگوں پر کسی پہلو کو لازم قرار دیدے، اسلام کے اُصولِ قانون کی اصطلاح میں ان کو ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے، جیسے: انسان دائیں بھی چل سکتا ہے اور بائیں بھی، شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ہے کہ چلنے میں کون سی سمت اختیار کی جائے اور کون سی سمت اختیار نہ کی جائے حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے عوام کو پابند کرسکتی ہے کہ وہ متعینہ سمت سے ہی سفر کرے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔

اس لئے ٹریفک کے جو اُصول وقواعد مقرر کئے گئے ہیں، کہیں تیز چلنے کے اور کہیں

آہستہ چلنے کے، رکنے کے اور نہ رکنے کے، گاڑی کسی مقام پر ٹھہرانے کے اور کسی مقام پر نہ ٹھہرانے کے، یہ انتظامی نوعیت کے قوانین ہیں، جن کا مقصد ہماری جان اور ہماری سواری کا تحفظ ہے، جان و مال کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے اور حکومت کے ایسے قوانین کی اطاعت کا ہم نے عہد کیا ہے جو احکامِ شریعت سے متصادم نہیں ہیں، اس لئے ان اُصول وضوابط کی رعایت ہم پر واجب ہے اور ان کی رعایت نہ کرنا نہ صرف قانونِ ملکی کی مخالفت ہے؛ بلکہ عہد کی خلاف ورزی اور اپنی جان و مال کی حفاظت میں بے احتیاطی کی وجہ سے شرعاً بھی ایک قبیح فعل ہے اور گناہ کا باعث ہے، اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مفید قوانین کی رعایت کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔

قرآن نے انسان کی چال کے بارے میں ہدایت دی ہے کہ اس سے تکبر اور اکڑفوں کا اظہار نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

> وَلاَ تَمْشِ فِيْ الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً. (الاسراء:۳۷)
>
> زمین میں اکڑ کر نہ چلو، کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔

ایک اور موقع پر اللہ کے نیک بندوں کی چال ڈھال اور گفتار ورفتار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا :

> وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَ إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا . (الفرقان:٦٣)
>
> رحمٰن کے سچے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز وفروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان سے ہم کلام ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔

زمین پر اکڑ کر چلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہے کہ سینے تنے

ہوئے ہوں اور گردنیں تکبر سے اکڑی ہوئی ہوں ؛ لیکن اکڑ کر چلنے کی صرف یہی ایک کیفیت نہیں ؛ بلکہ ہر وہ چال جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہو اور دوسروں کی تحقیر محسوس ہو، اس ہدایت ربانی کی مصداق ہے، آپ گاڑی پر سوار ہیں اور آپ کو یہ گوارا نہیں کہ کسی کی گاڑی آپ سے آگے رہے، آپ بلاوجہ اس کو پیچھے کر کے خود آگے بڑھنے کے درپے ہیں، اس کے لئے نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، ہارن بجا بجا کر اسے پریشان کرتے ہیں، تو یہ بھی اکڑ کر چلنے ہی کے حکم میں ہے، تواضع کی چال یہ ہے کہ آپ اپنی رفتار معتدل رکھیں، جو آپ سے آگے چل رہا ہے، اسے آگے رہنے دیں، اگر کسی کی سواری آپ سے پیچھے ہے؛ لیکن اس کی رفتار بہ مقابلہ آپ کی سواری کے تیز ہے اور راستہ میں اس کی گنجائش ہے کہ آپ اسے آگے بڑھنے کا موقع دیدیں، تو آپ اس کو اپنی اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اپنے دوسرے بھائی کو آگے بڑھنے دیں، یہ تواضع کی چال اور قرآن کی زبان میں ''مشی ہون'' ہے۔

صحابہ ﷺ جب آپ کے ساتھ سفر میں ہوتے اور آگے کی سمت سے دشمن کا اندیشہ نہ ہوتا تو اہتمام کرتے کہ اپنی سواری کو حضور ﷺ کی سواری سے پیچھے رکھیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے، ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اونٹنی آگے بڑھ گئی، یہ اونٹنی بڑی سرکش تھی اور قابو میں نہ آتی تھی، صحابہ ﷺ کو یہ بات گراں گذری اور حضرت عمر ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی فرمائی ؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کا برا نہ مانا اور حضرت عمر ﷺ کو اس سے منع فرمادیا، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اسی کی سواری آگے رہے اور دوسرے چلنے والے اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

قرآن مجید نے اچھے انسان کی صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر نا سمجھ لوگ اس سے اُلجھنے کی کوشش کریں تو وہ سلامتی کی بات کہہ کر گذر جاتے ہیں، یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، راستہ میں چلتے ہوئے بار بار اس کی نوبت آتی ہے کہ ٹریفک کے اُصول سے ناواقف، جلد باز اور جاہل و اُجڈ قسم کے لوگ منھ آنے لگتے ہیں، کوئی

اپنی سواری غلط طریقہ پر بیچ میں لے آتا ہے، کوئی اپنی مخالف سمت میں گھس آتا ہے، کوئی بے موقع ہارن بجا کر دِق کرتا ہے، کوئی ایسی جگہ گاڑی روک دیتا ہے جہاں گاڑی روکنے کی اجازت نہیں، اس سے ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بعض لوگ خود غلطی کرتے ہیں اور اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے الٹے دوسروں کو سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، یہ بڑے جذباتی مواقع ہوتے ہیں، اگر دوسرا آدمی بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس سے ماحول کے اور خراب ہونے، آویزش بڑھ جانے اور ٹریفک جام ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے، ان ہی صورتوں میں یہ آیت ہماری طرف متوجہ ہوتی ہے کہ یہ وقت برداشت، تحمل اور کلمۂ خیر کہہ کر گذر جانے کا ہے کہ ایک شخص تو کانٹا پھینک ہی رہا ہے، اگر دوسرے لوگ بھی پھول پھینکنے کے بجائے کانٹے ہی پھینکنے پر اصرار کریں تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں اور گلہائے محبت کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

رفتار حالات کے اعتبار سے ہونی چاہئے، جہاں ازدحام ہو وہاں آہستہ چلا جائے، جہاں ازدحام نہ ہو اور آپ کے آہستہ چلنے کی وجہ سے ان لوگوں کو دشواری ہو جو آپ کے پیچھے ہیں تو وہاں سبک خرامی کے بجائے تیز گامی اختیار کیجئے۔

حضرت اسامہ بن زید ﷺ حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی رفتار کی بابت فرماتے ہیں کہ جب کہیں خالی جگہ ہوتی تو تیز چلتے ورنہ رفتار اس سے کم رہتی: ''یسیر العنق ، فاذا وجد فجوۃ نص '' (بخاری: حدیث نمبر: ۲۹۹۹، مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۸۶)

پیدل چلنے میں وقار اور متانت ہو، نماز ایک عبادت ہے اور نماز کے لئے آنا ایک عبادت کی طرف سبقت ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں بھی وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ارشاد ہے: ''اذا اتیتم الصلاۃ فاتوھا بالوقار '' (مسند احمد: عن عبدالرحمٰن بن عوفؓ) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سکون کے ساتھ چلو، تیز چلنا کچھ نیکی کا کام نہیں: ''علیکم السکینۃ ، فان البر لیس بالایضاع ''۔ (مسند احمد عن اسامہ بن زیدؓ)

راستہ پر بے ضرورت ہارن بجانا بھی پسندیدہ نہیں، اس سے آگے چلنے والے کو وحشت

ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حادثہ کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس لئے بھی کہ ہارن کی آواز سنجیدہ لوگوں کے لئے گراں خاطر ہوتی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے راستہ چلتے ہوئے گھنٹہ بجانے سے منع فرمایا، عربوں کا طریقہ تھا کہ اونٹ کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھ دیتے، جب پورا قافلہ چلتا تو راستہ گھنٹیوں کی آواز سے گونج اُٹھتا، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اس سے بے ضرورت ہارن بجانے کی قباحت پر روشنی پڑتی ہے، بعض حضرات نت نئی آوازوں کے ہارن گاڑیوں میں لگاتے ہیں، جیسے کتے کی آواز، چھوٹے بچے کے رونے کی آواز، یہ نہایت ہی ناشائستہ بات ہے، اس آواز کے مکروہ ہونے کے علاوہ لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں اور چونک اُٹھتے ہیں، جو خطرناک حادثہ کا باعث ہو سکتا ہے، اس لئے ایسی چیزوں سے گریز ضروری ہے۔

یہ بات بھی مناسب نہیں کہ جہاں پارکنگ کی جگہ نہ ہو وہاں گاڑی کو پارک کر دیا جائے، یہ دوسرے راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف اور مشقت کا باعث ہے، اس سے ٹریفک جام ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو بھی ایمان کا ایک درجہ قرار دیا ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو کو ہٹا دیا جائے: ''و ادناھا اماطة الاذی عن الطریق'' (مسند احمد، حدیث: ۹۷۴۷) اذی میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو تکلیف دہ ہوں، خواہ وہ گندگی یا نجاست ہوں یا کچھ اور، اس لئے بے جگہ گاڑی کا کھڑا کرنا بھی اس میں شامل ہے؛ کیوں کہ اکثر اوقات اس کی تکلیف راستہ چلنے والوں کے لئے گندگی سے بھی بڑھ جاتی ہے، اسی حکم میں یہ ہے کہ پٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسن تیل پر گاڑیاں چلائی جائیں، کہ یہ یقیناً دوسرے راہ گیروں کے لئے تکلیف واذیت کا باعث ہے اور اس سے پھیلنے والی آلودگی عام لوگوں کے لئے بھی مضر اور نقصان دہ ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے گاڑی والوں کا اور گاڑی پر چلنے والے پیدل چلنے والوں کا خاص کر عورتیں، بچے اور ضعیف لوگ جو جلد راستہ طے نہیں کر سکتے، ان کی رعایت ملحوظ رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے راہ گیروں کو عورتوں کی بابت خصوصی رعایت کا حکم فرمایا، حضرت

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۲۷۳) حضرت ابو اسید انصاری ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خواتین کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستہ کے کناروں سے چلیں، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۵۲۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ کے حصہ میں سواریاں نہ چڑھائی جائیں؛ بلکہ ان کو پیدل راہ گیروں کے لئے چھوڑ دیا جائے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے چلا کریں۔

غرض، راستہ چلتے ہوئے مزاج میں تحمل و برداشت ہو، رویہ میں اعتدال ہو، دوسرے راہ گیروں کے ساتھ رعایت اور ایثار کا معاملہ ہو، اگر دوسرے راہ رو بے احتیاطی سے کام لیں اور نامناسب رویہ اختیار کریں تو ان کے بارے میں عفو و درگذر ہو اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر ٹریفک کے اُصول و قواعد کو ملحوظ رکھے، یہ ہیں وہ اُصول جن کی طرف قانونِ شریعت میں اشارہ ملتا ہے۔

(۲۵؍فروری ۲۰۰۰ء)

ٹیلی فون — آداب واحکام

اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ عہد علمی اکتشاف اور ایجاد و اختراع کا عہد ہے، انسان نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتِ فکر کو استعمال کر کے ایسی ایسی چیزوں کو وجود بخشا ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، فضاء ہو یا سمندر، زمین کی تہیں ہوں یا انسان کا خود اپنا وجود، انسان نے ایک حد تک ان سبھوں کو علم و تحقیق کی گرفت میں لے لیا ہے، ان ایجادات میں ایک اہم حصہ ابلاغ اور مواصلات کے ذرائع میں ہونے والی حیرت انگیز ترقی ہے، کل تک انسان اپنی آواز کو ایک دو فرلانگ بھی پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا؛ لیکن آج دنیا کے ایک کونہ میں بیٹھ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ اپنا پیغام ہر چہار سمت پہنچا سکتا ہے، ٹیلیفون کے ذریعہ سات سمندر پار رہنے والے لوگوں سے گفت و شنید کا ایسا رابطہ قائم کر سکتا ہے کہ گویا وہ اس کے سامنے موجود ہے، ٹیلی فون کے نظام میں مصنوعی سیاروں کی مدد نے اس کی تیز رفتاری اور ہمہ گیری میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

غور کیا جائے تو پیغام رسانی کے یہ اَن دیکھے ذریعے اسلام کے بعض عقائد اور افکار کی تصدیق ہیں، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے حکم کا پابند ہے، گویا ہر شئے کو اللہ تعالیٰ کا پیغام ملتا رہتا ہے اور اسی کے مطابق پوری کائنات سرگرم عمل رہتی ہے، وحی کا نظام بھی کچھ اسی طرح ہے کہ کبھی براہِ راست اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے مخاطب ہوتا ہے، کبھی منشاءِ ربانی نبی کے قلب پر نقش ہو جاتا ہے، کبھی فرشتے اَن دیکھی صورت میں پیغمبر کے پاس آتے ہیں اور اسے اللہ کا کلام سناتے ہیں، مادہ پرستوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پیغمبروں پر کس طرح وحی نازل ہوا کرتی تھی اور کائنات کو کس طرح خدا کا پیغام ملتا ہے؛ حالاں کہ ان کے درمیان کوئی ظاہری رابطہ موجود نہیں؟ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ پیغام رسانی کے اس نظام نے

اس نظریہ کو مشاہدہ بنا دیا کہ کسی ظاہری رابطہ کے موجود نہ ہونے کے باوجود ایک جانب سے دوسری جانب پیغامات کی ترسیل ہوسکتی ہے، جب عاجز انسانوں نے اس کی طاقت حاصل کرلی ہے تو قادرِ مطلق کے لئے یہ کیا دشوار ہے!

انسانیت کے لئے نفع بخش ایجادات میں سے ایک ٹیلیفون ہے، جو فاصلوں کو کم کرتا ہے، جغرافیائی فاصلوں کے باوجود ایک کو دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رکھتا ہے اور شاعروں کی زبان میں ''ہجر'' کو ایک گونہ ''وصال'' بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے، ۱۸۷۶ء میں ''الگزینڈر گراہام بیل'' کے ذہن رسا نے فون کو وجود بخشا اور اب موبائل فون نے گویا اس نظام کو اوجِ کمال تک پہنچادیا ہے، اب فون کا ہونا اعلیٰ سرکاری عہدیدار یا بڑے تاجر یا صنعت کار ہونے کی علامت نہیں؛ بلکہ آہستہ آہستہ فون رکھنا شہری زندگی کے لوازم میں سے ہوتا جارہا ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی مفید چیز کا حاصل ہوجانا ہی بڑی کامیابی ہے؛ لیکن شاید یہ درست نہیں، کسی چیز کے حصول سے زیادہ اہم اس کا استعمال ہے اور یہ رہنمائی ہمیں قرآن و حدیث ہی سے مل سکتی ہے کہ کس چیز کا استعمال کس طرح ہو؟ استعمال کا کون سا طریقہ روا ہے اور کون سا ناروا؟

فون در اصل ایک طرح کی ملاقات ہے، اس لئے بنیادی طور پر جو احکام و آداب ملاقات کے ہیں وہی فون پر گفتگو کرنے کے بھی ہیں، آپ ﷺ نے کسی کے یہاں جانے کا یہ ادب بتایا ہے کہ پہلے سلام کرے پھر داخل ہونے کی اجازت چاہے، (ابوداؤد عن کلدۃ بن حنبل) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو فون کیا جائے تو پہلے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہنا چاہئے؛ چوں کہ سلام کے یہ کلمات مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے غیر مسلموں کو کسی اور کلمۂ احترام سے مخاطب کرنا چاہئے، غیر محرم مردوں اور عورتوں کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے، (رد المحتار: ۲۶۱/۵) کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے؛ چوں کہ فون پر گفتگو میں یہ اندیشہ کم ہے؛ اس لئے ایک حد تک فون پر اگر اچانک غیر محرم سے ملاقات ہوجائے تو سلام کی گنجائش ہے؛ لیکن احتیاط بہتر ہے۔

بعض حضرات فون کرتے ہوئے اپنا نام نہیں بتاتے؛ بلکہ بعض اوقات تو دریافت کرنے کے باوجود نام بتانے سے گریز کرتے ہیں، یہ بُری بات ہے، اس سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ سلام کرنے کے بعد خود ہی اپنا نام بتا دے کہ میں فلاں شخص گفتگو کر رہا ہوں، ایک بار حضرت جابر ﷺ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، دروازہ پر دستک دی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کون؟ عرض کیا: میں، آپ ﷺ نے ان کے اس جواب کو ناپسند فرمایا، (بخاری و مسلم عن جابرؓ) کیوں کہ ''میں'' سے آنے والے کو پہچانا نہیں جاسکتا ہے، اس لئے اپنے نام کی صراحت ضروری ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ حضرت عمر ﷺ کے پاس گئے، تو فرمایا: ''یستاذن ابو موسیٰ'' یعنی ابوموسیٰ حاضری کی اجازت چاہتا ہے، اسی طرح فون کرتے ہوئے پہلے اپنا نام بتادے۔

جس شخص سے گفتگو کرنی ہو، اگر اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ ہو تو خود ہی وضاحت کر دینی چاہئے کہ میں فلاں شخص ہوں اور فلاں شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کے مکتوبات ہیں، کہ آپ ﷺ نے جتنے خطوط لکھے ہیں، ان میں خط کے آغاز پر اپنا نام اور پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷺ سے مروی ہے کہ جب تم کسی کے گھر جاؤ، تین بار گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرو اور اجازت نہ ملے؛ بلکہ خاموشی اختیار کی جائے، تو واپس آجاؤ، (بخاری و مسلم عن ابی سعید الخدریؓ) ٹیلیفون کی گھنٹی گویا ملاقات کی اجازت حاصل کرنا ہے، لہٰذا اگر تین بار فون کی گھنٹی بجنے کے باوجود فون نہ اٹھایا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ملاقات کی اجازت نہیں ہے اور فون کا ریسیور رکھ دینا چاہئے، بار بار گھنٹی بجا کر تنگ نہ کرنا چاہئے۔

آپ ﷺ کا طریقہ تھا کہ دروازہ پر اس طرح دستک دیتے اور اس طرح سلام کرتے کہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہونے پائے، اس سے معلوم ہوا کہ رات دیر گئے یا ایسے اوقات میں شدید ضرورت کے بغیر فون کرنے سے گریز کرنا چاہئے، جس میں مخاطب کے سونے

اور آرام کرنے کا معمول ہو، اگر کسی شخص سے طویل گفتگو کرنی ہو تو چاہئے کہ پہلے اجازت حاصل کر لی جائے کہ مجھے اتنی دیر گفتگو کرنی ہے، اگر مناسب ہو تو اسی وقت گفتگو کریں یا کوئی وقت مقرر کر دیں، اس میں دونوں کے لئے راحت ہے، قرآن مجید نے کسی کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینے کا اُصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ یہی تمہارے لئے باعث پاکیزگی ہے: "ھو ازکی لکم" (النور:۲۷) یعنی اس اخلاق اور برتاؤ سے تمہارے قلوب ایک دوسرے سے پاک اور صاف رہیں گے، قرآن کے اس حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص اپنی مشغولیت کی وجہ سے گفتگو کرنے سے معذرت کر دے، تو اس کا برا نہ ماننا چاہئے اور نہ اسے تکبر پر محمول کرنا چاہئے؛ کیوں کہ ہر شخص کے اپنے مشاغل ہوتے ہیں، اس میں دخل اندازی کسی طرح مناسب نہیں۔

قرآن مجید نے ایسی جگہوں پر بلا اجازت آنے کی اجازت دی ہے جو رہائشی نہ ہوں، (النور:۲۹) اس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ پبلک مقامات جیسے ایر پورٹ، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، سرکاری اور نجی عوامی اداروں کو ان کے مقررہ اوقاتِ کار میں کسی بھی وقت فون کیا جاسکتا ہے اور ان اداروں سے متعلق تفصیلی استفسار پیشگی اجازت کے بغیر بھی کرنے کی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ملاقات کرنے والوں کا بھی حق ہے: "ان لزورک علیک حقا" ملاقات کے لئے آنے والوں کا حق یہی ہے کہ ان سے ملاقات کی جائے اور کسی شرعی یا طبعی مجبوری کے بغیر ملاقات سے انکار نہ کیا جائے، کہ اس میں ملاقات کو آنے والے کے ساتھ بے احترامی اور بے مروتی کا اظہار ہوتا ہے، یہی حکم ٹیلیفون کا بھی ہوگا، بلاوجہ فون پر گفتگو کرنے اور جواب دینے سے انکار کرنا بد اخلاقی کی بات ہے اور ایک طرح کی حق تلفی ہے، اس سے بچنا چاہئے، اسی طرح جھوٹ بولنا اور رہتے ہوئے موجود نہ رہنے کی اطلاع دینا گناہ ہے؛ البتہ اگر جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہ ہو اور سچی اطلاع دینے میں کسی مسلمان کو ناحق گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں ایک

اہم تر مقصد کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے؛ لیکن عام حالات میں اس طرح جھوٹ بولنا نہ شرعاً درست ہے اور نہ اخلاقاً۔

آج کل بعض ایسے فون بھی ہیں جن کے استعمال کرنے کی صورت میں فون کرنے والے اور وصول کرنے والے دونوں ہی کو پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں، ایسی صورت میں فون کر کے ہم فون وصول کرنے والے کو زیر بار کرنے کے بھی مرتکب ہوتے ہیں، ایسے فون کا استعمال دو ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے، یا تو پہلے ہی سے فون پر بات کرنے کی اجازت لے لی گئی ہو یا فون کرنے والا دوسرے فریق کی اُجرت بھی ادا کرنے کو تیار ہو اور اس سے وہ مطلوبہ اُجرت ادا کرنے کی پیشکش کرے۔

بعض حضرات فون میں موسیقی لگا لیتے ہیں کہ اگر فون کرنے والے کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے، تو وہ اس ساز سے محظوظ ہو سکے، اسلام نغمہ و موسیقی اور ساز و سارنگی کا قائل نہیں؛ اس لئے فون کے ساتھ موسیقی کے ساز لگانا کراہت سے خالی نہیں، یہ اخلاقی تقاضوں کے بھی مغائر ہے؛ کیوں کہ ہر فون کرنے والا اس موسیقی کے سننے پر مجبور ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص تکلیف دہ خبر دینے والا ہو، ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لئے یہ موسیقی بار خاطر ہی ہوگی۔

بعض جگہ بار بار فون کر کے اور فون کی گھنٹیاں بجا کر پریشان کرنے کے واقعات سننے میں آتے ہیں، ایسی بھی شکایتیں سنی جاتی ہیں کہ فون پر گالی گلوج کیا جاتا ہے، فحش باتیں کہی جاتی ہیں، دھمکیاں دی جاتی ہیں اور دوسروں کو ہراساں کیا جاتا ہے، یہ ساری باتیں سخت ناپسندیدہ اور گناہ ہیں، یہ نہ صرف اسلام کے خلاف ہیں بلکہ عام تقاضۂ اخلاق کے بھی مغائر ہیں اور گناہ بے لذت بھی، جن سے خود کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

فون ایسی ملاقات ہے جس کی اُجرت ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے فون پر مختصر اور ضروری باتیں کرنا چاہئے، غیر ضروری اور خواہ مخواہ لمبی گفتگو کرنا اسراف اور فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کو اسلام نے جتنی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہ ظاہر ہے، آپ ﷺ نے خوش کلامی کو پسند فرمایا ہے، اس لئے کسی متعارف شخص کا فون ہو یا غیر متعارف شخص کا، نرم گفتگو

کرنی چاہئے، جس سے مخاطب مانوس ہو، گفتگو خشک اور روکھی نہ ہو؛ البتہ عورتوں کو غیر محرم مردوں سے گفتگو کرنی پڑے تو اس کا خیال رہے کہ بات چیت میں لوچ اور حلاوت کا اظہار نہ ہو، اس سے منع کیا گیا ہے؛ کیوں کہ ایسی گفتگو مریضانہ ذہن رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتی ہے۔

ملاقات کا ادب یہ ہے کہ ملاقات کے اختتام پر دوبارہ سلام کیا جائے، یہی آپ ﷺ کی سنت ہے؛ لہٰذا فون پر بھی گفتگو کا اختتام سلام ہی پر ہونا چاہئے؛ تاکہ اس سنت پر عمل ہو سکے، غرض فون ایک بڑی نعمت ہے؛ لیکن اگر اس کے استعمال میں شرعی حدود و آداب کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو اسی قدر باعث زحمت بھی ہے۔

(۱۳ر نومبر ۱۹۹۸ء)

تہذیب کے نام پر بدتہذیبی

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سی برائیوں کا مہذب اور شائستہ ناموں سے ارتکاب کریں گے، شراب پئیں گے لیکن ان کے نام بدل دیں گے، سود کھائیں گے اور ان کا نام کچھ اور دے دیں گے، دراصل یہ برائی کی سب سے بدترین شکل ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس میں بھلائی کے نام سے برائی کی جاتی ہے، تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کو روا رکھا جاتا ہے، آزادی کے نام پر نفس کی غلامی کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اسلام جس وقت اس دنیا میں آیا، اس وقت بھی کم وبیش یہی کیفیت تھی، عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل کہتے تھے؛ لیکن پوری طرح شرک میں ملوث تھے، بہت سے لوگ مرد اور عورتیں بے لباس کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے، اور اسے نیکی تصور کرتے تھے، کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کیا ہے، ان میں کیوں کر طواف کیا جائے، اہل مکہ اپنے امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے میدان عرفات نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، حدود حرم سے باہر کیسے جائیں۔

جب کوئی انسانی گروہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور جانتے بوجھتے گناہ کو روا رکھتا ہے، تو اس کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے، وہ بدی کو نیکی اور برائی کو اچھائی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، مغربی تہذیب نے آج یہی صورت اختیار کر رکھی ہے، آج بہت سی مسلمہ اخلاقی برائیاں، تہذیب و ثقافت کے نام پر روا ہوگئی ہیں، جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور اسے برا جانتے ہوں ان کو تہذیب نا آشنا اور متشدد سمجھا جاتا ہے، اور آج کل تو ایسے لوگ بنیاد پرست اور انتہاء پسند بھی کہے جاتے ہیں، اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ طوعاً یا کرہاً مغربی ثقافت کو اہل مشرق پر مسلط کر دیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''یوم عاشقاں'' کا فتنہ ہے، جو ۱۴؍فروری کو منایا جاتا ہے، مغربی ممالک میں تو مدت سے اس کی دھوم سنی جاتی تھی، ہندوستان میں لوگ اسے کسی مہذب قوم کے کھنڈرات کی طرح واقعۂ عبرت کے طور پر ذکر کیا کرتے تھے؛ لیکن 'عالمیانے' (گلوبلائزیشن) کی نئی اصطلاح کے تحت مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی جو یلغار شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں اب ہندوستان میں بھی آوارہ خیال لوگوں کے لئے یہ ایک محبوب دن بن گیا ہے، سنا ہے کہ اس مناسبت سے ایک دوسرے کو بھیجنے کے لئے فحش مضامین اور فحش تصویروں کے کارڈ چھپ رہے ہیں، خاص اس مناسبت سے کیک بنائے جا رہے ہیں، اگر اس حیا سوز سلسلہ کو روکا نہیں گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بد اخلاقی کی اشاعت و ترویج کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے گا اور معاشرہ پر نہایت ہی منفی اثرات مرتب ہوں گے، پھر ہمیں اس تہذیب کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا جس میں انسان کو اپنے جسم پر لباس بھی بوجھ محسوس ہونے لگے، جس میں نکاح کے بندھن سے انسان کو اپنی آزادی مقید ہوتی نظر آتی ہے، اور جس میں نفس پرستی کی لہریں شرافت و اخلاق کے ساحل سے گریزاں رہتی ہیں، کیا ہم دیار مشرق میں اور ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں جہاں مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی عفت و عصمت کو انسانی جوہر سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک سیتا کا سب سے بڑا وصف اس کی حیاء اور پاکدامنی تھی، دین و اخلاق اور شرافت و حیاء سے آزاد ثقافت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

اسلام نے حیاء کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسے ایمان کا ایک جزء قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے: '' الحياء شعبة من الايمان '' (مسلم، حدیث نمبر: ۷۵) حضرت عمران بن حسین سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حیا بہر صورت خیر و بھلائی ہے: '' الحياء خير كله '' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۹۶) حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس شخص کو حیاء نہ ہو وہ کسی بھی برائی کا مرتکب ہو سکتا ہے: '' اذا لم تستحي فافعل ماشئت '' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۹۷) حیاء دراصل انسان کو برائی سے باز رکھنے اور نیکی کی طرف لے جانے والی طاقت ہے۔

حیاء ہر معاملہ میں مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ کو اگر کوئی ایسا مسئلہ بیان کرنا ہوتا جو مرد وعورت کے صنفی معاملات سے متعلق ہوں تو اس کے لئے بہت ہی پردہ دار تعبیر اختیار فرماتے، خواتین کو اگر ایسا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ ازواج مطہرات کے واسطہ سے دریافت کرتیں، حضرت علی ؓ کو مذی یعنی وہ مادہ جو صنفی ہیجان کے وقت انسان کے جسم سے نکلتا ہے اور جس کی نوبت جنسی اتصال سے پہلے پیش آیا کرتی ہے، کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کرنا تھا، تو چوں کہ حضرت فاطمہ صاحبزادیٔ رسول آپ ؓ کی زوجیت میں تھیں، اس لئے مارے حیاء کے آپ ﷺ سے دریافت نہیں کر سکے اور حضرت مقداد بن اسود ؓ سے استفسار کرایا۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آپ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیاء دار تھے آپ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ کبھی کسی غیر محرم کے ساتھ آپ نے تنہائی اختیار نہیں فرمائی، عورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حیاء کا عنصر زیادہ رکھا ہے اور یہ ان کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہے، اسی لئے ان کے لئے پردہ کے احکام رکھے گئے، ساتر لباس کو مردوں اور عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا، نماز میں خواتین کی صف پیچھے رکھی گئی، نکاح میں کنواری لڑکی کے لئے خاموشی کو رضامندی قرار دیا گیا اور زبان سے اظہار ان کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا، میاں بیوی کو ہدایت دی گئی کہ وہ خلوت کی باتوں کو لوگوں سے مخفی رکھیں اور انھیں دوسروں کے سامنے زبان پر بھی نہ لائیں، لباس و پوشاک، آواز، چال ڈھال، گفتگو، غرض تمام امور میں تقاضۂ حیاء کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی۔

افسوس کہ لوگوں نے محبت کے لفظ کو بھی بدنام کر دیا ہے اور بے شرمی اور بے غیرتی کو محبت جیسا باعزت نام دے دیا ہے، محبت بے غرض اور پاکیزہ چاہت کا نام ہے، جس چاہت کا مقصد نفس کی آگ کو غذا فراہم کرنا اور بے لگام خواہشات کی پیاس بجھانا ہو وہ بے غرض چاہت نہیں ہے، جو چاہت محض ہوس نفس کی تکمیل سے عبارت ہو، وہ تو پاکیزگی سے نا آشنا ہے، اسلام دین محبت ہے، اس نے ہر شئے سے محبت کا سبق دیا ہے، خدا سے محبت، خدا کے رسول ﷺ سے محبت، ہر مسلمان اور ہر انسان سے محبت، اللہ کی ہر مخلوق سے محبت، ماں باپ اور بھائی

بہنوں سے محبت، یہ ایک تحفۂ محبت ہے، جسے ہر شخص اور ہر جگہ پر پیش کرتا ہے، اس میں پاکیزگی ہے، اس میں بے غرضی ہے اور اس میں دوام وپائیداری ہے۔

مرد وعورت کا ایک دوسرے کی طرف رجحان یہ بھی فطرت انسانی کا ایک حصہ ہے اور خاندانوں کی تشکیل کے لئے یہ ایک سماجی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے حلال اور جائز صورت رکھی ہے، اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کی طرف میلان محسوس کرتا ہو تو شریعت میں اس کے لئے ایک پاکیزہ طریقہ ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے ذریعہ سلسلہ جنبانی کیا جائے اور طرفین کی رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا معاہدہ کرلیا جائے، جسے "نکاح" کہتے ہیں، اس میں پاکیزگی ہے، یہ چند دنوں اور چند مہینوں کے لئے نفس کی تسکین کا سامان خریدنا نہیں ہے؛ بلکہ زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور ہمیشہ دکھ سکھ کو بانٹنے کا ایک باعزت معاہدہ ہے، یہ معاہدہ خودغرضی کا نہیں؛ بلکہ ایک دوسرے کے بوجھ کو اٹھانے کا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح دو انسانوں کے درمیان محبت پیدا کرتا ہے، یہ پاکیزہ محبت ہے، اسی لئے جوں جوں حسن وشباب ڈھلتا جاتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ شفقت اور حسن سلوک کے جذبات بڑھتے جاتے ہیں، نفسانی چاہت کا حال یہ ہے کہ جو طبیعتیں اس کی خوگر ہوتی ہیں وہ ہرجائی بن جاتی ہیں، کچھ دنوں کی دلچسپی کے بعد ان میں ایک دوسرے سے اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے، بے رخی اور بے توجہی بڑھنے لگتی ہے، جو ایک دوسرے کے لئے بے چین رہتے تھے، وہ ایک دوسرے سے اپنا دامن بچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اس تعلق کے بوجھ ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

نکاح عورت کا اعزاز اور اس کا احترام ہے اور زندگی بھر تعلق کو نباہنے کا پیمان ہے اور عشق ومحبت کے نام پر مغربی تہذیب نے جس چاہت کا سبق سکھایا ہے، یہ ہوس کی پرستش اور ناپاک اور خودغرضانہ چاہت ہے، اس میں عورتوں کی تذلیل وتحقیر اور ان کی رسوائی کا سامان ہے اور اکثر اوقات ان کا استحصال ہے، آج مغرب خدا کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت کی سزا چکھ رہا ہے، کہ ان کی زندگی سکون کی نعمت سے محروم ہے، وہ ان گلہائے حسن

وجمال سے عاجز آچکے ہیں جن میں وفا کی خوشبو نہیں، جس میں انسان کو ایک کربناک بڑھاپے سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں بے غرض محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں، جہاں ایک مرد یا عورت سائنس سے زیادہ قریب رہنے والے ساتھی کے بارے میں بھی یہ اطمینان نہیں کرسکتا کہ اس کی محبت اس کے لئے وقف ہے اور اس کی وفاداریاں اٹوٹ اور ناقابل یقین ہیں۔

کیا ہم مذہب کی گرویدہ، حیاء اور وفا کی پرستار اور بے غرض محبت کی ترجمان سرزمین میں حیاء واخلاق سے آزاد اسی تہذیب کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں؟؟

(۸رفروری ۲۰۰۲ء)

خدائی منصوبہ بندی یا خاندانی منصوبہ بندی؟

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، وہ جس قدر خوبصورت ہے، اسی قدر منصوبہ بند بھی ہے، صبح سے شام تک دُنیا میں جو کچھ واقعہ پیش آتا ہے، غور کیا جائے تو وہ ایک پروگرام اور منصوبہ بندی سے مربوط ہے، قدرت کے مرتب کیے ہوئے نظام الاوقات کے مطابق ہی سورج اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اپنی روشن اور گرم کرنوں کے ذریعہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو روشن اور گرم کرتا جاتا ہے، انسان ہو کہ چرند و پرند، ہر ایک اپنی غذا کی تلاش میں زمین پر دوڑ پڑتے ہیں، پھر جب انسان دن بھر کی محنت سے تکان محسوس کرنے لگتا ہے، تو سورج اپنی کرنوں کو سمیٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ سورج چھپ جاتا ہے اور رات اپنی دلآویز چاندنی یا سیاہ نقاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، تا کہ انسان ہو یا چرند و پرند، اپنے گھر کو واپس آجائیں، راحت و آرام کی سانس لیں اور رات کی سیاہ چادر میں منہ چھپا کر سو جائیں، اس پرسکون اور خاموش فضا میں شبنم مسلسل ان پر نثار ہوتی رہتی ہے اور گل بوٹے بھی عطر بیزی کرتے رہتے ہیں، کہ دن بھر کا تھکا مسافر چند ساعت سکون و راحت کے ساتھ گزار لے۔

پھر خدا نے اس زمین کے لئے کیسے کیسے موسم رکھے، سخت گرمی کہ بدن جھلسا جا رہا ہو، یہ گرمی جو بظاہر تکلیف اور زحمت کا باعث ہے، سمندر کو گرماتی ہے اور جوش دیتی ہے، یہاں تک کہ اس سے بھاپ نکلنے لگتی ہے، پھر ہوائیں آتی ہیں اور اس بھاپ کو اپنی آغوش میں اٹھائے اٹھائے فضاؤں میں گھومتی رہتی ہیں اور انھیں جمع کر کے بادل بناتی ہیں، ٹھیک جب گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو یہ پانی سے بھرپور بادل زمین کی طرف اُترتے ہیں اور کائنات کی پیاس بجھاتے ہیں، زمین پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور اپنا سینہ چیر کر لہلہاتی ہوئی سبزہ زار کھیتیاں حضرت انسان کے حوالہ کرتی ہیں، زمین انھیں پالتی ہے، بارش ان کو پانی پلاتی ہے

اور شبنم ان پودوں کی بے روح بالیوں کو دانے کے وجود میں آنے کا باعث بنتی ہے، کتنے منصوبہ اور حسن انتظام کے ساتھ قدرت کا یہ کاروبار بلا وقفہ اپنا کام کر رہا ہے۔

پھر مختلف نباتات اور حیوانات کی افزائش کا نظام بھی دیکھیں تو قدرت کی وسیع منصوبہ بندی کا شاہکار ہے، شیر کو سب سے طاقتور حیوان مانا گیا ہے، بڑا سے بڑا جانور اس کے لئے لقمۂ تر ہے، اپنی حفاظت اور مدافعت اس پر چنداں دشوار نہیں؛ لیکن شیر کی نسلیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور آج شیر کی نسلوں کو باقی رکھنے کے لئے کتنے ہی جوکھم کئے جا رہے ہیں، ہاتھی اس سے بھی بڑے جسم کا جانور ہے، اس کا ایک قدم کئی انسانوں کی جان لینے کے لئے کافی ہے؛ لیکن اس کی نسلیں بھی دن بدن کم ہوتی جاتی ہیں، بکری ایک کمزور اور نحیف الجثہ جانور ہے اور ایک کتا بھی اس کو پھاڑ کھانے کے لئے کافی ہے، ایک ایک دن میں اور ہر ہر شہر میں ہزاروں بکریاں ہیں، جو انسان کی غذا بن جاتی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود بکری کی نسل میں روز افزوں اضافہ ہے اور کبھی اس کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی، گائے بیل بمقابلہ ہاتھیوں کے کس قدر کمزور اور عاجز ہیں اور ہر دن کتنی ہی بڑی تعداد میں ذبح ہوتے ہیں؛ لیکن پھر بھی وافر تعداد میں موجود ہیں، مقام فکر ہے کہ کیا یہ سب کسی تدبیر و منصوبہ بندی کے بغیر ہو رہا ہے اور کیا اس کے پیچھے کسی حکیم اور علیم و خبیر کا ہاتھ نہیں؟

یقیناً یہ سب کائنات کے خالق و رب کا بنایا ہوا منصوبہ ہے، جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے، درخت کا ایک پتہ جو زمین پر گرتا ہے اور بلوں میں رہنے والی معمولی جسم و جثہ کی چیونٹی جو پیدا ہوتی ہے اور مرتی ہے، وہ اس کے مقرر کئے ہوئے منصوبہ کا ایک حصہ ہے: اسی لئے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو رب العالمین قرار دیا ہے، یعنی کائنات کے انتظام و انصرام کو ہر لحہ براہِ راست انجام دینے والا، جس خدا نے سورج اور چاند سے لے کر چیونٹی و مچھر تک کے لئے ایک منصوبہ بنا رکھا ہے، کیا اس نے انسانیت کے لئے جو اس کائنات کا حاصل اور مقصود ہے، کوئی منصوبہ نہیں بنا رکھا ہوگا؟ وہ حکیم اور رب ہے، رزق کی ذمہ داری اس نے قبول کی ہے اور اس شان سے قبول کی ہے کہ شیر و ہاتھی سے لے کر مچھر اور مکھی تک کے لئے روزی کا سامان

کرتا ہے: ''وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا'' (ہود:٦) تو کیا اس نے اس کا انتظام نہ کیا ہوگا کہ خلیفۂ کائنات حضرت انسان کی تعداد تو روز بروز بڑھتی جائے، لاکھ سے کڑور اور کڑور سے اربوں ہو جائے؛ لیکن ان کے لئے رزق کے وسائل اس نسبت سے محدود تر ہوتے جائیں گے، تو آخر یہ کیا کھائیں گے اور کیوں کر اپنی ضروریات پوری کریں گے؟

نہ کوئی صاحبِ ایمان ایسا سوچ سکتا ہے اور نہ کوئی صاحبِ عقل اس پر یقین کر سکتا ہے، قرآن مجید نے خوب کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں؛ لیکن وہ اس میں سے ایک متعین مقدار انسان کو عطا فرماتے ہیں: ''وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ'' (الحجر:۲۱) یعنی جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ وسائل بھی بڑھاتے جاتے ہیں، جب ایک معمولی سربراہِ خاندان اپنے افرادِ خاندان کی فکر رکھتا ہے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ان کی خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے، تو کیا خدائے حکیم وخبیر اپنی مخلوق سے غافل رہ سکتا ہے، جو اسی کے حکم و اشارہ سے دُنیا میں آئی ہے؟

کوئی بھی شخص دُنیا میں افرادی قوت میں اضافہ اور زمین کی پیداوار میں اضافہ کے تناسب کو دیکھے تو وہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق پر مجبور ہوگا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گراں قدر تالیف ''ضبطِ ولادت'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے، برطانیہ کے ایک تجزیہ نگار نے ۱۸۹۸ء میں چیلنج کیا تھا کہ افزائش آبادی میں کثرت اور وسائل پیداوار کے محدود ہونے کی وجہ سے تیس سال میں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ لوگوں کو اپنی ضروریات کے لئے گیہوں نہیں مل سکے گا؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس کے بعد کئی تیس سال گزرے اور گیہوں کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعض ملکوں کو قیمت پر کنٹرول رکھنے کے لئے فاضل گیہوں نذرِ آتش کرنے پڑے یا سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔

کرۂ ارض کی وسعت کے اعتبار سے انسانی آبادی کا حال یہ ہے کہ فی مربع کیلومیٹر صرف اکیس افراد کا اوسط ہوتا ہے اور زمین پر انسانی آبادی کی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہالینڈ میں فی مربع کیلومیٹر ۳۴۵ آدمی تمام سہولتوں کے ساتھ اقامت پذیر ہیں،

جاپان میں یہ تناسب اور بھی زیادہ ہے، گویا موجودہ آبادی کئی گنا بھی بڑھ جائے تو اقامت ورہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا، پھر اس پر غور فرمایئے کہ زمین کا کتنا حصہ ہے، جسے انسان کے لئے غذائی وسائل حاصل کرنے کی غرض سے آباد کیا جاتا ہے؟ اعداد وشمار کے مطابق زمین کا صرف دس فیصد حصہ اس وقت زیر کاشت ہے، بیس فیصد حصہ جنگلات وغیرہ پر مشتمل ہے اور ستر فیصد حصہ وہ ہے جسے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے اور ابھی اُفتادہ پڑا ہوا ہے، جتنے مالی وسائل حکومتیں خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج اور پروپیگنڈہ پر خرچ کرتی ہیں، اگر وہی وسائل ان افتادہ اراضی کو قابل کاشت بنانے پر صرف ہوں، تو انسانیت کی بھلائی اور خیر خواہی کا بڑا کام ہوگا۔

پھر زراعتی سائنس کی ترقی نے بھی پیداوار کو بڑھانے میں حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے، غور فرمایئے کہ ہندوستان میں فی ایکڑ گیہوں کی پیداوار کا اوسط ۲۹ کوئنٹل اور پاکستان میں ۳۰ کوئنٹل ہے اور اسی کا اوسط مصر میں ۹۵ کوئنٹل اور ڈنمارک میں ۱۶۳ کوئنٹل ہے، یہ ۱۹۵٦ء کا تجزیہ ہے اور یقیناً اس اوسط میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہوگا، اس وقت پسماندہ ملکوں میں جس چیز کی ایک فصل حاصل کی جاتی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں اسی کی تین تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں، اگر ایشیاء کے غریب ممالک ایٹم بم اور میزائل بنانے اور ۳۵، ۴۰ فیصد دفاعی ٹکنالوجی کے بجائے زراعتی اور طبی ٹکنالوجی حاصل کریں، تو نہ کسی گھر میں فاقہ کی نوبت آئے اور نہ کاشت کار خودکشی کرنے پر مجبور ہوں۔

یہ تو اعداد وشمار پر مبنی تجزیے ہیں؛ لیکن کچھ حقیقتیں اور تجربات ہیں، جن کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے، جن لوگوں کی عمریں تیس چالیس سال ہیں، وہ لوگوں کے موجودہ معیارِ زندگی اور پچیس تیس سال پہلے کے معیارِ زندگی کا تقابل کر کے دیکھ لیں، تو نمایاں فرق محسوس کریں گے، ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے لئے ٹرین میں تھرڈ کلاس کا سفر بھی دشوار ہوتا تھا، سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے مسافرین خال خال ہوا کرتے تھے؛ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ ٹرین کے اونچے درجے پہلے پُر ہوجاتے ہیں اور ہوائی جہاز میں بھی سیٹ حاصل کرنے کے

لئے ویٹنگ لسٹ میں جگہ لینی پڑتی ہے، دو تین دہے پہلے قصبہ جات ہی نہیں اوسط درجہ کے شہروں میں بھی زیادہ تر خام اور سفال پوش مکانات ہوا کرتے تھے، پختہ مکان اور خوبصورت حویلیاں رئیسوں اور زمینداروں کی ہوا کرتی تھیں؛ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت جن علاقوں کو سَلَم علاقہ قرار دیتی ہے، وہاں بھی ایک سے ایک عالی شان اور خوبصورت مکان مل جاتے ہیں، شخصی سواری کی حیثیت سے پندرہ بیس سال پہلے سائیکلیں بھی ایک اہمیت رکھتی تھیں اور بہت کم لوگ تھے جن کو موٹریں میسر تھیں؛ لیکن آج اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موٹروں کا ازدحام شہروں میں فضائی آلودگی کا مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔

یہی حال کھانے پینے کے معیار کا ہے، چوتھائی صدی پہلے جس معیار کی دعوت نوابوں اور بڑے رئیسوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھیں، اب عام آدمی بھی دعوت میں اس معیار کو برقرار رکھنا ضروری خیال کرتا ہے، مرغیوں اور انڈوں کی جو افزائش اس دور میں ہوئی ہے اور اس نے غریبوں کے لئے ان چیزوں کو جتنا سہل الحصول بنا دیا ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی دشوار تھا، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیفون اور اس طرح کی جدید گراں قیمت ایجادات اب دولت مند ہونے کی علامت نہیں ہیں؛ بلکہ اوسط سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے سماج میں بھی ان کا استعمال عام ہے اور پوری دُنیا میں آبادی کے مسلسل بڑھنے کے باوجود فی کس آمدنی میں نمایاں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کیا اس کے باوجود خدا کی رزاقیت سے مایوس ہونے اور یہ سوچنے کا جواز ہے کہ اگر انسان بڑھ گئے تو وہ کیا کھائیں گے اور کہاں رہیں گے؟

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خود قدرت نے آبادی کی تحدید اور افزائش نسل میں اعتدال و توازن کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے، نوعِ انسان ہی کے مسئلہ کو دیکھئے کہ عورت کے اندر فطری نظام کے تحت ہر سال کم سے کم ایک بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، اسی طرح اگر ایک خاتون اپنی ازدواجی زندگی کے پچیس سال تولید اور حمل کی صلاحیت کی حامل رہی تو اس کے پچیس بچے ہونے چاہئیں؛ لیکن ایسی مثالیں بھی شہر میں خال خال ہی ملیں گی کہ کوئی عورت دس بارہ بچوں کی ماں ہو، اب تو اس طرح خبریں اتنی انوکھی ہوگئی ہیں کہ وہ اپنی ندرت کی وجہ سے اخبار کی

سرخی بن جاتی ہیں، یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے کہ مرد و عورت کی تولیدی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا کنبہ نا قابل بیان حد تک مختصر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان اس دُنیا میں حادثات کے درمیان گھرا ہوا ہے، طوفان، سیلاب، قحط، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کا اُبل پڑنا، آتشزدگی، وبائی امراض کا پھیلنا، ٹرین اور ٹریفک کے حادثات، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی قدرتی اسباب ہیں، جس میں ہر سال لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور انسان خود اپنے ہاتھ اپنی ہلاکت کا جو سروسامان کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے، وہ ان سب سے سوا ہے، پہلی جنگ عظیم میں روس کو چھوڑ کر صرف یورپ میں دو کروڑ چوبیس لاکھ افراد کی کمی واقع ہوئی، صرف جرمنی میں انیس لاکھ افراد جنگ میں کام آئے، دوسری جنگ عظیم میں بھی ایک کرُوڑ ہلاکتوں کا اندازہ کیا گیا ہے اور اب انسان نے جس اعلیٰ درجہ کے ہلاکت خیز اور تہلکہ انگیز ہتھیار تیار کیے ہیں، خوانخواستہ اگر تیسری جنگ عظیم ہو جائے، تو نہ معلوم کتنے لوگوں کا خون پی کر یہ آسودہ ہوگی؟ اسی طرح قدرتی طور پر انسانی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ ہر سال غیر معمولی حادثات اور واقعات کی نذر ہو جاتا ہے، یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے، جو اپنے خاموش ہاتھوں سے نسل انسانی کی تحدید کرتی جارہی ہے۔

جن ملکوں اور قوموں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اس نسخہ کو آزمایا ہے، وہ اس کے مضر پہلوؤں کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، افرادی وسائل کی کمی، زنا اور بدکاری کی کثرت اور اس کی وجہ سے امراض خبیثہ کی بہتات، بے اولاد یا کم اولاد ہونے کی وجہ سے زوجین میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کا فقدان اور اس کی وجہ سے طلاق کی کثرت، شرح پیدائش اور نکاح کے رجحان میں کمی، یہ وہ نتائج ہیں، جن سے آج مغربی اقوام دو چار ہیں، تو کیا ہم نوشتۂ دیوار کو پڑھنے اور انسان کی خود ساختہ خاندانی منصوبہ بندی کے بجائے خدائی منصوبہ بندی کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں؟؟

(۳۱ر جولائی ۱۹۹۸ء)

تمباکو نوشی — اسلامی نقطۂ نظر

۲۱؍فروری کے اخبار میں یہ خوش کن خبر دیکھنے کو ملی کہ حکومت آندھرا پردیش گٹکھا پر پابندی عائد کر رہی ہے، کوئی بھی پان مصالحہ گٹکھا کی مہر کے ساتھ اب ممنوع ہوگا، حکومت کے اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۹۷ء میں 8.56 فیصد منہ کے کینسر کے مریض تھے، 2000ء میں یہ تعداد بڑھ کر 21.43 فیصد ہوگئی، جو دراصل گٹکھا کی خراب عادت کا نتیجہ ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بُری عادت کس طرح بہ تدریج معاشرہ میں سرایت کرتی جارہی ہے، اور کتنے ہی لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھارہی ہے۔

تمباکو خواہ کسی بھی صورت میں ہو، صحت کے لئے سخت نقصان دہ اور مضرت رساں ہے، عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ہر سال تمباکو خوری کی وجہ سے تقریباً ۳۰؍لاکھ افراد کی اموات واقع ہو جاتی ہے، جن میں ۲۰؍لاکھ اموات کا تعلق ترقی یافتہ ممالک سے ہے، یہ بیسویں صدی کے دسویں دہے کے وسط کی رپورٹ ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تمباکو نوشی کا یہ رجحان باقی رہا تو ۲۰۲۵ء تک دنیا بھر میں سالانہ ایک کروڑ اموات ہوسکتی ہیں، یہ ایسا بھیانک خطرہ ہے جو کسی خون ریز جنگ کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء امریکہ کی سرزمین سے ہوئی ہے، ۱۵؍ویں صدی کے اخیر میں کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، وہاں کولمبس نے سب سے پہلے اصل امریکی باشندوں جن کو اس نے ریڈ انڈین کا نام دیا، کو تمباکو پیتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے لوگ اس سے قطعاً ناواقف تھے، پھر یہ بلا امریکہ سے اسپین اور پرتگال پہنچی، پرتگال سے اس نے فرانس کا سفر طے کیا اور فرانس نے اس کی کاشت کو فروغ دینے اور اسے مقبول عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا، یورپ ہی کے ذریعہ ایشیا تک اس کی

رسائی ہوئی اور اس وقت تقریباً سو ممالک میں تمباکو کی باضابطہ کاشت کی جاتی ہے۔

چین اور امریکہ کے بعد تمباکو کی سب سے زیادہ کاشت ہمارے ملک ہندوستان ہی میں ہوتی ہے، حکومت کو تمباکو کے ٹیکس سے سالانہ ایک ارب پچاس کروڑ ڈالر ملتے ہیں، ایک اندازہ کے مطابق ہمارے ملک میں ۵۲ر کروڑ کیلو گرام تمباکو پیدا کیا جاتا ہے، اس میں سے نصف مقدار برآمد کردی جاتی ہے اور باقی ہندوستان ہی میں مختلف صورتوں میں استعمال کی جاتی ہے، ۱۵ لاکھ کسان تمباکو اگاتے ہیں، ۱۰ لاکھ تمباکو فارم ہیں، جس میں ۵۰ لاکھ افراد کام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء جنوب کے علاقہ سے ہوئی؛ کیوں کہ انگریز ہندوستان میں اسی طرف سے داخل ہوئے تھے، ایک صاحب علم اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں :

> امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی بمبئی، ٹراونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں رقم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمالی مشرقی ہند میں پہنچا۔ (خواص تمباکو: ۱۳-۱۴)

تمباکو خوری کی خُو ایسی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہے کہ زمانہ قدیم میں لوگ تمباکو کی مضرتوں سے واقف نہ رہے ہوں، تمباکو کی تاریخ جتنی قدیم ہے تمباکو کی مضرت کا احساس بھی اسی قدر قدیم رہا ہے، سرکاری طور پر اس کے مضر صحت ہونے کا اعلان پہلی دفعہ ۱۶۰۴ء میں فرمانروائے برطانیہ جیمس اول نے کیا، اور پھر اس کے نقصانات دن بہ دن لوگوں پر واضح ہوتے چلے گئے، ۱۸۵۹ء میں فرانس کی وہ رپورٹ سامنے آئی جس میں ایک ہسپتال میں کینسر کے مریضوں کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں جس کے مطابق پیٹ، گلے اور منھ کے کینسر کے کل مریضوں کی تعداد ۶۶ تھی اور یہ سبھی تمباکو کو استعمال کرنے والے لوگ تھے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سگریٹ نوشی میں بہت اضافہ ہوگیا اور اس عادت

نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ۱۹۶۴ء میں امریکہ کی ایک تنظیم کی جانب سے دوسالہ تحقیقات کا نتیجہ پیش کیا گیا، جس میں بتایا گیا کہ امریکی مردوں میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں میں ستر فیصد شرح اموات کا اضافہ ہوگیا ہے، امریکہ میں جو تمباکو جنم داتا ہے، تمباکو نوشی کے روک تھام کے لئے بہت سی کوششیں بھی کی گئی ہیں، سب سے پہلے امریکہ ہی میں ۱۹۶۶ء میں سگریٹ کے پیکٹوں پر تمباکو کے مضر صحت ہونے کی عبارت لکھنی لازم قرار دی گئی اور یکم جنوری ۱۹۶۶ء سے اس کا نفاذ ہوا، یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے سگریٹ کا اشتہار ٹی وی پر بند کردیا گیا؛ لیکن ان کوششوں کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ۱۹۹۱ء میں تمباکو نوشی کی وجہ سے ساڑھے تین لاکھ افراد کی موت واقع ہوگئی اور خود ہندوستان میں ہر سال آٹھ لاکھ افراد تمباکو نوشی کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو مشہور مذاہب پائے جاتے ہیں، ان سب کے مذہبی پیشواؤں نے تمباکو نوشی کی مذمت کی ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، سکھوں کے دسویں گروگرو گوبند سنگھ نے تو اپنے متبعین کے لئے تمباکو کی بہت ہی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے، جس پر سکھ فرقہ کا عمل بھی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں واضح ہے، قرآن مجید نے کچھ بنیادی اصول حلال وحرام ہونے کے سلسلہ میں بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو چیزیں پاک وطیب ہیں وہ حلال ہیں اور جو خبیث ہوں وہ حرام ہیں: ''يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ '' (الأعراف: ۱۵۷) خبیث سے ایسی چیزیں مراد ہیں، جن کو سلیم طبیعتیں ناپسند کرتی ہوں: ''تستخبثه الطباع السليمه وتنفر منه '' (التفسير الوجيز للزحيلي: ۱۷۱) —— اور یہ بات ظاہر ہے کہ تمباکو کی ہر صورت عموماً اور گٹکھے کی یہ نئی شکل خصوصاً ثقہ اور شریف لوگوں کی نگاہ میں نہایت ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے: ''لا تلقوا بايديكم الى التهلكة '' (البقرة: ۱۹۵) —— اور اس طرح کی چیزوں کا

استعمال انسان کو ہلاکت سے قریب اور مہلک بیماریوں میں مبتلاء کردیتا ہے، پھر اس سے انسان کو کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں، نہ اس سے بھوک دور ہوسکتی ہے، نہ اس سے دل ودماغ کو جلاء حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی حصہ جسم کو اس سے کوئی نفع پہنچتا ہے اور اس مضر صحت خو کی وجہ سے انسان اپنی گاڑھی کمائی اس بے فائدہ کام میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے، اس لئے یہ خرچ یقیناً فضول خرچی میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی کو منع فرمایا ہے: ''ولا تسرفوا '' (الانعام:۱۴۱) — بلکہ فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا: ''ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین ''۔ (الاسراء:۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے ہر ایسی چیز سے منع فرمایا ہے، جو انسان کو نشہ میں مبتلاء کرنے والی، یا اس کے جسم کو کمزور اور اس کی صحت کو متاثر کرنے والی ہو: '' نھی رسول اللہ ﷺ عن کل مسکر ومفتر '' (الحدیث) — گٹکھا بھی یقیناً مفتر چیزوں میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو مضرت رساں ہو، خواہ اس کی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے: ''لا ضرروا لا ضرار '' گٹکھا اور سگریٹ وغیرہ خود اس کے لئے ضرر رساں ہے اور اس کا دھواں دوسروں کو بھی نقصان میں مبتلاء کرتا ہے۔

اسی لئے بعض فقہاء نے تمباکو حرام اور بعض نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ رقمطراز ہیں :

> وکذا تحرم جوزة الطیب وکذا التتن الذی شاع فی زماننا ولا سیما بعد نھی ولی الامر نصرہ اللہ
> (الدر المنتقیٰ علی ھامش مجمع الانھر:۵۴۲/۲،کتاب الاشربہ)
> ایسا ہی جائفل اور تمباکو جو ہمارے زمانہ میں عام ہوگیا ہے، حرام ہے، خاص کر سلطان (اللہ ان کی مدد کرے) کی طرف سے ممانعت کا فرمان جاری ہونے کے بعد۔

گو اکثر علماءِ احناف نے اور ہندوستان میں ماضی قریب کے اہل علم نے تمباکو کو مباح یا صرف مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے؛ لیکن ایسا اس وجہ سے کہ تمباکو کے استعمال کی متنوع صورتیں،

اس میں پائے جانے والے زہرناک اجزاء اور صحت کے لئے اس کا شدید مضرت رساں ہونا، ان حضرات کے سامنے غالباً نہیں آپایا تھا، خاص کر گٹکھے کی مضرت اور اس کی وجہ سے منھ میں کینسر کا پیدا ہونا اور ہونٹوں کی وضع کا سکو جانا ایک عام مشاہدہ ہے، اس لئے اس کو خبائث میں شمار کیا جانا چاہئے، جو لوگ گٹکھے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اپنے اس عمل کو اپنے بزرگوں کی نظر سے چھپاتے ہیں اور مہذب وشائستہ مجالس میں اس کے ارتکاب سے گریز کرتے ہیں، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ سلیم طبیعتوں کے لئے یہ ایک ناگوار شئے ہے۔

اس لئے گٹکھا اور اس طرح کے مضرت رساں تمباکو کی مصنوعات کو یوں تو حرام ہونا چاہئے؛ لیکن اگر از راہِ احتیاط حرام نہ کہا جائے، تو یہ مکروہ تحریمی اور قریب بہ حرام ضرور ہیں، حکومت کا یہ اقدام خوش آئند اقدام ہے، ہمیں اس کو سراہنا چاہئے، جو لوگ اپنے آپ کو ملک وقوم کے بہی خواہ اور محب وطن کہتے ہیں، ان کو لوگوں میں نفرت کی سوداگری کرنے کے بجائے ایسی چیزوں کے خلاف مہم جوئی کرنی چاہئے اور سماج میں انسانوں سے نفرت کے بجائے مہلک انسانیت چیزوں سے نفرت کی تعلیم دیں، تو یہ واقعی حب الوطنی کا صحیح ثبوت ہوگا۔

(یکم مارچ ۲۰۰۲ء)

پتّی میں خون کی آمیزش

جام و مینا اور بادۂ و ساغر ہمیشہ شاعروں کا محبوب اور ممدوح رہا ہے اور اکثر شعراء اس کے اسیر زلف رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مرتے مرتے بھی ہمارے شاعروں کو شراب و کباب کی یاد تڑپاتی اور ترساتی رہتی تھی، چچا غالب تو کہہ گئے :

گو ہاتھ میں جنبش نہیں ، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہاں تک کہ جو لوگ دہن سے شراب کو نہیں لگاتے تھے وہ بھی اپنی شاعری کو ضرور ہی اس سے خمار آلود کرتے تھے، جب ہی تو ریاض خیر آبادی جیسے زاہد مزاج شاعر کے یہاں بادۂ و مے کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے؛ بلکہ کہنے والے نے کہا کہ :

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

یہاں تک کہ مرزا حالی کو اُردو شعراء سے گلہ کرنا پڑا کہ ان کی شاعری تاڑی کی دکان ہو کر رہ گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ''رندان خوش مذاق'' کو چائے کی طرف کم توجہ ہوئی، کم سے کم اُردو شعراء کے دیوان میں شاید ہی چائے کے بارے میں پانچ دس اشعار بھی مل سکیں؛ کیوں کہ اس میخانہ میں شراب طہور کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تھی، ایک ملحد شاعر نے چائے پر کچھ کہا بھی، تو اس کو بھی ''الحاد'' سے آلودہ کر کے، کہ :

وہ تو کہیے عرب میں چائے نہ تھی
ورنہ وہ بھی حرام ہو جاتی

لیکن لگتا ہے کہ شاعر کا یہ اندیشہ اب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے!

اس خبر نے یقیناً چائے پینے، پلانے اور بیچنے اور خریدنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا

ہوگا کہ بعض کمپنیاں چائے کو خوش رنگ بنانے کے لئے اس میں خون اور گوشت کے رس کی آمیزش کررہی تھیں اور بی جے پی حکومت جو بانگ دہل اپنے آپ کو ہندو فکر اور ہندو ثقافت کا ترجمان کہتی ہے اور اس فلسفہ پر یقین رکھتی ہے کہ انسانی ضرورت کے لئے بھی حیوانات کو ذبح نہیں کرنا چاہئے اور انسان کو لحمی غذاؤں کے بجائے جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں، ساگ سبزی پر اکتفا کرنا چاہئے (اسی ضمن میں گاؤ کشی بند کرنے کی بات بھی بڑی قوت کے ساتھ کہی جاتی ہے اور اس کے لئے تحریکیں چلائی جاتی ہیں) نے اس کے لئے پروانۂ اجازت بھی دے دیا تھا۔

باعثِ تعجب اَمر یہ ہے کہ خون کی آمیزش کے معاملہ میں کسی جانور کی تخصیص بھی نہیں، ذبیحہ ہو یا مردار اور گائے ہو یا خنزیر، میں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی یاد آئی، اس تحریک کو جس خبر یا افواہ نے قوت پہنچائی، وہ یہی تھی کہ بندوق کے کارتوس جسے غالباً دانت سے کھینچنا پڑتا تھا، اس پر خنزیر کی چربی لگائی جاتی ہے، یہ خبر ایک آگ بن گئی، ایسی آگ جو بنگال سے اٹھی اور میرٹھ ہوتے ہوئے آتش فشاں بن کر دہلی پر ٹوٹ پڑی؛ لیکن آزاد ہندوستان میں آج کے اس واقعہ نے کوئی چنگاری بھی پیدا نہیں کی؛ کیوں کہ مال و متاع اور معاشی ترقی کی حرص نے ملک سے اس کی غیرت کا سودا کرلیا ہے، اب بیرونی کمپنیاں صنعت و تجارت کی آڑ میں ہماری فکر پر وار کرسکتی ہیں، ہماری ثقافت کو تباہ و برباد کرسکتی ہیں، اور ہماری اس آزادی پر قہقہہ زن ہیں کہ عہد غلامی میں جو غیرت تھی، آزادی کی اس زندگی میں ہم اس سے بھی محروم ہیں۔

خون ایک ناپاک شئے ہے، قرآن مجید نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ خون کے ناپاک ہونے کا ذکر کیا ہے (النحل: ۱۱۵) اور غالباً اس کے ناپاک اور حرام ہونے پر تمام ہی مذاہب متفق ہیں، اسلامی شریعت میں اگر جانور کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا جائے، تو اس کا پورا وجود حلال اور پاک ہوجاتا ہے؛ لیکن سات اجزاء وہ ہیں، کہ اس کے باوجود حرام رہتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان ہی میں سے ایک خون ہے، حلال جانوروں کا

گوشت چوں کہ ذبح کی وجہ سے پاک ہو جاتا ہے، اس لئے اس سے حاصل کیا گیا رس بھی اسلامی نقطۂ نظر سے پاک اور حلال ہے؛ لیکن حرام جانور کا کوئی بھی جزء حرام ہی ہے، بعض صورتوں میں اس کا خارجی استعمال تو کیا جا سکتا ہے؛ لیکن کھانے پینے کی اشیاء میں کسی طور اس کا استعمال درست نہیں، خنزیر کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ سراپا نجاست ہے، اس کے کسی جزء کا جسم کے خارجی حصہ میں بھی استعمال کرنا اضطرار کی کیفیت کے بغیر جائز نہیں۔

پھر چائے ایسی جامد شئے ہے، جس میں سیّال مادہ کو جذب کرنے کی بہت صلاحیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون چائے میں ملایا جائے، تو چائے اسے اپنے اندر پوری طرح سمو لیتی ہے، ایسی جذب کی صلاحیت رکھنے والی شئے میں اگر کوئی ناپاک چیز مل جائے، تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے پاک کرنے کی کوئی صورت نہیں اور بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اسے تین بار پانی میں ابالا یا پھلایا جائے اور ہر بار ابالنے سے پہلے خشک کر لیا جائے، تب ہی وہ پاک ہو سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اگر پتی کو اس مرحلہ سے تین بار گذارا جائے، تو کیا خاک اس میں خوش ذائقی اور خوش رنگی باقی رہے گی؟ فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کا ملتا ہے، جس سے چائے کے مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں :

> ثم قال سیدی عبد الغنی : وهذا بخلاف المصبوغ بالدم كالثياب الحمر التي تجلب في زماننا عن ديار بكر فلا تطهر ابدا مالم يخرج الماء صافيا ويعفى من اللون .
>
> (رد المحتار :۲۴۲/۱، ۲۴۱)
>
> میرے بزرگ شیخ عبد الغنی نے فرمایا کہ یہ صورت اس صورت کے برخلاف ہے جب کہ کوئی چیز خون میں رنگی جائے، جیسے وہ سرخ کپڑے، جو ہمارے زمانہ میں دیار بکر کے علاقے سے لائے جاتے ہیں، کہ جب تک اس کپڑے سے صاف پانی نہ نکلنے لگے اور رنگ سے بالکل خالی نہ ہو جائے، وہ کپڑے قطعاً پاک نہیں ہو سکتے۔

اس لئے حاصل یہی ہے کہ چائے میں اگر اس طرح کی کوئی ناپاک شئے مل جائے، تو شرعاً وہ ناقابل استعمال ہے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی شئے میں تغیر کی دو صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے دوسری چیز کے ساتھ مل جائے، اور دونوں خلط ملط ہو جائیں، اس صورت میں اس شئے کا حکم باقی رہتا ہے، مثلاً پانی میں پیشاب مل جائے، تو پیشاب کے اجزاء پانی کی معمولی مقدار میں اپنے اثرات کے ساتھ باقی رہتے ہیں، اس لئے پیشاب کا حکم باقی رہے گا اور وہ ناپاک ہی سمجھا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ شئے اپنی حقیقت کو کھو دے اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے، جیسے گوبر آگ میں جلایا جائے اور راکھ ہو جائے، کسی نشہ آور مشروب میں نمک ڈال کر اسے سرکہ بنا دیا جائے اور نشہ پیدا کرنے کی جو کیفیت اس مشروب میں تھی جس سے اس کی شناخت اور پہچان تھی، وہ کیفیت ہی مفقود ہو جائے، تو یہ کیفیت حقیقت کی تبدیلی سے عبارت ہے، اس لئے اس میں حکم بدل جاتا ہے؛ لہٰذا گوبر ناپاک ہے اور اس کی راکھ پاک، نشہ آور مشروب ناپاک ہے اور اس کا بنا ہوا سرکہ پاک اور حلال۔

پتی میں اگر خون ملایا جائے تو اس سے خون کی حقیقت اور ماہیت بدل نہیں جاتی؛ بلکہ وہ اپنے خواص کے ساتھ باقی رہتا ہے؛ اسی لئے چائے کے رنگ اور ذائقہ پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اس پہلو سے بھی ایسی پتی ناپاک اور حرام ہی ہوگی۔

وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں بعد تاجران چائے کی جانب سے یہ وضاحت آگئی کہ خون کی آمیزش اور حکومت کی جانب سے اس کی اجازت کا تعلق صرف بین الاقوامی کمپنیوں سے ہے، نہ کہ دیسی کمپنیوں سے، اس خبر نے یقیناً چائے پینے والوں کو سہارا دیا ہوگا اور ایک حد تک انھیں اطمینان ہوا ہوگا، فقہی نقطۂ نظر سے جب صاحب معاملہ کوئی اطلاع دے، یا بیچنے والا اپنے سامان کے بارے میں حلال و جائز ہونے کی خبر دے، تو اس کی خبر معتبر ہوگی اور اس پر اعتماد کرنا درست ہوگا، اس پس منظر میں ایسی کمپنیوں کی پتی استعمال کی جاسکتی ہے۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہم ہیں، اول یہ کہ پتی کے بارے میں اس انکشاف پر زیادہ تر آواز ہندو انتہاء پسندوں اور بنیاد پرستوں نے اُٹھائی، مسلمان قائدین زیادہ تر اس پر خاموش رہے، چاہے یہ ان کی بے شعوری کی وجہ سے ہو یا کم ہمتی کی وجہ سے، بہرحال! یہ افسوس ناک بات ہے، افسوس کہ مسلمانوں میں جو لوگ بام اقتدار پر چڑھتے ہیں، وہ اپنے اقتدار کی حفاظت کو زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں اور دین اور امت کی حفاظت کو کم؛ حالاں کہ یہ مسلمان ہی ہیں، جو ان کے لئے سیڑھی کا کام کرتے ہیں — دوسرا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ نے عام مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑا دی، خود راقم الحروف کو کتنے ہی بھائیوں نے فون کیا، خطوط لکھے اور بالمشافہہ ملاقات کی؛ بلکہ بعضوں نے چائے سے احتیاط برتنی شروع کر دی اور یقیناً دوسرے اہل علم اور ارباب افتاء کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہوگا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی کتاب وسنت اور اپنے دین و مذہب سے عام مسلمانوں کا گہرا رشتہ ہے، وہ قدم قدم پر حلال وحرام کو سوچتا ہے، وہ مسجد میں عبادت کے لئے آیا ہو، یا دکان میں تجارت کے لئے بیٹھا ہو، وہ کہیں ملازم اور نوکر ہو، یا ذمہ دار وعہدیدار، رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہو یا پڑوسیوں کے ساتھ، نکاح وطلاق کا مسئلہ ہو یا ترکہ ومیراث کا، آج بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد زندگی کے ان مسائل میں علماء اور ارباب افتاء کی طرف رُجوع کرتی ہے، شاید ہی کسی اور قوم میں اپنے دین اور اپنی شریعت سے ایسا گہرا ربط وتعلق پایا جاتا ہو، یہ یقیناً مقام شکر بھی ہے اور موقعۂ دُعاء بھی، کہ اللہ تعالیٰ اُمت میں اس کیفیت کو باقی رکھے!

(۱۸/اگست ۲۰۰۰ء)

دستخط — اسلامی احکام

''دستخط'' کے اصل معنی ہاتھ کی تحریر کے ہیں؛ لیکن اصطلاح میں دستخط کرنا اپنا نام لکھنے کو کہتے ہیں، نام لکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سادہ طریقہ پر اپنا نام تحریر کردیا جائے، جس کی نقل دوسروں کے لئے دشواری کا باعث نہ ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ اس انداز پر نام لکھا جائے کہ اس کی نقل ایک گونہ دشوار ہو، گویا یہ ایک علامتی تحریر ہے، جو دستخط کرنے والے کی جانب سے کسی بات کی تصدیق وتوثیق کو ظاہر کرتی ہے، ایسی ہی تحریر کو عرف عام میں ''دستخط'' کہتے ہیں۔

ایک زمانہ میں اس مقصد کے لئے مہر (Stamp) کا استعمال ہوا کرتا تھا، یہ مہر انگوٹھی میں بنائی جاتی تھی، ممکن ہے کہ انگوٹھی میں مہر بنانے کا مقصد اس کی حفاظت ہو؛ کیوں کہ انگوٹھی ہر وقت آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اسے چوری کرنا آسان نہیں، اسی لئے عربی زبان میں انگوٹھی کے لئے خاتم کا لفظ معروف ہوگیا؛ حالاں کہ ''ختم'' کے اصل معنی مہر لگانے کے ہیں اور قرآن میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، (البقرۃ:۷) صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں اور اہل مکہ کے درمیان ایک محدود مدت کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوگیا اور آپ ﷺ کو دعوتِ اسلام کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ کا موقع ملا، تو آپ ﷺ نے شاہانِ عجم اور رؤساءِ عرب کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا، اس موقع سے بعض حضرات نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ حضرات مہر کے بغیر خطوط کو قبول نہیں کرتے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے مہر بنوائی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ کیا گیا اور آپ ﷺ نے کمالِ احترام کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے ''محمد'' اس کے اوپر ''رسول'' اور سب سے اوپر ''اللہ'' کے کلمات لکھے۔ (بخاری:۳/۸۷۳)

آپ ﷺ کا یہ عمل گویا دستخط کی اصل ہے، دستخط کا مقصود چوں کہ کسی تحریر کے تشخص اور استناد کو ظاہر کرنا ہے، یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے اور مذکورہ شخص کی طرف

اس کی نسبت قابل اعتماد واعتبار ہے، اس لئے دستخط ایسا کرنا چاہئے، جس کی نقل ایک حد تک مشکل ہو اور اس کی تحریر کا تشخص محفوظ رہے، کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو بدقماش لوگ اس کے مصنوعی دستخط کا سہارا لے کر تلبیس اور دھوکہ دہی سے کام لے کر دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؛ البتہ دستخط اتنا غیر واضح اور پیچ در پیچ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ صاحبِ دستخط کا نام ہی معلوم نہ ہو سکے اور پہلے سے نام معلوم نہ ہو تو دستخط میں اس نام کو پہچاننا دشوار ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو اس بات سے منع فرمایا تھا کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کے نقش پر لوگ اپنی انگوٹھیاں بنائیں، (بخاری و مسلم عن ابن عمرؓ) اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے دستخط کی نقل کرنا یا اپنے دستخط کو اس سانچے میں ڈھالنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ اس کے تشخص کو مجروح کرنا ہے اور اس سے تلبیس اور دھوکہ دہی کا راستہ کھل سکتا ہے؛ بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں کہ مہر اور دستخط کی نقل کر کے کسی شخص کی طرف خلافِ واقعہ بات منسوب کر دی گئی اور اس کو ظلم و جور اور افترا پردازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

ظاہر ہے کہ شریعت میں دھوکہ دینا سخت گناہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ دہی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے: "الخديعة في النار" (بخاری: ۲۸۷/۱، باب النجش) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ جو دھوکہ دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں: "من غش فليس منا" (ترمذی: ۲۴۵/۱) اور جو چیز گناہ اور حرام کا ذریعہ بنتی ہو وہ خود بھی گناہ اور حرام ہے، پس دستخط کی نقل چوں کہ تلبیس اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بن سکتی ہے، غلط دستخط کر کے حقوق چھینے جا سکتے ہیں، کسی شخص پر غیر واقعی ذمہ داریاں عائد کی جا سکتی ہیں اور کسی شخص کی طرف ایسی بات کو منسوب کیا جا سکتا ہے، جس سے وہ بری الذمہ ہے اور جو بات کسی خلافِ شرع کام کا ذریعہ بنتی ہے وہ خود بھی ناجائز ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دستخط کی نقل جائز نہیں اور اس سے خوب اجتناب کرنا چاہئے۔

دستخط سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ شریعت میں کس حد تک دستخط کا اعتبار ہے؟ اس سلسلہ میں فی الجملہ دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنے خطوط پر مہر

لگائی ہے، جو دستخط کے قائم مقام ہے، اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا اور شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تو آپ ﷺ نے مہر لگانے کا اہتمام نہ فرمایا ہوتا؛ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مقدمات اور نزاعی معاملات میں بھی دستخط کو ثبوت کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اہم اور علماء کے غور وفکر کا محتاج ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ حدود وقصاص —— یعنی ان سنگین جرائم سے متعلق مقدمات جن کی سزائیں شریعت میں معین ومقرر ہیں —— میں محض دستخط کی وجہ سے جرم ثابت نہیں ہوتا، اگر مطلوبہ گواہی موجود نہ ہو یا اس نے عدالت میں اپنے جرم کا اقرار نہ کیا ہو؛ البتہ دوسرے معاملات بالخصوص مالی مقدمات میں دستخط بھی ثبوت کی فراہمی کے لئے کافی ہو سکتا ہے کیوں کہ اسبابِ قضاء میں سے ایک ''قرائن قاطعہ'' بھی ہے (البحر الرائق: ۷/۲۰۵) یعنی کسی واقعہ پر ٹھوس اور واضح علامتوں کا موجود ہونا، دستخط بھی ایسی ہی علامتوں میں سے ہے۔

فقہاء کے یہاں بھی ہمیں اس سلسلہ میں بعض نظیریں ملتی ہیں، تحریر کس حد تک کس معاملہ کے ثبوت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ اسلام کے عدالتی قوانین میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے (دیکھئے: تبصرۃ الحکام: ۱/۳۵۹) اور فی الجملہ تحریر کو بھی ثبوت کا ایک ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے، اس سے ''دستخط'' کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر دستخط سے قاضی کو اس تحریر کے درست ہونے کا بھروسہ ہو جائے اور ایسی وجوہ موجود ہوں جو اس تحریر کے معتبر ہونے کا تقاضا کرتی ہوں، تو دستخط کی وجہ سے وہ دستاویز اور اقرار نامہ معتبر ہوگا، اسی لئے قرآن مجید نے دین کو لکھ لینے کا حکم دیا ہے (بقرۃ: ۲۸۲) اگر تحریر کی اہمیت نہیں ہوتی تو اس حکم کا کوئی معنی نہیں اور جب عام تحریر بھی معتبر ہے تو دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، اسی لئے اسلام کے قانونِ قضاء کے مشہور عالم قاضی ابن فرحون مالکیؒ (م: ۷۹۹ھ) نے وثیقہ یعنی دستاویز کی شہادت کی اساس پر فیصلہ کرنے کا ذکر کیا ہے، (تبصرۃ الحکام علی ہامش فتح العلی المالک: ۲/۸۳، ۸۲) پس خلاصہ یہ ہے کہ ایسی تحریریں جو دستخط سے مزین ہوں، شرعاً معتبر ہیں الا یہ کہ اس میں تلبیس پائے جانے کی کوئی قوی وجہ موجود ہو۔

دستخط کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس بات کی تصدیق مقصود ہو اس کے نیچے دستخط کیا جائے ، اسی طرح خطوط و مراسلات میں بھی مکتوب نویس اپنا دستخط نیچے کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات میں نیچے مہر لگائی ہے ، دراصل دستخط اور مہر کا مقصود سلسلۂ کلام کو وہاں ختم کرنے کے ہیں اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آگے اس میں جو بھی اضافہ ہوگا وہ صاحب تحریر کی طرف سے تصدیق شدہ نہیں ہے، اسی لئے آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے اختتام کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید میں '' خاتم النبیین '' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (الاحزاب:۴۰)

جو حکم دستخط کا ہے قریب قریب وہی احکام نشانِ ابہام ، مہر اور لیٹر اور لیٹر پیڈ کے بھی ہیں : البتہ مہر اور لیٹر پیڈ میں بہ مقابلہ دستخط کے تلبیس اور دھوکہ دہی کا اندیشہ زیادہ ہے ؛ کیوں کہ ان کی نقل آسان ہے ، اس لئے اعتماد و اعتبار کے لحاظ سے بھی ان کا درجہ دستخط سے کم ہے، نشانِ ابہام میں دھوکہ دہی کا امکان بہت کم ہے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے انگوٹھے کے نشانات کو دوسرے سے ممتاز رکھا ہے ، بظاہر انسان اس معاملہ میں دوسرے کی نقل کرنے پر قادر نہیں ، اس لئے یہ زیادہ قابلِ بھروسہ ہے ، اسی لئے یہ بات بہتر ہے کہ اہم معاملات کی دستاویزوں پر دستخط کے ساتھ ساتھ نشانِ ابہام بھی لے لیا جائے۔

آدمی کا ہر عمل اس کے مزاج و مذاق کا آئینہ دار ہوتا ہے ، مثلاً اگر کوئی شخص تیز تیز چلتا ہو، تو یہ اس کے عجلت پسند ہونے کی علامت ہے ، کوئی شخص اپنی مونچھیں اونچی کرتا ہو تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مزاج میں عُجب اور تکبر ہوگا ، چال ڈھال ، گفتار و رفتار اور نشست و برخاست کی طرح آدمی کی تحریر بھی اس کی اندرونی کیفیات کی غماز ہوتی ہے ، اسی لئے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ آدمی کا دستخط بھی اس کی اندرونی کیفیت اور صلاحیت کا عکس ہے ، بعض لوگ اپنے دستخط اس طرح کرتے ہیں کہ گویا پھول بنا رہے ہیں ، بعض لوگوں کا دستخط تلوار یا کسی ہتھیار کے مماثل ہوتا ہے ، بعض دستخط بہت پر پیچ ہوتے ہیں ، بعض ایسے جن سے کوئی نام ہی نہ سمجھا جاسکے اور بعض اتنے سادہ کہ گویا عام طریقہ پر نام لکھ دیا گیا ہو ، یہ آدمی کے جمالیاتی ذوق ، حلم یا غصب ، فکر و عمل کی صداقت یا نفاق ، نیز ذہانت و غباوت کی کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں ؛

لیکن دستخطوں کے ذریعہ کسی شخصیت کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا دشوار ہے؛ کیوں کہ اکثر اوقات لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کے دستخط کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اسی کو اختیار کرتے ہیں، گویا یہ ان کا طبع زاد دستخط نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ ایک طرح کی نقل ہے، ظاہر ہے اس کو دستخط کرنے والے کی اپنی اندرونی کیفیت کا مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے محض دستخط کو کسی شخص کے مزاج اور صلاحیت کو سمجھنے کا ذریعہ تصور کرنا درست نہیں کہ اس سے بدگمانی اور غلط فہمی کا دروازہ کھل سکتا ہے اور کسی مسلمان؛ بلکہ بلاوجہ کسی انسان سے بھی ''سوءِ ظن'' درست نہیں۔

(۲۳/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

قرض — فضائل و مسائل

اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں اپنے بندوں کے درمیان فرق کیا ہے اور یکسانیت نہیں برتی ہے، یہی نابرابری ہے جس سے کائنات کا نظام جاری وساری ہے، اگر یہ نابرابری نہ ہوتی تو نہ کوئی شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کا محتاج ہوتا اور نہ کسی سرمایہ دار کو کوئی مزدور اور کار کن ہاتھ آتا، یہی احتیاج اور ضرورت بعض اوقات انسان کو قرض کے لین دین پر مجبور کرتی ہے، اگر جائز طریقے پر اہل ثروت اپنے غریب بھائیوں کو قرض دیدیں تو خود بخود سود کا راستہ بند ہو جائے، افسوس کہ ایک تو مسلمانوں میں یہ برادرانہ اسپرٹ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے زائد از ضرورت مال میں دوسرے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کریں اور نہ لوگ قرض کے احکام و مسائل ہی سے واقف ہوں۔

قرض کے لین دین کا ثبوت قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی اور اس پر اجماع واتفاق بھی ہے اور مصلحت انسانی کا تقاضا بھی ہے، قرآن نے اللہ کے راستہ میں انفاق کو ''قرضِ حسن'' قرار دیا ہے، (البقرۃ: ۲۴۵) اس میں قرض کے جائز؛ بلکہ مستحب اور مطلوب ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، ایک جگہ ''دین'' کے ساتھ مدت لکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۸۲) دین کا لفظ عام ہے اور قرض بھی اس کے دائرہ میں آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ارشاد نبوی ﷺ نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوبار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے، (سنن بیہقی: ۳۵۳/۵، ابن ماجہ: ۶۰/۲ مع تحقیق الاعظمی، وفیہ سلیمان وھو متروک) اور بھی متعدد روایتیں ہیں جن میں قرض دینے کی فضیلت وارد ہے، اسی لئے اس کے جائز ہونے پر اُمت کا اجماع ہے، (المغنی: ۲۰۷/۴) پھر قرض ایک ایسی مصلحت ہے کہ بہت سے مواقع پر اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لئے اگر اس کی گنجائش نہ رکھی

جائے تو تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا اور ناقابل برداشت حرج وتنگی کو دور کرنا شریعت کا ایک اہم ترین مقصد ہے، ارشاد ربانی ہے: ''مَا يُرِيدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ '' (المائدۃ:۶) نیز فرمایا گیا کہ اللہ تم پر آسانی چاہتے ہیں نہ کہ دشواری: ''يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ''. (البقرۃ:۱۸۵)

قرض لینا گو مباح ہے لیکن قرض دینا مستحب ہے؛ کیوں کہ یہ نیکی اور بھلائی میں تعاون ہے (الشرح الصغیر: ۲۹۲/۳) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے قرض دین کی فضیلت اوپر مذکور ہو چکی ہے، حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے جنت کے دروازہ پر شب اسراء میں لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گونہ ہے اور قرض کا اٹھارہ گونہ، میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ سائل مال رہنے کے باوجود دست سوال دراز کرتا ہے اور اس پر صدقہ کیا جاتا ہے اور قرض کا خواستگار ضرورت ہی پر طلب گار قرض ہوتا ہے، (ابن ماجہ: ۵۶/۲، حدیث نمبر: ۲۴۴۳) نیز حضرت ابو درداء ؓ سے مروی ہے کہ یہ بات کہ میں دو دینار قرض دوں پھر وہ واپس آجائیں اور میں ان کو کسی اور کو قرض دے دوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو صدقہ کر دوں، (المغنی: ۲۰۷/۴) حضرت انس ؓ کی ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ کسی چیز کو قرض دینا اس کے صدقہ کرنے سے بہتر ہے: ''قرض الشیئ خیر من صدقتہ''۔ (سنن بیہقی: ۳۵۴/۵)

ان روایات سے نہ صرف قرض کی فضیلت اور اس کا استحباب ظاہر ہوتا ہے؛ بلکہ مواقع واحوال کے لحاظ سے قرض کا بعض اوقات صدقہ سے بھی زیادہ باعث ثواب ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر محتاج کی حاجت مندی کا یقین کر کے اُسے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ صدقہ افضل ہے؛ لیکن اگر یقینی طور پر اس کا علم نہیں تو قرض کی فضیلت زیادہ ہے، اس لئے کہ جو لوگ خوددار طبیعت کے مالک ہوں وہ مجبوراً ہی قرض کے طالب ہوتے ہیں۔

قرض کے مستحب ہونے کا حکم ظاہر ہے اس وقت ہے جب قرض دہندہ کے علم

یا اندازہ کے مطابق قرض کسی جائز ضرورت کے لئے لیا جا رہا ہو، اگر کسی مکروہ یا حرام و معصیت کے ارتکاب کے لئے قرض لے، تو دانستہ اس مقصد کے لئے قرض دینا درست نہیں، مکروہ میں تعاون بھی مکروہ اور حرام کا تعاون بھی حرام ہے؛ کیوں کہ جو حکم مقصد کا ہوتا ہے، وہی حکم ''ذریعہ'' کا بھی ہوتا ہے۔

قرض لینا مباح ہے، (المغنی: ۴/۲۰۷) خود آپ ﷺ سے قرض لینا ثابت ہے: البتہ یہ ضروری ہے، کہ جائز مقصد کے لئے قرض لیا جائے، ابن ماجہ میں روایت ہے، کہ اللہ تعالیٰ قرض لینے والے کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک وہ ادا نہ کرلے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے مقصد کے لئے دَین حاصل کرے جو اللہ کو ناپسند ہو، (ابن ماجہ: ۲/۵۶، حدیث نمبر: ۲۴۳۳) یا اس ارادہ سے قرض کرلے، کہ ادا نہیں کرنا ہے، یہ بھی گناہ کی بات ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں چور شمار کیا جائے گا (حوالۂ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۴) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص دوسروں کا پیسہ ڈبانے کے لئے قرض کرلے، اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کردیں گے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۶) حضرت میمونہؓ راوی ہیں کہ جو شخص اس ارادہ سے دَین لے کہ اسے ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا دَین ادا کرادیں گے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۴) —— غرض شدید ضرورت کے بغیر اور غیر شرعی ضرورت کے لئے، نیز عدم ادائیگی کی نیت سے قرض لینا گناہ ہے، جائز مقصد کے لئے، ضرورت کی وجہ سے اور حسبِ وعدہ ادا کرنے کی نیت سے قرض لینا مباح اور جائز ہے۔

اگر مقروض تنگدستی میں مبتلا ہو، تو اس کو مزید مہلت دینی چاہئے اور ممکن ہو تو کچھ معاف بھی کردینا چاہئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۴۴) پھر آپ ﷺ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ قرض کی ادائیگی کا مطالبہ مناسب طریقے پر کرنا چاہئے۔ (حوالۂ سابق: باب حسن المطالبة)

جہاں ایک طرف آپ ﷺ نے قرض دہندہ کو، حسن سلوک کی ہدایت دی، وہیں

مقروض کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ قرض خواہ کے ساتھ زیادتی نہ کرے اور بہتر معاملہ رکھے، باوجود استطاعت کے، قرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور ٹال مٹول کو آپ ﷺ نے بہت ناپسند فرمایا ہے، اور فرمایا کہ یہ چیز، اس کی بے عزتی اور سزا کا جواز پیدا کردیتی ہے: ''لَيُّ الواجد يحل عرضه و عقوبته'' (ابن ماجہ: ۶۰/۲، حدیث نمبر: ۲۴۵۲) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے متوفی کے مال میں سے پہلے اس کا دَین ادا کرنے کا حکم فرمایا، (ابن ماجہ: ۶۰/۲، حدیث نمبر: ۲۴۵۸) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو دَین کی ادائیگی میں بہتر ہو، (ابن ماجہ: ۶۰/۲، حدیث نمبر: ۲۴۴۸) ایک حدیث میں وارد ہے کہ مومن کی روح اس کے دین کے ساتھ معلق رہتی ہے؛ تا آں کہ اس کی طرف سے ادا کردیا جائے۔ (ابن ماجہ: ۶۰/۲، حدیث نمبر: ۲۴۳۷)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس کا انتقال ہو اس پر ایک دینار یا درہم بھی باقی ہو تو اسے اس کی نیکیوں میں سے وصول کیا جائے گا۔

(ابن ماجہ: ۶۰/۲، حدیث نمبر: ۲۴۳۹)

قرض دہندہ کو قرض پر نفع حاصل کرنا اور شرط لگانا کہ مقروض اسے اضافہ کے ساتھ واپس کرے حرام ہے اور سود میں داخل ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے قرض پر نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایتوں میں اسے سود قرار دیا گیا: ''كل قرض جر منفعة فهو ربا'' (دیکھئے: تلخیص الحبیر: ۳۴/۳) اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

مقدار میں اضافہ تو حرام ہے ہی، کیفیت میں عمدگی کی شرط لگانا بھی جائز نہیں، مثلاً معمولی چیز دی اور شرط لگائی کہ اس کے بدلے بہتر چیز واپس کرے، یہ بھی درست نہیں (ہندیہ: ۲۰۲/۳) اگر قرض دہندہ نے شرط تو نہ لگائی؛ لیکن مقروض نے بہ طور خود عمدہ چیز واپس کی یا زیادہ مقدار کے ساتھ واپس کی، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

آج کل بعض ادارے قرض جاری کرتے ہیں اور قرض کے تناسب سے مقروض سے ماہانہ فیس رکنیت وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی جائز نہیں اور یہ بھی سود کے دائرہ میں آتا ہے ایسے قرض کو غیر سودی قرض کہنا محض دھوکہ ہے۔

فقہاء نے نہ صرف یہ کہ قرض پر اضافہ کو ناجائز قرار دیا اور اس کو نفع اٹھانے کا ذریعہ بنانے سے منع فرمایا ہے؛ بلکہ بالواسطہ طریقہ پر قرض سے نفع حاصل کرنے کا راستہ بھی بند کر دیا، مثلاً مقروض قرض دہندہ سے کوئی معمولی چیز گراں قیمت میں خریدے، یہ بھی مکروہ ہے (الدر المختار علی ہامش الرد: ۴/۱۹۵) اسی طرح یہ صورت بھی مکروہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص قرض لینے کے لئے آئے تو قرض دہندہ ساٹھ روپیہ تو اسے قرض کے دیدے اور بیس روپیہ کی چیز اسے چالیس روپیہ میں فروخت کر دے تا کہ مقروض کے یہاں اس کے سو روپیہ ہو جائیں؛ حالاں کہ مقروض کو اس سے اسی روپیہ ہی حاصل ہوگا۔ (رد المحتار: ۴/۱۹۵)

سود خوار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور سود کے چور دروازوں کو بند کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے مقروض کی طرف سے تحائف کے قبول کرنے میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، حضرت انس ﷺ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جب کوئی قرض دے اور مقروض کوئی تحفہ دے یا اپنی سواری پر بیٹھائے تو اسے قبول نہ کرنا چاہئے سوائے اس کے کہ پہلے سے ان کے درمیان باہم تحائف کا لین دین رہا ہو، (ابن ماجہ: ۲/۸۱۳) حضرت اُبی ابن کعب ﷺ جہاد کی غرض سے عراق کی طرف سے جا رہے تھے تو زر بن حبیش نے حضرت اُبی ﷺ سے کہا کہ آپ ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں سود کا عام رواج ہے، اس لئے اگر آپ کسی کو قرض دیں اور وہ آپ کو قرض کے ساتھ کچھ تحفہ بھی دیں تو اس کا تحفہ قبول نہ کریں۔

اسی بنا پر فقہاء نے بھی مقروض کے ہدایا اور دعوتوں میں احتیاط کا حکم دیا، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے دعوت نہ دیتے رہے ہوں یا ہدایا و تحائف کا معمول نہ رہا ہو تو ایسی دعوت و تحفوں کا قبول کرنا جائز نہیں، ہاں معاملہ قرض سے پہلے سے اس طرح کا معمول رہا ہو تو اب جائز ہے، (ہندیہ: ۳/۲۰۳) قریب قریب یہی رائے دوسرے فقہاء کی بھی ہے۔ (دیکھئے مواہب الجلیل: ۴/۵۴۶، کشاف القناع: ۳/۳۰۵)

(۷/مئی ۱۹۹۹ء)

زکوٰۃ — کچھ نئے مسائل

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، زکوٰۃ ہر مال میں واجب نہیں ؛ بلکہ کچھ مخصوص اموال میں ہی واجب ہے، زمین میں سے نکلنے والی معدنیات میں سے صرف سونا اور چاندی میں ہی زکوٰۃ واجب ہے؛ البتہ تجارت کی صورت مستثنیٰ ہے، تجارت خواہ کسی بھی سامان کی کی جائے، وہ مال زکوٰۃ ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ جو موجودہ حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ بعض حضرات اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لئے نقد رقم کو ہیرے اور جواہرات کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اس تبدیلی کا مقصد گو تجارت نہیں ہوتا؛ لیکن یہ روپیوں کی بدلی ہوئی صورت ہے؛ لہٰذا کیا ایسے ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی ؛ کیوں کہ شریعت نے مخصوص اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اور یہ ان اموال میں سے نہیں ہے، جہاں تک روپیہ کی دوسری صورت میں تبدیلی کی بات ہے تو روپیہ سے زمین بھی خرید کی جاتی ہے، مکان بھی خرید کیا جاتا ہے اور دوسری اشیاء کی صورت میں بھی روپیہ کو تبدیل کیا جاتا ہے؛ لہٰذا پھر زکوٰۃ کے لئے کسی کو خاص مال کی تخصیص باقی نہیں رہ پائے گی، جو شریعت کے منشاء کے خلاف ہے؛ چنانچہ کتب فقہ میں صراحت موجود ہے کہ ہیرے جواہرات میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہے جب ان کو تجارت کی نیت سے خرید کیا گیا ہو ورنہ نہیں، (عالمگیری: ۱/۱۸۰) یہی اکثر اہل علم کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چوں کہ ان ہیرے اور جواہرات کا مقصود روپیہ کا محفوظ کرنا ہے نہ کہ خود ہیرے اور جواہرات کا حصول، اس لئے گویا وہ نقد رقم ہی ہے جو ایک تبدیل شدہ صورت میں موجود ہے؛ لہٰذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے — راقم الحروف کے خیال

میں پہلی رائے قوی ہے اور یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے ایسے ہیرے اور جواہرات جو استعمال کے لئے نہیں؛ بلکہ سرمایہ کی حفاظت کے لئے خرید کئے گئے ہوں، ان کی زکوٰۃ ادا کر دینا ہی بہتر ہے۔

مال سے مال حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک تجارت اور دوسرے اجارہ، تجارت یہ ہے کہ کسی شئے کو کھو کر اس سے نفع حاصل کیا جائے، مثلاً: اگر دس روپیہ کا قلم بارہ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں، تو قلم سے محرومی کو گوارا کر کے اس پر دو روپیہ نفع حاصل کرتے ہیں، یہ تجارت ہے، مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے مٹی اور زمین ہی کی کیوں نہ ہو؟ — اور کسی چیز پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کیا جائے، یہ ''اجارہ'' ہے، جیسے: مکان، گاڑی وغیرہ کرایہ پر لگائی جاتی ہے، مالک کی ملکیت ان اشیاء پر باقی رہتی ہے اور کرایہ کی صورت میں وہ اس پر نفع حاصل کرتا ہے، ایسی چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: ''لو اشتری قدورًا من صفر یمسکھا او یواجرھا لا تجب فیھا الزکوۃ''۔ (قاضی خاں: ۲۵۱/۱)

یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہے جو ''آلاتِ کسب'' ہیں، جیسے: سلائی مشین، پریس، کمپیوٹر، لیتھ مشین وغیرہ، کہ ان کی اصل پر زکوٰۃ واجب نہیں؛ بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں دوسرے سرمایہ کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (عالمگیری: ۱۷۲/۱)

''شیئرز'' کی اصل تو قدیم ہے؛ لیکن آج اس نے جو وسعت اختیار کر لی ہے، ماضی میں ایسا نہیں تھا، بعض شیرز تو خالص تجارتی نوعیت کے ہیں، یعنی ایسی کمپنیوں کے ہیں جو ایک تجارتی گروپ ہے، سامان خریدتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی ترسیل کرتا ہے، ایسے شیئرز میں تو زکوٰۃ واجب ہونا ظاہر ہے؛ کیوں کہ یہ مال تجارت ہے، بعض شیئرز ایسے بھی ہیں جو صنعتی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی ان کے پاس مشینیں اور آلات ہیں، جن سے چیزیں تیار کی جاتی ہیں، اُصولی طور پر ایسے شیئرز کی اصل مالیت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے؛ کیوں کہ یہ ''آلاتِ کسب'' کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ سامان تجارت کی، صرف ان سے حاصل ہونے

والے نفع پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے؛ لیکن چوں کہ آج کل کمپنی کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، شیئرز تجارتی مقصد ہی کے تحت خرید کئے جاتے ہیں، اس لئے علماء کا خیال ہے کہ ''شیئرز'' مطلقاً مال تجارت ہیں اور ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جن لوگوں نے اس نیت سے حصص خرید کئے ہوں کہ حصص کو باقی رکھتے ہوئے کمپنی سے حاصل ہونے والے نفع سے استفادہ کرتا ہے ان کو زکوٰۃ اس قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی ہوگی، جو کمپنی تسلیم کرتی ہو اور جن حضرات نے حصص اس مقصد کے لئے خرید کئے ہو کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کردیں گے، ان لوگوں کو موجودہ مارکٹ قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، مثلاً کمپنی کے نزدیک ایک حصہ کی قیمت ۲۵ روپے ہے اور مارکٹ میں 250 روپے، تو پہلی صورت میں ۲۵ روپیہ اور دوسری صورت میں ڈھائی سو روپے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ حکم شیئرز کا ہے، ''باونڈز'' کی حیثیت قرض کے دستاویز کی ہے اور اس پر جو نفع دیا جاتا ہے، وہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جتنی رقم کے باؤنڈز ہیں، اتنی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور اس پر جو نفع ملتا ہے، وہ پورا کا پورا لائق صدقہ ہے۔

''پراویڈنٹ فنڈ'' میں تین طرح کی رقم شامل ہوتی ہے، ایک وہ جو خود گورنمنٹ تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، دوسرے وہ جو اس کے برابر خود حکومت اپنی طرف سے بڑھا کر ادا کرتی ہے، تیسرے وہ جو ملازم رضا کارانہ طور پر خود اپنی تنخواہ سے زائد رقم کٹواتا ہے؛ تا کہ اس کی P.F کی رقم زیادہ سے زیادہ ہوسکے —— ان میں سے وہ رقم جو حکومت جبراً کاٹ لیتی ہے اور وہ رقم جو حکومت اپنی طرف سے اضافہ کرکے دیتی ہے، خواہ جبراً وضع کی ہوئی رقم پر ہو یا رضا کارانہ وضع کرائی ہوئی رقم پر، ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب رقم وصول ہوجائے اور اس پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یہی رائے علماء برصغیر میں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی ہے (امداد الفتاویٰ: ۲ / ۴۸، ۴۴) کیوں کہ اُجرت جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی؛ البتہ جو رقم اس نے خود ہی رضا کارانہ جمع کرائی ہے؛ چوں کہ اس پر حکومت اور کمپنی کا قبضہ خود اس کے حکم سے ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اپنے نائب اور وکیل کی وساطت سے

اس نے اس رقم پر قبضہ کر لیا ہے؛ لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

"سامان تجارت" جس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اس کی تین قیمتیں ہو سکتی ہیں، ایک وہ قیمت جس میں سامان خرید کیا گیا تھا، دوسرے وہ قیمت جس میں تاجر آج اس سامان کو خرید کر سکتا ہے، تیسرے جس قیمت میں آج وہ اس سامان کو فروخت کرے گا، مثلاً: تاجر نے ایک قلم دس روپیہ میں چھ ماہ پہلے خرید کیا تھا، اگر اس وقت خرید کرنا چاہے تو اسے بارہ روپے فی قلم کے لحاظ سے خرید کرنا پڑے گا اور پندرہ روپے فی قلم کے لحاظ سے وہ عام طور پر گاہک کو یہ قلم فروخت کرتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ وہ اپنی دوکان میں موجود قلم کے اسٹاک کی قیمت کس لحاظ سے لگا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

اس مسئلہ میں گو فقہاء کی رائیں مختلف ہیں؛ لیکن زیادہ قرین صواب امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی رائے ہے کہ جس روز زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا (مراقی الفلاح: ۳۹۱) کیوں کہ اصل میں زکوٰۃ کے طور پر خود قلم واجب ہے نہ کہ روپیہ، روپیہ قلم کے بدل کے طور پر دیا جاتا ہے؛ لہٰذا جتنی رقم میں اس تاجر کو زکوٰۃ میں واجب شدہ سامان حاصل ہو سکتا ہو اتنی رقم اس کے ذمہ واجب ہوگی، مذکورہ مثالوں کی روشنی میں اسے ۱۲ روپے فی قلم کے حساب سے قیمت لگانی چاہئے اور اسی لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔

سونے کا اصل نصاب ۲۰ مثقال اور چاندی کا دو سو درہم ہے، ہندوستان کے قدیم اوزان میں اس کا وزن کیا ہوگا؟ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں، راجح اور محقق قول یہ ہے کہ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ ہے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس پر بڑا تحقیقی رسالہ "اوزان شرعیہ" کے نام سے تالیف کیا ہے جو "جواہر الفقہ، حصہ اول" میں شریک اشاعت ہے، یہی رائے مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (فتاویٰ دار العلوم: ۱۳۵/۶) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی (فتاویٰ رضویہ: ۴۰۷/۴) کی بھی ہے، یہ ساڑھے باون تولہ موجودہ اوزان میں ۶۱۲،۳۵ گرام اور ساڑھے سات تولہ ۸۷،۴۷۹ گرام ہوتا ہے۔

(۸/جنوری ۱۹۹۹ء)

مصارف زکوٰۃ — کچھ اہم پہلو!

اسلام کے تمام احکام کی بنیاد دو باتوں پر ہے، خالق کی اطاعت و بندگی اور مخلوق سے محبت اور حسن سلوک، اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جہاں نماز خدا کی بندگی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے عبارت ہے، وہیں زکوٰۃ کا مقصد انسانیت کی حاجت روائی اور اس کی ضروریات کی تکمیل ہے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ عہد صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جہاد کیا اور فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کو گوارا نہیں کرسکتا، کہ کوئی گروہ نماز تو ادا کرنے کے لئے تیار ہو؛ لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر جائے۔

زکوٰۃ صرف محتاجوں کی اعانت ہی نہیں ہے بلکہ ایک عبادت بھی ہے، اسی لئے جیسے عبادت کی تفصیلات اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے متعین ہوتی ہیں، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی تمام تفصیلات قرآن و حدیث کی صراحتوں سے ثابت ہیں، زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط کیا ہیں؟ کن لوگوں پر واجب ہے؟ کتنی مدت گذرنے پر واجب ہے؟ اور کس مقدار میں واجب ہے؟ یہ تمام باتیں کتاب و سنت میں مذکور ہیں اور عام طور پر فقہاء ان کے بارے میں متفق ہیں، زکوٰۃ سے متعلق جن نکات کی وضاحت قرآن و حدیث میں آئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں؟ کن لوگوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور کن لوگوں کو نہیں دی جاسکتی ہے؟ مصارف زکوٰۃ کو لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (التوبہ:٦٠)

صدقات (یعنی زکوٰۃ) مفلسوں محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہئے، یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

ان مصارف کے سلسلہ میں چند باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہئیں، پہلی بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں زکوٰۃ کے لئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس میں مالک بنائے جانے کے معنی پائے جاتے ہیں، گویا زکوٰۃ میں مستحق شخص کو مالک بنانا ضروری ہے، جن میں مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو ان مدات میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، جیسے مردوں کی تجہیز وتکفین میں، قبر کے انتظام میں، کہ موت کے بعد انسان میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، آج کل بعض حلقوں سے یہ بات اُٹھائی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کی جائے اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ غرباء پر تقسیم کیا جائے، دو چار نا قابل ذکر افراد کو چھوڑ کر علماء ہند اور عالم اسلام کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صورت جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں کسی خاص شخص کو زکوٰۃ کے مال بنائے جانے کی صورت نہیں پائی جاتی؛ بلکہ زکوٰۃ کی رقم تو اپنی جگہ مصروف رہتی ہے، صرف اس کا نفع غرباء تک پہنچتا ہے، پھر سرمایہ کاری میں جتنا امکان نفع کا ہوتا ہے، اتنا ہی نقصان کا بھی اور اسی قدر خیانت کا بھی، تو اموالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری میں یہ اندیشہ ہے کہ غرباء کا اصل حق بھی مارا جائے اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ جو ادا نہیں ہو پائی وہ نقصان اپنی جگہ ہے، پھر اس صورت میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اہل ثروت غرباء کے اس حق کا بھی استحصال کریں؛ کیوں کہ مال زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کے لئے لامحالہ تجربہ کار تاجروں اور اہل ثروت کاروباریوں ہی کا سہارا لینا پڑے گا اور آج کل شب وروز جو تجربات سامنے آرہے ہیں، ان کی

روشنی میں یہ اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ جب رقم جمع کرنے والوں کی طرف سے مطالبہ کے باوجود آئے دن بدمعاملگی سامنے آتی رہتی ہے، تو وہ لاوارث رقم جس کا کوئی مالک متعین نہیں، اس کا کیا حشر ہوگا؟

یہ بات مقصد زکوٰۃ کے بھی خلاف ہے؛ کیوں زکوٰۃ کا مقصد ان ضروریات کو پورا کرنا ہے، جس سے لوگ اس وقت دوچار ہیں، اگر آپ اس رقم کو مستقبل کے لئے محفوظ کردیں تو ان کی فوری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اس لئے مالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری نہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے کافی ہے اور نہ اس سے زکوٰۃ کے مقصد و منشاء کی تکمیل ہوتی ہے؛ بلکہ اس میں مستحقین زکوٰۃ کا استحصال اور ان کی حق تلفی ہے۔

آج کل بعض گوشوں سے یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں فکس ڈپازٹ کردیا جائے اور اس کا انٹرسٹ مستحقین کو دیا جائے، یہ تو زکوٰۃ جیسی عبادت کو سود کی نجاست میں آلودہ کرنا اور خود گناہ گار ہونا اور دوسروں کو گناہ گار بنانا ہے، اولاً تو زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں محفوظ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، پھر اس رقم کو سود کے لئے ذریعہ و وسیلہ بنانا زکوٰۃ جیسی عبادت کی کھلی ہوئی اہانت ہے اور اس رقم کو فقراء میں تقسیم کرنا، لوگوں کو سود کھلانا اور سود خواری کا مرتکب بنانا ہے، ایسے ناشائستہ اور ناروا عمل کی کیوں کر گنجائش ہوسکتی ہے؟ اس لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے، کہ اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقین کے ہاتھ میں گئے بغیر فکس ڈپازٹ کرادی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

زکوٰۃ کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں؛ اس لئے ایسی چیزیں جو رفاہی مقاصد کے لئے ہیں اور تمام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں، ان میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی؛ چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں:

''وَاتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّهٗ لَا یَجُوْزُ اَنْ یُخْرِجَ الزَّکٰوةَ اِلٰی بِنَاءِ مَسْجِدٍ'' (الافصاح: ۱/۲۳۱)

اسی طرح پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستگی، ڈرینج کے پشتوں کی مرمت، پانی پینے کے لئے سبیلوں کی تعمیر وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، (المغنی مع شرح الکبیر: ۲/۵۲۷، بدائع الصنائع: ۲/۳۹)

اسی لئے ہاسپٹلوں یا لائبریریوں کی تعمیر اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، ہاں علاج کے لئے فقراء کو زکوٰۃ کی رقم سے دوا خرید کر یا نقد رقم دی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کا مقصد خالصتاً لوجہ اللہ کسی عوض اور بدل کے بغیر مستحقین کی اعانت ہے؛ لہٰذا کسی بھی ایسے کام میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی جس میں زکوٰۃ کی حیثیت عوض اور اُجرت کی ہو جائے، جیسے مساجد میں امام و مؤذن کی تنخواہ کے لئے، مدارس اور اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے، مساجد کے صباحی اور مسائی معلمین کے لئے، اگر ان کو بطور تنخواہ یا اُجرت کے زکوٰۃ کی رقم میں سے دیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے جن مدارس میں غریب طلبہ کے لئے مفت قیام وطعام کا نظم نہ ہو ان کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے۔

آج کل ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہو گیا ہے کہ خوش حال ماں باپ اپنے بچوں کی میڈیکل، انجینئرنگ تعلیم اور ڈونیشن کے لئے لاکھوں روپے زکوٰۃ کی رقم وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی مناسب نہیں ہے اور زکوٰۃ کا جو اصل مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجت اس سے پوری ہو اس کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے ایک شخص کو ایک مقدار نصاب سے زیادہ زکوٰۃ دینے سے منع کیا ہے، ایک مقدار نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کم و بیش پانچ ہزار روپے ہوتی ہے، ایک لاکھ روپے میں بیس اشخاص کی ضروریات پوری ہوسکتی تھیں؛ لیکن اب اس رقم سے صرف ایک شخص کو خوب سے خوب تر مستقبل کی تعمیر میں ہی مدد مل سکے گی، اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دینی مدارس اور ان اعلیٰ فنی تعلیمات کی نوعیت میں فرق ہے، دینی مدارس میں ایک طالب علم کی سال بھر کی تعلیم اور ضروریات پر صرف دس بارہ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، پھر جو لڑکے پڑھ کر نکلتے ہیں، وہ اُمت کے دین و ایمان کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں، گویا وہ اُمت کا سرمایہ اور اس کا مفاد ہیں اور جو طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنتا ہے، وہ اپنے مستقبل کی فکر لے کر اُٹھتا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کسب زر کی مشین بنتا ہے، دینی مدارس میں بہت بڑی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے کہ وہ اور ان کے والدین اپنے معاشی پس منظر کے اعتبار سے زکوٰۃ کے مستحق ہوتے

ہیں اور جو طلباء انجینئرنگ یا میڈیکل میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں وہ کھاتے پیتے گھرانے کے ہوتے ہیں، پھر ان عصری علوم سے چوں کہ مستقبل کی خوش حالی متعلق ہوتی ہے، اس لئے ان شعبوں میں آنے کے لئے ترغیب دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی؛ بلکہ مادیت کی چمک دمک خود ہی ہر شخص کی نگاہ کو خیرہ کئے رہتی ہے، برخلاف دینی تعلیم کے، کہ اس سے معاد متعلق ہے نہ کہ معاش، خوف آخرت کی کمی اور بڑھتی ہوئی دنیا طلبی کی وجہ سے اس کی طرف لوگوں کا میلان کم ہوتا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کر کے انھیں دینی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مصارف زکوٰۃ کے بھی اہمیت کے اعتبار سے درجات ہیں اور اس لحاظ سے دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ اپنے قرابت دار اور اعزہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں، ماں باپ دادا، دادی، نانا، نانی، اولاد اور ان کا سلسلہ اولاد، شوہروں بیویوں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، باقی دوسرے اقرباء بھائی بہن، پھوپھی، خالہ، خسر، خوشدامن، چچا، ماموں وغیرہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، ان کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا اجر ہے، زکوٰۃ بھی ادا ہوگی اور قرابت داری کا حق بھی، خاندان میں جو بیوہ، مطلقہ عورتیں، شوہر کی بے توجہی کی وجہ سے بے سہارا خواتین، یتیم لڑکے اور لڑکیاں وغیرہ ہوں، ان پر پہلے توجہ دینی چاہئے، زکوٰۃ دیتے وقت اس کا اظہار بھی ضروری نہیں کہ زکوٰۃ کی رقم ہے، ہدیہ وتحفہ، عیدی اور قرض وغیرہ کے نام سے بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، صرف اتنا اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر زکوٰۃ کے دو مقاصد ہیں، فقراء کی ضرورت پوری کرنا اور اللہ کے دین کی سربلندی؛ چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف (جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے) میں سے چھ میں حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنا ملحوظ ہے اور فی سبیل اللہ اور مؤلفۃ القلوب، ان دو مدات میں دین کی حفاظت و سربلندی اور اس کی اشاعت مقصود ہے، اس وقت دینی مدارس ان دونوں مقاصد کو پورا کرتے ہیں، ایک طرف ان مدارس میں جو طلباء زیر تعلیم ہیں، وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں اور بہت سے طلباء ایسے دیہاتوں سے آتے ہیں جہاں

ہماری رسائی نہیں ہوسکتی، دوسری طرف یہ مدارس پوری دنیا میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً اسلام کی بقاء اور اس کی حفاظت وصیانت کا سامان بنے ہوئے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو کم سے کم ہمارے ملک میں مسلمانوں کے اکثریتی تہذیب میں جذب ہو جانے سے کوئی چیز مانع نہ ہوتی، اس لئے ان مدارس کے تعاون سے زکوۃ کے دونوں مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، مسلمانوں میں اب تک ایک طبقہ نے ان دینی درسگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے؛ لیکن مسلمانوں کا مذہبی وملی تشخص جن فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتا ہے وہ ان مدارس کی اہمیت اور اس کے کردار کو محسوس کر رہے ہیں، اس لئے موجودہ حالات میں جب کہ عالمی سطح پر دینی مدارس کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا ہے اور ان کے دائرہ کار کو محدود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انھیں تقویت پہنچائیں اور ان کی شعاعوں کو اور تیز وروشن کریں۔

(۲۳ر نومبر ۲۰۰۱ء)

سرمایہ کار کمپنیوں کا تلخ تجربہ — اسباب وعوامل

گزشتہ ایک دہے میں متعدد مالیاتی تجارتی کمپنیاں ہیں، جنھوں نے سنہرے خوابوں کی بہشت سجا کر لوگوں سے ان کی گاڑھی کمائیاں وصول کیں اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بڑھانے کی غرض سے ابتداءً خوب خوب نفع دیا؛ لیکن اچانک ایسی صورتِ حال پیش آئی کہ ان کا خواب ایک ''سراب'' ثابت ہوا اور یوں محسوس ہوا کہ :

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سنا افسانہ تھا

خواہ اس کا سبب ان اداروں کی اقتصادی ناتجربہ کاری ہو یا دیانت وصداقت کی کمی؛ لیکن ان واقعات نے کتنے ہی دلوں کو رلایا اور تڑپایا ہے، ان میں بہت سے لوگ وہ تھے، جنھوں نے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی پوری زندگی کا حاصل لگا دیا تھا؛ تاکہ بڑھاپے کی بے بسی اور بے کسی میں یہ سہارا بن سکے، بہت سی بیوائیں تھیں، جنھوں نے اسے اپنے یتیم بچے اور بچیوں کی کفالت کا ذریعہ تصور کر کے ساری پونجی اس میں ڈال دی تھی، کتنے ہی ضرورت مند اور محتاج تھے کہ شب وروز محنت کر کے انھوں نے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اسے حفاظت اور نفع کی اُمید پر ان اداروں کے سپرد کیا تھا، اب اُمیدوں اور آرزؤں کے خوبصورت تاج محل زمین بوس ہیں اور بہت سی حسرتوں کا مدفن بنے ہوئے ہیں۔

یہ تو ان واقعات کا اقتصادی اور سماجی پہلو ہے؛ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں غیر سودی اور حلال بنیاد پر سرمایہ کاری سے لوگوں کا اعتماد اُٹھتا جا رہا ہے اور ان سرکاری اور نجی اداروں پر لوگوں کا اعتماد واعتبار بڑھ رہا ہے جو سود پر یقین رکھتے ہیں اور علانیہ سود کا لین دین کرتے ہیں، یہودی نظامِ معیشت اور اس کے زیر اثر مغرب کا معاشی نظام تو کہتا ہی ہے کہ غیر سودی سرمایہ کاری ناقابل عمل اور غیر محفوظ

صورت ہے، ساتھ ہی ساتھ خود مسلمانوں کے ہاتھ قائم ہونے والے یہ ادارے بھی بالواسطہ ان کے دعویٰ کو تقویت پہنچاتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے جو معاشی نقصان پہنچتا ہے اس کا اثر تو ممکن ہے کہ چند سالوں میں ختم ہو جائے؛ اس لئے کہ زخم کتنا بھی گہرا ہو ایک نہ ایک دن مندمل ہو کر رہتا ہے اور دل پر کیسی بھی چوٹ لگے آج نہ کل آنسو تھم ہی جاتے ہیں؛ لیکن اسلام کے غیر سودی سرمایہ کاری کے تصور پر ان واقعات کی وجہ سے جو چوٹ لگتی ہے اور اسلامی نظام معیشت سے سماج کا یقین جس طرح مجروح ہوتا ہے، شاید پچاس سال میں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو؛ اس لئے ایسے تکلیف دہ واقعات گہرے غور وفکر کے متقاضی ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں جو برائیاں بہت ہی سنگین ہیں، ان میں سے ایک سود بھی ہے، سود کی شناعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے والے پر لعنت فرمائی بلکہ سود دینے والوں، سودی معاملات کے لکھنے والوں اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والوں پر بھی آپ ﷺ نے لعنت کی ہے (مسلم، عن جابر بن عبداللہؓ) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہیں فرمائیں گے اور ان کو جنت کی نعمتوں کا مزہ تک چکھنے سے محروم رکھیں گے: ایک شراب کا خوگر، دوسرے سود خوار، تیسرے ناحق یتیم کا مال کھانے والا اور چوتھے والدین کا نافرمان (حاکم عن ابی ہریرہؓ) —— لیکن ظاہر ہے کہ کسی برائی سے روکنا اس وقت تک مفید اور مؤثر نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لئے جائز اور حلال متبادل پیش نہ کیا جائے، اسلام نے سودی لین دین کا راستہ بند کرنے کے لئے بنیادی طور پر دو طریقے اختیار کئے، ایک تو قرض کے لین دین کو آسان فرمایا، لوگوں کو اس کی ترغیب دی؛ تاکہ لوگ سود دینے پر مجبور نہ ہوں، جب معاشرہ میں سود دینے والے لوگ نہ رہیں گے، تو اس سے سود خواروں کی حوصلہ شکنی ہوگی اور سودی کاروبار پروان نہیں چڑھ سکے گا، دوسری طرف ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے کاروبار کو جائز قرار دیا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی، شرکت سے ایسا کاروبار مراد ہے جس میں مختلف لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، محنت چاہے تمام سرمایہ کاروں کی ہو یا بعض کی ہو؛ لیکن نفع میں حسب

معاہدہ سب شریک ہوں، مضاربت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا مال ہو اور کچھ لوگوں کی محنت اور نفع ونقصان میں دونوں شریک ہوں، کاروبار کی یہ دونوں صورتیں جائز نفع کا راستہ کھولتی ہیں اور سودی نظام کو بند کرنے میں معاون ہیں۔

اصل یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہے؛ لیکن سرمایہ کو کس طرح نفع آور بنایا جائے؟ یا تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، یا واقف ہونے کے باوجود کام کرنے کی قوت نہیں رکھتے یا وقت نہیں پاتے اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا سرمایہ لگا رہے اور بیٹھے بیٹھائے ان کا نفع آتا رہے، یہی خواہش سودی کاروبار کرنے والوں کے لئے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے، اسلام نے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے ذریعہ اپنے سرمایہ سے نفع اُٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، شرکت ہی کی طرح مضاربت میں بھی نفع کا تناسب متعین ہونا چاہئے، نہ کہ قطعی مقدار، اگر قطعی مقدار متعین ہو جیسے دس ہزار پر پانچ سو روپیہ، تو یہ سود میں شامل ہے اور حرام ہے؛ البتہ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ کار اور عامل کے نفع کی شرح میں یکسانیت ہو، اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، مثلاً ساٹھ فیصد اور چالیس، فیصد یا پچھتر فیصد اور پچیس فیصد کی شرح سے نفع متعین ہو، یہ درست ہے۔

بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی یہ دو صورتیں ہیں، جو زیادہ نفع آور بھی ہیں؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس میں نقصان کا خطرہ بھی زیادہ ہے؛ کیوں کہ ایک تو کاروبار میں نشیب و فراز ہوتا ہی ہے، دوسرے آج کل دیانت و امانت کی بھی کمی ہے، اور شرکت و مضاربت کا زیادہ تر انحصار دیانت اور ایمانداری پر ہے، اس لئے اسلامی خطوط پر سرمایہ کاری کے لئے جو ادارے قائم ہوں، ان کے لئے ان طریقوں کا اختیار کرنا دشواری کا باعث ہوتا ہے — سرمایہ کاری کی دو اور صورتیں نسبتاً زیادہ محفوظ بھی ہیں اور آسان بھی، ان میں ایک صورت ''مرابحہ'' کی ہے، اور دوسری ''اجارہ'' کی، مرابحہ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کیا جائے اور خریدار پر یہ بات واضح بھی کردی جائے کہ اس نے کتنی قیمت میں خرید کیا ہے اور اس پر کتنا نفع حاصل کر رہا ہے؟ مثلاً ایک شخص کو پچاس لاکھ روپے کی مشینریز خرید کرنی ہے، کمپنی

اس کو پیسہ دینے کے بجائے مشینیں خرید کرے اور اپنے قبضہ میں لے کر اسے ساٹھ لاکھ میں فروخت کرے اور اس کو مہلت دے دے کہ وہ دس ماہ کے بعد اس کی قیمت ادا کردے، یا مثلاً چھ لاکھ روپے ماہانہ کی قسط ادا کرنے کی سہولت دے دے، یہ صورت شرعاً جائز ہے اور اس میں سرمایہ کو نسبتاً کم خطرہ ہوتا ہے، نقد کے مقابلہ ادھار قیمت زیادہ ہو، یہ جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے ایک مشت کے بجائے اقساط پر قیمت وصول کی جائے؛ البتہ اس میں دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی قیمت متعین ہو، یہ بات درست نہیں، کہ اگر دس ماہ کے بجائے اس نے گیارہ ماہ میں قیمت ادا کی تو قیمت ساٹھ لاکھ کے بجائے پینسٹھ لاکھ وصول کی جائے، دوسرے اس صورت میں یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ کمپنی اس چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر فروخت کرے؛ کیوں کہ جب تک کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ لے لی جائے اس وقت تک نہ اس کو بیچنا جائز ہے اور نہ ہی اس کا نفع حلال ہے؛ البتہ قبضہ کی کوئی ایک صورت متعین نہیں، ہر عہد کے رواج اور ہر چیز کی حیثیت کے لحاظ سے اس کا قبضہ ہوگا۔

''اجارہ'' سے مراد کسی چیز کو کرایہ پر دینا ہے، یعنی اجارہ لیزنگ (Leassing) کا نام ہے، اجارہ میں اصل سامان محفوظ رہتا ہے اور اس کے استعمال کی اُجرت حاصل کی جاتی ہے، جیسے گاڑیاں خرید کی جائیں اور ان کو کرایہ پر لگایا جائے، کسی فیکٹری کو مشینیں مطلوب ہوں، مشین خرید کر ان کو کرایہ پر دی جائے، یہ صورت بھی نسبتاً محفوظ کہی جا سکتی ہے، اجارہ میں مدت اور اُجرت کی تعیین ضروری ہے، جو انویسٹ منٹ کمپنیاں اسلامی بنیادوں پر قائم ہیں ان کو چاہئے کہ جمع سرمایہ کا کچھ حصہ شرکت و مضاربت میں لگائیں اور کچھ حصہ مرابحہ اور اجارہ میں استعمال کریں، اس طرح پورے سرمایہ کے ڈوب جانے کا خطرہ نہیں ہوگا اور ان کے پاس ٹھوس سرمایہ کی صورت میں بھی بہت سارا سرمایہ رہے گا، جس سے سرمایہ کاروں کا اعتماد قائم رکھنے میں بھی مدد ملے گی اور کمپنی مکمل طور پر دیوالیہ بھی نہیں ہوگی۔

اس وقت پورے ہندوستان اور خاص کر شہر حیدرآباد میں تجارتی کمپنیوں کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے، جن میں بعض تو سرمایہ کاروں سے اسّی فیصد نفع تک کا بھی وعدہ کررہے

ہیں، بہ ظاہر یہ سبز باغ دکھانے سے زیادہ کچھ نہیں، ان چھوٹی چھوٹی نومولود کمپنیوں میں زیادہ تر سرمایہ متوسط الحال مسلمانوں کا ہے، افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ریزرو بینک آف انڈیا اور گورنمنٹ ان کمپنیوں کے معاملہ میں خاموش تماشائی بنی رہتی ہے، گورنمنٹ کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ میں ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے، سرکاری افسران اور سیاسی قائدین ان کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور کمپنی کے مالکان کو قوم کا مسیحا قرار دیتے ہیں، جب عوام کا پیسہ ڈوبتا ہے اور پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تو گورنمنٹ حرکت میں آتی ہے اور پولیس تفتیش شروع کرتی ہے، یہ محض اشک شوئی اور سانپ کے گذر جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا ہے، ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمان ملک گیر سطح پر یا کم سے کم شہر حیدرآباد کی سطح پر سرمایہ کاروں کے لئے ایک مشاورتی بورڈ قائم کریں جس میں کچھ علماء وارباب افتاء، چند معاشی منصوبہ بندی کے ماہرین اور دو ایک اکاؤنٹنٹ اور قانون داں شامل ہوں، سرمایہ کاروں کو ترغیب دی جائے کہ یہ بورڈ جب تک کسی کمپنی کی تصدیق نہ کر دے وہاں سرمایہ کاری سے اجتناب کیا جائے، یہ بورڈ شرعی، اقتصادی، قانونی اور حساب و کتاب کی شفافیت کے پہلو سے ہر چھ ماہ پر کمپنی کا مکمل غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی تصدیق کرے اور اپنے جائزہ کا اعلان کرے، اس طرح ایک طرف ایسی مالیاتی کمپنیوں کو مفید اقتصادی مشورے مل سکیں گے، ان کا کاروبار شریعت کے دائرہ میں ہوگا، ان کے کاروبار کی عوامی نگرانی ہو سکے گی اور دوسری طرف سرمایہ کاروں کی گاڑھی کمائی محفوظ اور نفع آور ہوگی، کسی عملی تدبیر کے بجائے محض ایسے واقعات پر وقتی بیانات دے دینا اور سرمایہ کاروں سے لفظی ہمدردی کا اظہار کر دینا مسئلہ کا مؤثر اور مستقل حل نہیں، کاش ہمارے قائدین، علماء اور اہل دانش اس جانب کوئی توجہ کریں۔

(۱۲/ مارچ ۱۹۹۹ء)

✿ ✿ ✿

اسلام میں سرمایہ کاری کے اُصول

اور

موجودہ حالات کا تقاضا!

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں نعمتوں اور صلاحیتوں کی ایسی تقسیم فرمائی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں نامکمل اور دوسرے کا محتاج ہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے، کسی کے پاس دولت ہے؛ لیکن وہ جسمانی قُویٰ سے محروم ہے، کوئی شخص صحت مند اور محنت کرنے کے لائق بھی ہے؛ لیکن علم و آگہی سے تہی دامن ہے، جیسے اندھا اور لنگڑا ایک دوسرے کی مدد کر کے اپنا سفر طے کر سکتے ہیں، اسی طرح یہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی مطلوبہ منزل کو پا سکتے ہیں۔

معاشی نظام میں بھی یہی طریقۂ کار کسی قوم اور سماج کی ترقی کا راز ہے، کچھ لوگوں کے پاس سرمایہ ہے؛ لیکن خود کاروبار اور تجارت کی قوت یا اس کا تجربہ نہیں، کچھ لوگ کاروبار کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں، اگر سرمایہ کاروں کا منجمد سرمایہ اور اس دوسرے گروہ کی محنت کا اشتراک ہو، تو اس سے دونوں طبقوں کو نفع ہوگا اور بحیثیت مجموعی قوم اور ملک کو بھی اس کا نفع پہنچے گا، اسی لئے اسلام نے ایسے اشتراک کی نہ صرف گنجائش رکھی ہے؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

اسلام نے بنیادی طور پر اس کے لئے دو طریقے رکھے ہیں: شرکت اور مضاربت، شرکت کے معنی ساجھے دار ہونے کے ہیں، یعنی ایسا کاروبار جس کو متعدد لوگ مل کر کریں، جو شخص کسی چیز میں کچھ حصہ کا مالک ہو، عربی زبان میں وہ ''شریک'' کہلاتا ہے، فقہ کی اصطلاح

میں شرکت ایسے کاروبار کو کہتے ہیں، جس میں ایک سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ شریک ہو اور نفع میں بھی وہ سب شریک ہوں: ''عقد بین المتشارکین فی راس المال والربح''
قرآن مجید میں گو احکامِ شرکت کی تفصیل تو مذکور نہیں؛ لیکن اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کے ذیل میں چند ورثاء کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ سب ایک تہائی میں شریک ہیں: ''فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ'' (النساء:۱۲) حدیث میں نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ شرکت کا تذکرہ ہے، جائز اور حلال طریقہ مقرر فرمایا ہے، جس میں سرمایہ کار نفع کے ساتھ نقصان کا خطرہ بھی قبول کرتا ہے اور اسی کو قبول کرنے کی وجہ سے اس پر حاصل ہونے والا نفع اس کے لئے جائز اور حلال ہے۔

اگر ایمانداری کے ساتھ شریعت کے اُصولوں کو برتتے ہوئے شرکت اور مضاربت کے کاروبار کئے جائیں تو اس سے زیادہ نفع حاصل ہو سکتا ہے؛ لیکن خیانت اور بددیانتی آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کو نقصان سے دوچار کرتی ہیں، کاروبار کی کامیابی میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک دیانت و امانت، دوسرے تجربہ اور کاروبار سے واقفیت، اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں حضرت سائب بن سائبؓ آپ ﷺ کے کاروباری شریک تھے، جب مکہ فتح ہوا تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے ان کا استقبال کیا اور فرمایا: میرے بھائی اور میرے شریک! تمہارا آنا مبارک، جو ایسے شریک تھے کہ نہ جھگڑتے تھے اور نہ ہیرا پھیری کرتے تھے: ''مرحبا باخي وشريكي كان لايداري ولايماري'' (فتح القدیر: ۵/۳۷۷) گویا جو لوگ شریف اور سلیم الطبع تھے، وہ زمانۂ کفر میں بھی امانت و دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

اسلام میں امانت و دیانت کی جو اہمیت و تاکید ہے، وہ ظاہر ہے، خاص کر شرکت کے معاملہ میں آپ ﷺ نے اس کی خصوصی تاکید فرمائی، حضرت ابوہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب دو آدمی شرکت کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں، تو جب تک ان میں سے کوئی اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان

میں کا تیسرا ہوتا ہوں اور جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے میں ان کے بیچ سے نکل جاتا ہوں: ’’انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما صاحبه ، فاذا خانه خرجت من بینھما‘‘۔(ابوداؤد:۲/۱۲۴)

بدقسمتی سے آج کل جو لوگ سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی دن سے ان کے گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں اور ایسی شاہ خرچی شروع ہوتی ہے کہ گذشتہ زمانہ کے فضول خرچ نواب اور جاگیردار بھی شرم سار ہو جائیں، عمدہ سے عمدہ مکان، اچھی سے اچھی گاڑیاں، شاہی دعوتیں اور ہر سماجی محفل میں پیسے دے کر مہمان خصوصی بننے کا شوق اور ان سب سے سوا اخبارات میں آنے کی خواہش اور ہر روز اپنی تصویر کی نمائش اور کتنی ہی ایسی خواہشیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے! اور یہ سب کچھ غریب اور متوسط الحال محنت کش عوام، بیواؤں اور یتیموں کے پیسوں کے بل پر ـــــ یہ کتنی شرمناک اور افسوس ناک بات ہے، اس سے جہاں سرمایہ کاروں کو نقصان پہنچتا ہے، وہیں خود وہ بھی نقصان سے دوچار ہوتا ہے، اگر دیانت اور ایمانداری سے کاروبار کو چلایا جائے تو لوگوں کا اعتماد قائم رہے گا اور یہ کاروبار مدتوں جاری رہے گا اور سرمایہ کاروں سے زیادہ نفع خود اس شخص کو حاصل ہوگا، خیانت اور بددیانتی سے اللہ تعالیٰ کی مدد اُٹھ جاتی ہے، جن لوگوں نے سرمایہ لگایا ہے ان کا بھی نقصان ہوتا ہے اور جن کے پاس سرمایہ مشغول کیا گیا ہے وہ دنیا میں ذلیل وخوار بھی ہوتے ہیں، مستقل نفع سے محروم بھی اور اس اجتماعی ظلم پر اللہ کے یہاں جو پکڑ ہے وہ اس کے سوا ہے۔

کسی بھی کاروبار کے کامیاب ہونے کے لئے تجربہ اور واقفیت ضروری ہے، آدمی خواہ کتنا بھی مخلص ہو، دیانت دار اور سچا بھی ہو؛ لیکن وہ ایسے کاروبار میں ہاتھ رکھے جس سے خود کماحقہ واقف نہ ہو، تو زیادہ امکان نقصان ہی کا ہے، کسی بھی تجارت کے لئے تین چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، اول یہ کہ سامان کہاں سے خرید کیا جائے کہ اس کو کم سے کم قیمت میں حاصل کر سکے، دوسرے یہ سامان کہاں بہتر طور پر فروخت ہو سکے گا؟ کہاں اس کی مانگ زیادہ ہے؟ تیسرے جو لوگ اس مال کے خواہاں ہیں وہ کس طرح کا مال پسند کرتے ہیں؟ ان تینوں

اُمور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کوشش بھی کرنی ہے کہ اس کے لانے اور فروخت کرنے میں کم سے کم اخراجات آئیں، یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پورا سرمایہ ایک ہی یونٹ میں نہ لگایا جائے، اگر مختلف نوعیت کے کاروبار میں سرمایہ معروف کیا جائے تو اگر ایک یونٹ میں نقصان بھی ہو تو دوسری یونٹوں کے نفع سے اس کی بھرپائی ہوسکتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضی قریب میں جو کمپنیاں قائم ہوئیں، انھوں نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا، کسی نے پوری رقم چمڑے میں مصروف کردی، کسی نے بلڈنگوں کی تعمیر میں، کسی نے اسکراپ کی خرید وفروحت میں، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کاروبار میں انحطاط ہوا تو پورا کاروبار ہی بیٹھ گیا، جو لوگ سرمایہ کاروں کو شرکت کی دعوت دیں ان کو چاہئے کہ وہ پہلے سرمایہ کاری کے فائدہ بخش مواقع کو ماہرین کی مدد سے خوب اچھی طرح سمجھ لیں، پھر قدم اُٹھائیں۔

جو لوگ اپنا سرمایہ مشغول کریں، ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ سنہرے خواب دکھانے والوں کی طرف آنکھ بند کرکے نہ دوڑیں؛ بلکہ پہلے خوب اچھی طرح تفتیش کریں کہ کمپنی سرمایہ کہیں مشغول بھی کررہی ہے یا نہیں؟ اگر مشغول کررہی ہے تو کیا اس کاروبار سے وہ نفع حاصل ہوسکتا ہے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین سے دریافت کریں، پھر خوب سوچ سمجھ کر سرمایہ لگائیں، یہ کہنا کہ آٹھ دس ہزار روپے لگائیں اور کل ہی سے اس پر نفع حاصل کریں؛ بلکہ پہلے مہینہ کا نفع رقم دیتے ہوئے ہی وضع کرلیں، ناقابل فہم باتیں ہیں، دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جو شروع ہونے سے پہلے ہی یا شروع ہوتے ہی نفع دینے لگے —— اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نفع ونقصان کو ظاہری اسباب سے متعلق رکھا ہے، ان اسباب کو نظر انداز کرکے کام کرنا توکل نہیں، بے وقوفی اور بے عملی ہے اور اس کی وجہ سے نقصان اُٹھانا اور حسرت وافسوس سے دوچار ہونا نوشتۂ دیوار!!

(۱۹/مارچ ۱۹۹۹ء)

آزاد مارکٹ — اسلامی نقطۂ نظر

یکم اپریل ۲۰۰۱ء ہندوستان کی معاشی اور تجارتی تاریخ میں ایک انقلابی اور یادگار تاریخ ہے، ۱۹۹۱ء میں ہندوستان نے مغربی نقطۂ نظر کے مطابق معاشی اصلاحات کا آغاز کیا تھا، ان اصلاحات کے تحت مختلف مرحلوں میں بیرون درآمدات پر مقداری پابندیوں کو برخواست کیا گیا ہے، ۱۹۹۶ء میں ۱۶۱۶ اشیاء، ۱۹۹۷ء میں ۱۴۸۸ اشیاء، ۱۹۹۸ء میں ۱۳۹۱ اشیاء، ۱۹۹۹ء میں ۸۹۴ اشیاء اور اب باقی ۷۱۴ اشیاء پر مقداری تحدید ختم کردی گئی ہے اور اس طرح ہندوستان کی مارکٹ عملی طور پر آزاد مارکٹ میں تبدیل ہو چکی ہے — اس فیصلہ نے عوام کے بہت بڑے حصہ کو مسرور وشاد کام کیا ہے اور لوگ اُمید کر رہے ہیں کہ آئندہ چند مہینوں میں اشیاء کی قیمتوں میں نمایاں کمی ہوگی اور انھیں سستے دام، معیاری چیزیں مل سکیں گی، دوسری طرف ملک کے صنعت کار اور ان سے بڑھ کر کاشت کار اس صورتِ حال سے بہت پریشان اور خوف زدہ ہیں، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب ہیں کہ ملک کی تجارت پر بیرونی تاجروں اور صنعت کاروں کا قبضہ ہو جائے گا، ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہو جائیں گی اور ہندوستانی معیشت کا سب سے اہم شعبہ زراعت پر بھی غیر معمولی اثر پڑے گا؛ کیوں کہ بیرونی ممالک اپنی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی وجہ سے اتنی ارزاں قیمت میں اناج فراہم کر دیں گے کہ ہندوستانی کسانوں کو ان کا مقابلہ دشوار ہو جائے گا اور جب کسانوں کو اپنی محنت کی صحیح اجرت حاصل نہ ہو سکے گی، تو وہ کاشتکاری کیوں کریں گے؟ اور محنت ومشقت برداشت کر کے ہمارے لئے کیوں اناج پیدا کریں گے؟

ملک کے بہت سے بہی خواہ اور عاقبت اندیش لوگوں کو بھی حکومت کے اس فیصلہ پر تشویش ہے؛ کیوں کہ یہ معاشی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی غلامی قبول کرنے کے مترادف ہے، اس سے اندرونِ ملک بے روزگاری میں اضافہ ہوگا اور یہ بے روزگاری اور محرومی عدمِ استحکام کو

جنم دے گی، جب ایک ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' پورے ملک کو اپنا غلام بنا سکتی ہے، تو اتنی ساری کمپنیاں کیا کچھ نہیں کر سکتی ہیں؟ — حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اہم ہیں، تجارت میں مسابقت ضروری ہے، اس سے قیمتوں میں توازن قائم رہتا ہے اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے اور ایسی تدبیر بھی ضروری ہے کہ ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے ان کا ذریعۂ معاش بوجھ نہ بن جائے، ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تجارت کا نظام طلب و رسد کے اُصول پر قائم ہے، اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے؛ لیکن اس کی تیاری اور فراہمی طلب کے مطابق نہ ہو پائے، تو قیمتیں چڑھیں گی اور اگر وہ طلب کے برابر ہو تو قیمت میں توازن رہے گا اور طلب کے مقابلہ اشیاء کی فراہمی اور تیاری زیادہ ہو تو قیمتیں گر جائیں گی، تاجروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی فطرت پر قائم رہنے نہیں دیتے؛ بلکہ بازار میں مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں؛ تاکہ قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھ جائیں، تجار نے ہمیشہ اس حربہ کو اختیار کیا ہے اور غریب عوام کی زندگی کو اپنے نفع کے لئے بوجھل بنا کر رکھا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں ایسے طریقے مروج تھے، مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی تجارتی قافلہ باہر سے آتا تو شہر کے سرمایہ کار تاجر باہر نکل کر ان کے مال سستے داموں خرید لیتے اور انھیں باور کراتے کہ کھلے بازار میں یہ سامان اسی قیمت میں فروخت ہو رہا ہے، اس سے دو نقصان ہوتے، ایک تو جو لوگ زراعت کے ذریعہ پیداوار حاصل کرتے، یا محنت کر کے مال تیار کرتے، انھیں بازار کے عام نرخ کے مقابلہ کم قیمت ملتی اور اپنی محنت کا کما حقہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، دوسری طرف کھلے بازار میں مال آنے سے پہلے اس کے خرید لینے کی وجہ سے مارکٹ میں اس سامان کی مصنوعی قلت پیدا ہو جاتی اور جب لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اشیاء کم پڑتیں، تو قیمتیں بڑھ جاتیں اور عوام نقصان اُٹھاتے، گویا چند سرمایہ دار تاجروں کی وجہ سے پیدائش کار اور عوام دونوں کو نقصان ہوتا، اس طریقہ کو ''تلقی رکبان'' کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

اسی طرح ایک طریقہ یہ تھا کہ دیہات کے لوگ جب اپنی پیداوار شہر میں لے کر آتے، تو دیہات کی قیمتوں کے معیار نیز شہر کے حالات سے ناآگہی کی وجہ سے کم قیمت میں اپنا مال

فروخت کر دیتے، شہر کے جو چالاک تاجر ہوتے، وہ اسے ترغیب دیتے کہ اپنا مال ان کے حوالے کر دیں، وہ اس کو ان کے لئے گراں قیمت میں فروخت کر دیں گے، اس طرح دیہات سے سامان آنے کی وجہ سے شہر میں جو ارزانی ہو سکتی تھی وہ پیدا نہیں ہو پاتی، اس کو ''بیع حاضر للبادی'' کہتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کو بھی منع فرمایا۔

سامان کے نرخ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا ایک پرانا طریقہ ذخیرہ اندوزی کا رہا ہے، یعنی اشیاء ضروریہ کو روک کر رکھنا تا کہ بازار میں اس کی قلت پیدا ہو جائے اور اس طرح ان چیزوں کا نرخ اونچا ہو جائے، یہ طریقہ آج بھی مروج ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھی فرمائی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو احتکار کا مرتکب پایا، تو اسے منع کیا اور کہا کہ حضور ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں جذام کا خیال ظاہر فرمایا ہے، راوی کا بیان ہے کہ واقعی وہ شخص جذام میں مبتلا ہوا، (ابن ماجہ : باب الحکرۃ والجلب، مسند احمد:۲۱/۱) احتکار کی ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ اس سے قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھتی ہیں اور عام لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ''نجش'' سے منع فرمایا، نجش سے مراد یہ ہے کہ کسی سامان کی ڈاک لگائی جائے اور ایک شخص کا سامان لینے کا ارادہ نہ ہو؛ لیکن وہ محض قیمت چڑھانے کے لئے بڑھ کر بولی لگائے؛ تا کہ دوسرے خواہش مند حضرات خواہ مخواہ قیمت بڑھا دیں اور اس طرح مناسب قیمت سے زیادہ میں مال فروخت ہو، رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اشیاء کی قیمتوں کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے، نہ مصنوعی طور پر قیمت بڑھائی جائے اور نہ قیمت گرائی جائے؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اشیاء کی قیمتیں متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے کہا: اسے چھوڑ دو، پھر ایک دوسرے صاحب نے یہی بات کہی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی قیمت کو اُٹھاتے اور گراتے ہیں، میں اس حال میں اللہ سے ملنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر کسی کا دعویٔ ظلم نہ رہے، (ابو داؤد، حدیث نمبر: ۳۴۵۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: قیمتیں بہت بڑھ گئی

ہیں، آپ ﷺ ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیمت مقرر کرنے والا اللہ ہے، وہی تنگی اور کشادگی پیدا کرتا ہے اور وہی رزاق ہے۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۴۵۱)

غرض منشاء نبوی یہ ہے کہ مارکٹ کو فطری حالت پر رہنا چاہئے، کبھی طلب کے اعتبار سے رسد بڑھ گئی اور عوام کو فائدہ ہوگیا اور کبھی رسد کے اعتبار سے طلب زیادہ رہی اور تاجروں کو معمول سے زیادہ فائدہ ہوگیا؛ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ ہی بعض کو بعض سے رزق فراہم کرتا ہے: ''دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض '' (مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۲۲) —— تاہم اگر گراں فروشی حد برداشت سے بڑھ جائے اور تجار اخلاق کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں، تو حکومت کو حق ہے کہ وہ قانون کی لاٹھی استعمال کرکے اس مسئلہ کو حل کرے، اسی لئے فقہاء نے اجازت دی ہے کہ خصوصی حالات میں ذخیرہ اندوزی کے سدِ باب کے لئے ذخیرہ اندوزوں کا مال زبردستی نکالا جاسکتا ہے اور اشیاء ضروریہ کا نرخ متعین کرکے تجار کو پابند کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسی قیمت پر سامان کو فروخت کریں۔

یہ اُسوۂ نبوی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا اصل مزاج یہی ہے کہ تمام لوگوں کو اپنا مال مارکٹ میں لانے کی آزادی حاصل رہے اور وہ بے روک ٹوک خرید و فروخت کرسکیں تاکہ مسابقت برقرار رہے، اس سے لوگوں کو سستی اور معیاری اشیاء حاصل ہوسکیں گی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی طبقہ کو ضرر سے بچانا اور ان کے ساتھ ناانصافی کا سد باب کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل کا عمومی حکم دیا ہے: ''إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَان '' (النحل: ۹۰) ملکی صنعتوں کی تباہی اور کاشتکاروں کی مایوسی میں نہ صرف ان لوگوں کا نقصان ہے؛ بلکہ مجموعی اعتبار سے اس کی مضرت کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے؛ کیوں کہ جب بے روزگاری بڑھے گی، تو لوگوں کی بنیادی ضروریات کا پورا ہونا بھی مشکل ہو جائے گا، ملک میں لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا رجحان بڑھے گا اور جب بیرونی کمپنیاں تجارت کے کسی شعبہ پر حاوی ہوجائیں گی اور اندرونِ ملک صنعتوں پر غلبہ حاصل کرلیں گی تو پھر ان کا استحصال سے باز رہنا دشوار ہوگا اور اندیشہ ہے کہ وہ اپنی منمانی قیمت لگا کر لوگوں کو اسی قیمت میں خرید وفروخت کرنے پر مجبور کر

کے رکھ دیں گی، پھر تو یہ ارزانی بھی بے ثبات ثابت ہوگی اور گرانی پر کنٹرول مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی کمپنی کو ملک کے بازار میں بلاتحدید داخل ہونے کی اجازت دی جائے، تو اس سے ایسے معاہدے کئے جائیں کہ بتدریج وہ اپنی ٹکنالوجی بھی فراہم کرے اور ملک میں اپنی صنعتیں قائم کرے، ان صنعتوں میں مقامی ہنرمندوں اور مزدوروں کو کام کے مواقع دئے جائیں، اس طرح بے روزگاری کا یہ سیلاب تھم سکے گا اور عام لوگوں کے لئے اس کے فوائد دیرپا ہوں گے، قدیم زمانہ میں صنعت وحرفت میں، وسائل اور ٹکنالوجی کا اتنا فرق نہیں ہوتا تھا، کہ قیمتوں پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑے؛ البتہ مزدور اور نقل وحمل کی اُجرت کے فرق کی وجہ سے اشیاء کی پیداوار مہنگی یا سستی ہوا کرتی تھی، اس تفاوت کو دور کرنے، قیمتوں میں توازن رکھنے اور ملکی پیداوار کو بچانے کی غرض سے ایک طریقہ تجارتی ٹیکس کا مروج تھا؛ چنانچہ فقہاء نے غیر ملکی تاجروں سے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے بدلے انھیں تجارت کے مواقع بھی دیئے جاتے تھے اور ان کی حفاظت ونگہداشت کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی تھی، اب ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ اور پسماندہ ہونے کا بھی قیمت پر نمایاں اثر پڑتا ہے اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، مارکٹ کو ملکی اور بیرونی تاجروں کے لئے کھولنا تاکہ گرانی کم ہو اور سرمایہ داروں کو عوام کا استحصال کرنے کا موقع نہ ملے اور ایسے قوانین وتحدیدات بھی ضروری ہیں، جن کے ذریعہ جدید ٹکنالوجی سے محروم ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے مفادات کا بھی تحفظ ہو اور ان کے حقوق بھی پامال نہ ہونے پائیں، کہ یہی تقاضۂ عدل ہے اور اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات کا لب لباب یہی ہے کہ انسانوں کی یہ بستی عدل پر قائم رہے، کہ یہی تقویٰ سے قریب ترین راہ ہے: ''اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى''۔ (المائدۃ:۸)

(۱۳؍اپریل ۲۰۰۱ء)

خدا سے پانی مانگئے!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ بے شمار ہیں، ان میں کچھ نعمتیں روحانی ہیں اور کچھ مادی ہیں، یہ مادی نعمتیں انسانوں کی اس بستی میں جینے اور رہنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان ضرورتوں میں سب سے اہم ہوا اور ہوا کے بعد پانی ہے، ہوا اور پانی اس فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں کہ ہمیں کبھی ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہیں گذرتا، غور کیجئے کہ ایک لیٹر صاف و شفاف پانی ہم بازار سے دس تا بارہ روپے میں خرید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بے حساب مقدار کھیت اور باغات کی آبیاری، انسان کی سیرابی اور انسان سے متعلق چیزوں کی صفائی اور دھلائی کے لئے پیدا فرمائی ہے، اگر اس پانی کی قیمت بارہ کے بجائے پانچ یا دو ہی روپے لیٹر کے حساب سے انسان سے وصول کی جاتی تو یہ انسان کے لئے کس قدر گراں بار ہو جاتا؟ اگر آکسیجن کا ایک سلنڈر حاصل کیا جائے تو سینکڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انسان کو سانس لینے کے لئے ہر وقت آکسیجن مطلوب ہے، اگر اسے اس آکسیجن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تو کتنا دشوار ہوتا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہے، کہ کائنات کے اس چھوٹے سے محلہ میں جسے زمینی دنیا کہا جاتا ہے، پانی اور ہوا کی نہایت ہی وافر مقدار موجود ہے، جب کہ فضاء میں اس سے بڑے بڑے سیارے موجود ہیں؛ لیکن وہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ دستیاب ہے اور نہ ہوا کا کوئی جھونکا، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت انسان کی ضیافت و مہمان نوازی اور راحت رسانی کا کس خوبی سے انتظام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ان میں ایک پانی بھی ہے؛ بلکہ فرمایا گیا کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے: "وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ" (الانبیاء: ۳۰) انسان کی زندگی کا مدار تو پانی پر ہی ہے، جتنے بھی ذی روح جانور ہیں، ان

کی زندگی کا بقاء بھی پانی ہی پر منحصر ہے؛ چوں کہ مادۂ تخلیق میں بھی پانی کا ایک جزء موجود ہوتا ہے، اسی لئے قرآن نے انسانی نطفہ کو بھی "ماء دافق" یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے تعبیر کیا ہے، (الطارق:٦) اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جاندار کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے: "وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ" (النور:۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے، کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں: "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ" (لقمان:۱۰) جو جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا نمو پذیر زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے: "وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا"۔ (النحل:٦۵)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کر لیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہو جاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں گندھک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو گلاتی ہے اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے اور ہوائیں اسے گود لے کر اڑن کھٹولا بن فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں اور ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں، کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضاء کی سیر کرتا رہتا ہے اور جہاں چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا نظامِ قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چھوں کہ اپنے بقاء

کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سرسبز وشاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، کہ ان کا بقاء پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بادل کی نگاہ التفات بھی بڑھ جاتی ہے، غالباً اللہ تعالیٰ کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں؛ چوں کہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں، وہیں پالتو اور جنگلی، چلنے والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے؛ لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم وبیش ہمیشہ رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضاء میں جگہ جگہ اپنے گھروندے بنائے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دست سوال پھیلائے رہتے ہیں؛ لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ وہی مشیت خداوندی کا کرشمہ ہے، کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دوچار ہے اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے، کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو اللہ کی اس پکڑ کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحب نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ

ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم و جور ہو جاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہل مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے، بر سر عام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے، ''اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (البقرة:۱۵۳) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ ﷺ نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نمازِ شکر، کسی مسلمان کی موت ہو جائے تو استغفار کے لئے نمازِ جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو نمازِ توبہ، کسی معاملہ میں خیر و شر اور نفع و نقصان سمجھ میں نہ آتا ہو، تو نمازِ استخارہ، سورج گہن ہو تو نمازِ کسوف، چاند گہن ہو تو نمازِ خسوف، کوئی ضرورت درپیش ہو تو نمازِ حاجت، اسی طرح اگر بارش رُک جائے تو نمازِ استسقاء۔

رسول اللہ ﷺ نے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے اور صرف دُعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ ﷺ خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، اس نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دُعاء مانگئے، آپ ﷺ نے تین بار دُعاء کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایات میں: ''اللّٰهم اسقنا'' کے الفاظ ہیں اور بعض میں ''أغثنا'' کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا؛ لیکن آپ ﷺ کی دُعاء ایسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو

پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں اور جانور غرقاب ہورہے ہیں، آپ دُعاء فرمائیے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دُعاء فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو: ''اللھم حوالینا و لا علینا'' چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گرد و پیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۳) حضور ﷺ نے ہاتھ اُٹھا کر بارش کے لئے دُعاء فرمائی تھی اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کی؛ حالاں کہ خطبہ میں ہاتھ اُٹھا کر دُعاء مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دستِ مبارک اتنا اونچے اُٹھائے کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۹، ۳۰، ۳۱) حضور ﷺ کے اسی عمل کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دُعاء پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ (رد المحتار: ۱/۳)

بہتر یہ ہے کہ دُعاء کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز بھی خاص اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل نقل کیا ہے، (بخاری حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ: ''سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتٰک حدیث الغاشیہ'' کی سورت پڑھی جائے۔ (الفقہ الاسلامی وادلۃ: ۲/۱۵)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہو کر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں، (رد المحتار: ۱/۱، الفقہ الاسلامی وادلۃ: ۲/۲۰) کیوں کہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے نماز عید کی طرح نماز استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں اور جیسے خطبہ عیدین میں کلماتِ تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے؛ کیوں کہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے، (الفقہ الاسلامی وادلۃ: ۲/۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطباتِ

عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی طرح استسقاء کے خطبہ اولی میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالہ سابق: ۲/۴۲۱)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گذر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو، تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کر دے اور گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کر دے؛ لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبداللہ بن زید ﷺ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رداء مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں؛ بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو، تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی جائے، (الدر المختار مع الرد: ۲/۳۷) یہ بھی مستحب ہے کہ نماز استسقاء کے موقع سے بوڑھوں اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے؛ بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (رد المحتار: ۲/۳۷) کہ ان کمزوریوں کو دیکھ کر اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہو تو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نماز استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں، تو حق ادا کر دینے کی کوشش کریں، (در مختار و رد المحتار: ۲/۳۷) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں؛ لیکن امام ابوداؤد نے حضرت عائشہ ﷺ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج نکلتے وقت نماز استسقاء کے لئے تشریف لے گئے، (ابوداؤد، باب رفع الیدین فی الاستسقاء) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت نماز استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں حاجی کے دیدہ ور لوگوں کو شامل رکھا

جائے، حضرت عمرؓ نے خاص طور پر حضرت عباسؓ کو اور حضرت معاویہؓ نے یزید بن اسودؓ کو نماز استسقاء میں شامل رکھا تھا اور انھیں سے دُعاء کرائی تھی۔

امام خطبہ کے درمیان بارش کے لئے دُعاء کرے گا اور دُعاء کے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کر لے گا، جیسا کہ گذرا ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کرے گا اور لوگ اس کی دُعاء پر آمین کہتے جائیں گے، استسقاء کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مختلف دُعائیں منقول ہیں، غالباً سب سے مختصر دُعاء وہ ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، تین بار: ''اللهم أغثنا ''کے الفاظ، یہاں ایک تفصیلی دُعاء کا نقل کر دینا بھی مناسب ہوگا، جسے امام ابوداؤد نے نقل فرمایا ہے:

اللهم اسقنا غيثاً مغيثاً مرئياً مريعاً نافعاً غير ضار عاجلاً غير اجل ، اللهم اسق عبادك وبهائمك وانشر رحمتك واحي بلدك الميت. (ابوداؤد، حدیث نمبر:۱۱۶۹، ۱۱۷۶)

اے اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما، ایسی بارش جو ہماری فریاد کو پوری کرے، ہلکی پھواریں، غلہ اگانے والی ہوں، نفع دینے والی، نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی نہ کہ دیر لگانے والی، خداوندا! اپنے بندوں اور جانوروں کو سیراب کر، اپنی رحمت کو پھیلا اور اپنے مردہ شہروں کو زندہ کر دے۔

(۹/اگست ۲۰۰۲ء)

قنوتِ نازلہ — احکام و مسائل

اللہ قادر مطلق ہے اور انسان اپنے خالق کے مقابلہ عاجز محض، دنیا میں کوئی بھی واقعہ جو پیش آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر وہ وقوع پذیر نہیں ہوسکتا؛ اس لئے ایک صاحب ایمان کا کام یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی مصیبت یا آزمائش سے دوچار ہو، اللہ کی طرف رجوع کرے اور اللہ کے خزانۂ غیب سے مدد کا طلب گار ہو؛ اسی لئے اسلام میں ایک مستقل نماز نمازِ حاجت رکھی گئی، کہ انسان کی کوئی بھی ضرورت ہو، دو رکعت نماز خاص اسی نیت سے پڑھ کر اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے ، بعض دفعہ ضرورتیں یا ابتلائیں غیر معمولی ہو جاتی ہیں، ان مواقع کے لئے شریعت نے مخصوص نمازیں رکھی ہیں، جیسے کسی کی وفات ہو جائے تو نمازِ جنازہ، بارش نہ ہو تو نماز استسقاء، کسی معاملہ کے بارے میں اضطراب ہو کہ کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے؟ تو نمازِ استخارہ، سفر کے موقع پر دوگانۂ سفر۔

اسی طرح اگر دشمنوں سے مقابلہ ہو، خواہ مسلمان اعداءِ اسلام کے خلاف اقدامی جہاد کر رہے ہوں، یا مدافعت کے موقف میں ہوں، یا ظلم و ابتلاء سے دوچار ہوں، تو ایسے مواقع کے لئے کوئی مستقل نماز تو نہیں رکھی گئی؛ لیکن ایک خصوصی دُعاء رکھی گئی ہے، جس کو "قنوتِ نازلہ" کہتے ہیں، نازلہ کے معنی مصیبت و آزمائش کے ہیں اور قنوت کے متعدد معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک معنی دُعاء ہے اور اس تعبیر میں یہی معنی مراد ہے، پس قنوتِ نازلہ کے معنی ہوئے مصیبت کے وقت کی دُعاء، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جو کمزور لوگ پھنسے ہوئے تھے اور اہل مکہ انھیں ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کے لئے قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، اسی طرح ایک خاص واقعہ پیش آیا، جس میں حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید کر دی گئی، یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں بئر معونہ سے مشہور ہے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایک ماہ تک قنوت نازلہ

پڑھی ہے۔

قنوتِ نازلہ کے سلسلہ میں کئی باتیں قابل ذکر ہیں، قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص تھا، یا آج بھی امت کے لئے باقی ہے؟ قنوتِ نازلہ کن مواقع پر پڑھی جائے گی؟ کس نماز میں پڑھی جائے گی؟ اور نماز میں قنوت پڑھنے کا کیا محل ہے؟ کون پڑھے گا؟ باآواز بلند پڑھی جائے یا آہستہ؟ جب امام قنوتِ نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ قنوتِ نازلہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ ﷺ سے کن الفاظ میں منقول ہے؟

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ قنوتِ نازلہ آپ ﷺ کے لئے مخصوص تھی؛ لیکن تمام قابل ذکر فقہاء وائمہ مجتہدین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی قنوت نازلہ کا حکم باقی ہے؛ چنانچہ حضرت ابوبکر ﷺ سے مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے وقت آپ نے قنوتِ نازلہ پڑھی، حضرت عمر ﷺ نے بھی بعض مواقع پر قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، آپ کی قنوت کے الفاظ بھی کتبِ احادیث میں تفصیل کے ساتھ منقول ہیں، خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی ﷺ اور حضرت معاویہ ﷺ کے درمیان جنگ کے موقع پر دونوں نے قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، (دیکھئے: منحة الخالق علی البحر :۴۴/۲) —— اس لئے صحیح یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص نہیں تھا اور اب بھی یہ حکم باقی ہے، ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔

(دیکھئے: حلبی: ۴۲۰، شرح مهذب: ۵۰۶/۳، المقنع: ۱۳۵/۴)

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ وجدال کے علاوہ دوسری مصیبتوں کے مواقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنی مسنون ہے، امام نووی شافعیؒ نے وباء اور قحط میں قنوت پڑھنے کا ذکر کیا ہے، (روضة الطالبين و عمدة المفتيين :۲۵۴/۱) حنابلہ کے یہاں بھی ایک قول یہ ہے کہ وبائی امراض پھوٹ پڑنے پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھی جا سکتی ہے، (دیکھئے: الانصاف مع المقنع :۱۳۹/۴) حنفیہؒ نے بھی لکھا ہے کہ طاعون کی بیماری پھیل جائے تو اس کا شمار بھی نوازل میں ہوگا، (رد المحتار : ۴۴۷/۲) ویسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ ﷺ سے وبائی امراض وغیرہ میں قنوتِ نازلہ پڑھنا ثابت نہیں؛ چنانچہ حضرت عمر ﷺ کے عہد میں جو طاعون عمواس کا واقعہ پیش آیا، تو اس موقع پر قنوت

نہیں پڑھی گئی (الانصاف: ۱۳۹/۲) گویا اصل میں تو قنوتِ نازلہ جنگ کے موقع پر پڑھی گئی ہے؛ لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء نے دوسری مصیبتوں میں بھی قنوتِ نازلہ کی اجازت دی ہے؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح میں قنوت اسی وقت پڑھتے تھے، جب کسی گروہ کے حق میں دُعاء کرنا یا کسی گروہ کے خلاف بددُعاء کرنا مقصود ہوتا، (اعلاء السنن، حدیث نمبر: ۱۷۱۵) اسی مضمون کی روایت حضرت انس ﷺ سے بھی مروی ہے۔
(اعلاء السنن: حدیث نمبر: ۱۷۱۴)

گویا جب مسلمان اعداءِ اسلام سے جنگ کی حالت میں ہوں تب تو خاص طور پر قنوتِ نازلہ مسنون ہے؛ لیکن دوسری اجتماعی مصیبتوں کے موقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

قنوتِ نازلہ کس نماز میں پڑھنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مسلسل ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، جس میں آپ بنو سلیم، رعل، ذکوان، عصیہ قبائل کے لئے بددُعاء فرمائی ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۴۴۳) بخاری میں حضرت انس ﷺ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مغرب اور فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھا کرتے تھے، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۴) رسول اللہ ﷺ کا فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنا حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، (طحاوی: ۱۴۲/۱) حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی ایک روایت میں نماز عشاء میں قنوتِ نازلہ پڑھنے اور مکہ کے مستضعفین کے لئے دُعاء کرنے کا ذکر ہے، امام طحاوی نے اس کو متعدد سندوں سے نقل کیا ہے؛ چنانچہ فقہاء شوافع کے نزدیک تو پانچوں نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے، (شرح مہذب: ۵۰۶/۲، روضۃ الطالبین: ۲۵۴/۱) حضرت امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے، ایک قول کے مطابق فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنی چاہئے، ایک قول یہ ہے کہ تمام جہری نمازوں میں پڑھ سکتا ہے اور ایک قول کے مطابق صرف نماز فجر میں، (دیکھئے: الشرح الکبیر: ۱۳۷/۴، الانصاف مع المقنع: ۱۳۷/۴) غرض حنابلہؒ کے مختلف

اقوال اس سلسلہ میں منقول ہیں۔

فقہاء احناف کے یہاں دو طرح کی تعبیرات ملتی ہیں، ایک یہ کہ تمام جہری نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنا چاہئے، فقہ حنفی کی اکثر متون یعنی بنیادی کتابوں میں یہی لکھا ہے: "فیقنت الامام فی الصلوٰۃ الجھریۃ" (ملتقی الابحر علی ھامش المجمع: ۱۲۹/۱) مشہور حنفی فقیہ علامہ حصکفیؒ نے بھی بعینہٖ یہی الفاظ لکھے ہیں، (درمختار مع الرد: ۴۴۸/۲) مشہور محقق امام طحاوی نے بھی جہری نمازوں میں قنوت کی اجازت نقل کی ہے، (طحطاوی علی المراقی: ۲۰۶) یہی بات بعض دوسرے فقہاء احناف سے بھی منقول ہے، (دیکھئے: رد المحتار: ۴۴۸/۲) ماضی قریب کے اہل علم میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے، (فیض الباری: ۳۰۲/۲) اور علامہ حموی نے اسی قول کو زیادہ درست قرار دیا ہے، (منحۃ الخالق علی البحر: ۴۴/۲) —— دوسری رائے یہ ہے کہ صرف نماز فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنا درست ہے، علامہ شامیؒ کا رجحان اسی طرف ہے، شامیؒ کا گمان ہے کہ ممکن ہے کہ بعض نقل کرنے والوں نے "صلاۃ الفجر" کو غلطی سے "صلاۃ الجہر" لکھ دیا ہو، (دیکھئے: رد المحتار: ۴۴۸/۲) لیکن جب اتنی ساری نقول موجود ہیں، تو محض ظن وتخمین کی بناء پر اسے رد نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے خود علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ شاید اس سلسلہ میں احناف کے دو قول ہیں: "ولعل فی المسئلۃ قولین"۔ (منحۃ الخالق علی ھامش البحر: ۴۴/۲)

پس، جو بات راجح معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قنوتِ نازلہ مغرب، عشاء اور فجر تینوں میں پڑھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں احادیث موجود ہیں؛ البتہ چوں کہ فجر کے بارے میں اتفاق ہے اور دوسری نمازوں کی بابت اختلاف؛ اس لئے بہتر ہے کہ فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے پر اکتفا کیا جائے —— رہ گئی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جس میں ظہر وعصر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کا ذکر ہے، تو اکثر فقہاء کے نزدیک وہ منسوخ ہے اور احادیث میں بعض قرائن اس کے منسوخ ہونے پر موجود ہیں۔

نماز میں قنوتِ نازلہ کب پڑھی جائے گی؟ تو اس سلسلہ میں احادیث قریب قریب متفق ہیں کہ قنوتِ نازلہ رکوع کے بعد پڑھی جائے، (دیکھئے: بخاری حدیث نمبر: ۱۰۰۲، ابوداؤد: حدیث نمبر: ۱۴۴۳)

فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔(منحة الخالق علی هامش البحر:۲/۴۴)

دُعاءِ قنوت زور سے پڑھی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ ؓ کی صحیح روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ مضر کے خلاف بددُعاء کرتے ہوئے جہراً قنوت پڑھی ہے، (بخاری کتاب التفسیر، باب قولہ: لیس لک من الامر شئی) اس لئے راجح قول یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ امام کو جہراً پڑھنا چاہئے، اسی کو اہل علم نے ترجیح دی ہے، (دیکھئے: اعلاء السنن:۶/۱۱۲) یوں دُعاء آہستہ کرنا بھی درست ہے؛ بلکہ عام حالات میں آہستہ دُعاء کرنا افضل ہے؛ لہٰذا آہستہ دُعاء کرنے کی بھی گنجائش ہے —— جب امام قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر امام جہراً دعاء قنوت پڑھے، تو مقتدی آمین کہنے پر اکتفاء کرے اور اگر آہستہ قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی بھی دُعاء کو دہرائے، (رد المحتار :۲/۴۴۹) —— اس بات پر حنفیہ کا اتفاق ہے کہ جیسے نماز سے باہر ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کی جاتی ہے، اس طرح قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اُٹھا کر دُعاء نہیں کی جائے گی؛ لیکن ہاتھ باندھ کر رکھا جائے؟ یا چھوڑ دیا جائے؟ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث موجود نہ ہونے کی وجہ سے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک ہاتھ باندھنا بہتر ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک ہاتھ چھوڑے رکھنا بہتر ہے، (دیکھئے: اعلاء السنن:۶/۱۲۲) چوں کہ قنوتِ نازلہ "قومہ" کی حالت میں پڑھا جاتا ہے اور قومہ کی حالت میں ہاتھ چھوڑے رکھنا مسنون ہے، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ہاتھ چھوڑے رکھے؛ البتہ بعض شوافع اور حنابلہ کے نزدیک قنوتِ نازلہ میں بھی اسی طرح ہاتھ اٹھانے کی گنجائش ہے، جس طرح عام دُعاؤں میں، (دیکھئے: المغنی:۲/۵۸۴ بہ تحقیق ترکی وغیرہ) مگر خاص نماز کی حالت میں ہاتھ اُٹھا کر دُعاء کرنے میں غالباً کوئی حدیث نہیں۔

رہ گئے قنوتِ نازلہ کے الفاظ، تو اس سلسلہ میں کچھ خاص الفاظ ہی کی پابندی ضروری نہیں: "واما دعاءه فليس فيه دعاء موقت" (البحر الرائق:۲/۴۱) البتہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ ؓ سے ثابت ہوں، ان کو پڑھنے کا اہتمام کرنا بہتر ہے، اس سلسلہ میں ایک تو حضرت علی ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان الفاظ میں دُعاء

سکھائی :

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي فِي مَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِي شَرَّ مَاقَضَيْتَ ، فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَايُقْضٰى عَلَيْكَ وَاِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ . (ابوداؤد،حدیث نمبر:۱۴۲۵)

اے اللہ! مجھے بھی ان لوگوں کیساتھ ہدایت عطا فرمایئے، جنھیں آپ نے ہدایت دی ہے اور مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ عافیت میں رکھئے، جن کو آپ نے عافیت سے سرفراز فرمایا ہے اور میری بھی ان لوگوں کے ساتھ نگہداشت فرمایئے، جن کو آپ نے اپنی نگہداشت میں رکھا ہے، جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت عطا فرمایئے، قضاء وقدر کے شر سے میری حفاظت فرمایئے؛ کیوں کہ آپ فیصلہ کرتے ہیں، آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، جسے آپ دوست بنالیں وہ ذلیل نہیں ہوسکتا اور جس کے آپ دشمن ہوں وہ باعزت نہیں ہوسکتا، پروردگار! آپ کی ذات، مبارک اور بلند ہے۔

حضرت عمرؓ کے بھی ایک دُعاء پڑھنا منقول ہے، جس کو امام نوویؒ نے بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، (الاذکار:۹۷) اور علامہ شامیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے، جو وتر والی دُعاء قنوت پڑھنے کے بعد وہ پڑھا کرتے تھے، اس دُعاء میں حضرت عمرؓ کی دُعاء کا عطر بھی آگیا ہے، اس لئے اس دُعاء کے الفاظ کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

اللهم اغفر للمومنين والمومنات والمسلمين والمسلمات والف بين قلوبهم وأصلح ذات بينهم و انصرهم على عدوك وعدوهم ، اللهم العن كفرة اهل الكتاب

الـذين يـكـذبـون رسـلـک ويقاتلون اولياء ک ، اللهم خـالف بـين كـلمتهم وزلزل أقدامهم وأنزل بهم باسک الذی لا ترده عن القوم المجرمين ۔ (رد المحتار: ۴۴۲/۲، ۴۴۳)

الٰہی! اصحابِ ایمان مردوں اور عورتوں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما دیجئے، ان کے دلوں کو جوڑ دیجئے، ان کے باہمی اختلاف کو دور فرما دیجئے، ان کی آپ کے دشمن اور ان کے دشمن کے مقابل مدد فرمایئے، اے اللہ! کفار اہل کتاب پر آپ کی لعنت ہو جو آپ کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور آپ کے اولیاء سے برسرِ پیکار ہیں، اے اللہ! ان کے درمیان اختلاف پیدا کر دیجئے، ان کے قدم کو متزلزل فرما دیجئے اور ان کو آپ اپنے اس عذاب میں مبتلا فرمایئے، جو مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ دُعاءِ قنوت کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھی بھیجنا چاہئے: "ويصلى على النبی وبه يفتی"۔ (درالمختار: ۴۴۲/۲)

یہ وقت ہے کہ ہر مسلمان اپنی جبین بندگی خدا کے سامنے خم کر دے اور پورے الحاح اور فروتنی کے ساتھ اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے، کہ دنیا میں اسلام کا نام سربلند ہو اور اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والے بالآخر آخرت کی طرح دنیا میں بھی محرومی کا حصہ لے کر واپس ہوں: "وما ذٰلک على الله بعزيز ، انه علٰى كل شیئ قدير"۔

(۱۹/۱/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

سورج گہن — اسلامی نقطۂ نظر

سورج، چاند، زمین و آسمان اور تمام ستارے اور سیارے جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کے وجود پر غور کیا جائے تو اللہ کی قدرت اور اس کی طاقت پر یقین بڑھتا ہے اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اس زمینی کرہ سے جن سیاروں اور ستاروں کا مشاہدہ کھلی آنکھوں کیا جاسکتا ہے، ان میں سورج سب سے بڑا بھی ہے اور نظامِ کائنات میں اللہ کے حکم سے سب سے زیادہ اثر انداز بھی، ایک شعلۂ جوالہ ہے، جو مسلسل اپنے سینہ کو جلا رہا ہے اور اپنی تپش سے کائنات کو زندگی کی حرارت بخشتا ہے، خدا کی شانِ ربوبیت دیکھئے کہ ایسے بڑے طاقتور اور شعلہ بار ستارہ کو بھی ایک دائرہ میں قید کر کے رکھا گیا ہے، جو اس زمینی کرہ کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، اگر وہ موجودہ مدار سے ہٹ کر زمین کے قریب آجائے تو پوری کائنات جل کر خاکستر ہو جائے اور اگر اس کا زمین سے موجودہ فاصلہ اور بڑھ جائے تو پوری زمین برف سے ڈھک جائے اور کسی جاندار کا زمین پر زندہ رہنا دوبھر ہو جائے، یہ اللہ کی قدرت ہے، کہ اس نے ہم انسانوں کے لئے ایک ایسا چراغ جلایا ہے، جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ دمک اُٹھتا ہے؛ لیکن کبھی اس کی لَو بڑھ کر زمین میں آگ نہیں لگاتی، انسان اس سے فائدہ تو اُٹھاتا ہے؛ لیکن اس کے نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اسی لئے اسے اللہ کی ایک نشانی اور آیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے شرک کے غلبہ کی وجہ سے لوگوں پر توہمات کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لوگ ہر غیر معمولی واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور سے متعلق کئے ہوئے تھے، سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بڑے اور برگزیدہ آدمی کی پیدائش یا وفات پر یہ گہن لگا کرتا ہے، اتفاق کہ جس دن صاحبزادۂ رسول حضرت ابراہیم ﷺ کا انتقال ہوا، اسی دن سورج

گہن لگا اور لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید صاحبزادۂ رسول کی وفات کی وجہ سے یہ سورج گہن لگا ہے، رسول اللہ ﷺ حالاں کہ صاحبزادہ کی وفات کی وجہ سے بہت رنجیدہ خاطر اور دل گیر تھے؛ لیکن ایسے مواقع پر تنبیہ اور غلط فہمی کے ازالہ کو آپ ﷺ ضروری سمجھتے تھے اور بروقت اس جانب توجہ فرماتے تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا، خطبہ کے درمیان آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گہن لگنے کا کوئی تعلق نہیں، جب تم گہن لگتے ہوئے دیکھو تو نماز کی طرف دوڑو۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸)

یہ رسول اللہ ﷺ کا خاص طریقۂ تربیت تھا کہ جس واقعہ کو لوگ کسی مشرکانہ عقیدہ کی بنیاد بناتے آپ ﷺ اسی کو اللہ کی وحدانیت کی طرف متوجہ کرنے اور عقیدۂ توحید کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنالیتے؛ چنانچہ سورج گہن کے موقعہ پر آپ ﷺ نے جہاں لوگوں کی تفہیم فرمائی اور ایک جاہلانہ توہم پرستی کا ازالہ فرمایا، وہیں آپ ﷺ نے اس موقعہ سے دو رکعت نماز ادا کرنے کی سنت بھی جاری فرمائی، نماز اللہ تعالیٰ کی توحید کا عملی اظہار ہے اور اس کے ایک ایک عمل سے اللہ سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہوتا ہے، جب نمازی نماز شروع کرتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہتا ہے، تو وہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اللہ سے بڑائی کی نفی بھی کرتا ہے، سورۂ فاتحہ تمام تر توحید کا بیان اور شرک کی نفی و تردید ہے، غرض نماز کے ایک ایک جز کی روح یہی ہے کہ خدا سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو۔

یہ کچھ اسی موقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں؛ بلکہ احکام شریعت میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں، کہ جس موقعہ پر لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تھے، اسلام نے اسی موقعہ کو توحید کی تبلیغ واشاعت اور اس کی دعوت کا ذریعہ بنایا، اسلام سے پہلے لوگ اپنے معاملات میں خیر و شر کو سمجھنے اور نفع و نقصان کا اندازہ کرنے کی غرض سے فال نکالا کرتے تھے، یہ فال بتوں کے سامنے نکالے جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ استخارہ کی نماز کا حکم فرمایا کہ جن اُمور کے بارے میں انسان کے دل میں تذبذب ہو اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے، وہ دو رکعت نماز پڑھ کر

اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو، کہ اس کے لئے جس بات میں خیر ہو، وہ اللہ اس کے دل میں ڈال دے، اسی طرح لوگ بتوں کے سامنے قربانی کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے قربانی کو باقی رکھا؛ لیکن بندگی اور عقیدت کی سمت تبدیل کر دی؛ تاکہ یہی عمل جو شرک کا مظہر ہے، توحید کا شعار بن جائے اور اللہ کی بندگی کے رنگ میں رنگ جائے، مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، ان کا یہی طور وطریق ہونا چاہئے، کہ وہ خود مشرکانہ تصورات سے متاثر ہونے کے بجائے ہر جگہ اسلامی فکر کو غالب کرنے اور معاشرہ کو توحید کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں، نہ یہ کہ ہم خود دوسری قوموں کی نقل کرنے لگیں۔

سورج گہن کو عربی زبان میں "کسوف" کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقعہ سے حضرات صحابہ کو دو رکعت نماز پڑھائی، جس میں بہت طویل قراءت فرمائی، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی تلاوت کی، (ابوداؤد عن عائشہؓ، حدیث نمبر: ۱۰۸۶) جتنی طویل آپ ﷺ نے قرأت فرمائی، اتنا ہی طویل رکوع فرمایا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸) حضرت اسماء کی روایت میں ہے کہ ان پر نماز میں غشی سی طاری ہوگئی، یہاں تک کہ انھیں اپنے سر پر پانی ڈالنا پڑا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۸۶) حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع میں گئے تو ایسا لگتا تھا کہ آپ رکوع سے اُٹھیں گے نہیں اور جب رکوع سے اُٹھے تو اتنی دیر کھڑے رہے کہ گویا کھڑے ہی رہیں گے، اسی طرح آپ ﷺ نے نماز کے تمام ارکان کو ادا فرمایا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۱۹۴)

نماز میں آپ ﷺ پر اس قدر گریہ طاری تھا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ دوسری رکعت کے آخری سجدہ میں آپ ﷺ کی سانس پھولنے لگی، آپ ﷺ روتے جاتے تھے، (نسائی، حدیث نمبر: ۱۴۸۲) ایک روایت میں ہے کہ بے ساختہ زبان مبارک سے "اُف اُف" نکل جاتا تھا، پھر آپ ﷺ خدا کے حضور عرض کناں ہوئے، میرے پروردگار! کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ میں جب تک ان کے درمیان رہوں آپ انھیں عذاب نہیں دیں گے؟ کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ لوگ استغفار کرتے رہیں، آپ انھیں عذاب میں مبتلا

نہیں فرمائیں گے؟ (ابوداود، حدیث:۱۱۹۴) غرض ایک گھبراہٹ اور اضطراب کی کیفیت آپ ﷺ پر طاری تھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی جب تک سورج اچھی طرح کھل نہیں گیا، آپ ﷺ قبلہ رُخ دُعاؤں میں مشغول رہے۔ (ابوداود، حدیث نمبر:۱۱۸۴)

سورج گہن کے موقع سے آپ ﷺ نے دُعاء، تکبیر اور صدقہ کرنے کی بھی تلقین فرمائی: ''فاذا رأیتم ذلک فادعوا اللہ و کبروا وصلوا وتصدقوا '' (بخاری، باب الصدقۃ فی الکسوف) اسی موقعہ سے آپ ﷺ کو جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی ہولناک سزاؤں کی جھلکیاں بھی دکھائی گئیں، جنت کا خوشگوار نظارہ ایسا تھا کہ بے ساختہ آپ ﷺ کے قدم آگے بڑھ جاتے اور دوزخ کی ہیبت ناکیاں ایسی تھیں کہ قدم پیچھے ہٹ جاتے، (بخاری عن عبداللہ بن عباس، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ) اس لئے آپ ﷺ نے خاص طور پر اس موقعہ سے صحابہ ﷺ کو اس جانب متوجہ فرمایا کہ وہ عذاب قبر سے حفاظت کی دُعاء کریں: ''ثم امرھم ان یتعوذوا من عذاب القبر '' (بخاری: باب التعوذ من عذاب القبر) — وجہ اس کی ظاہر ہے، سورج جیسا روشن ستارہ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی کی بھیک حاصل کرتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ اس دنیا سے آج وہ تاریک نظر آرہا ہے، یہ اس لئے کہ چاند، سورج اور زمین کے درمیان چند لمحوں کے لئے حائل ہو گیا ہے، جو معمول کے خلاف ہے، اگر اللہ تعالیٰ ستاروں کی گردش کے نظام میں ایسی تبدیلی فرمادے کہ مسلسل یہ کیفیت برقرار رہے تو زمین کے لئے روشنی کا حصول کس قدر دشوار ہو جائے؟ پھر اگر سورج اپنے مدار سے ہٹ جائے، زمین سے قریب آجائے اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ لے، تو شاید وہی لمحہ قیامِ قیامت کا ہوگا؛ لیکن یہ رحمتِ خداوندی ہے کہ کائنات کے مختلف سیاروں میں ایسی قوتِ کشش رکھی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس وسیع وعریض فضا میں باہم متصادم نہیں ہوتے؛ اس لئے سورج گہن یا چاند گہن کا واقعہ قیامت کی، قبر کی اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن سے متعلق بعض خیالات وتصورات جو عوام میں گردش کرتے رہتے ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ہاں میڈیکل اعتبار سے انسان کی بینائی یا زیرِ حمل

جنین پر گہن کا اثر پڑتا ہو، تو ایسا ممکن ہے اور اس سلسلہ میں ڈاکٹرس اور طبی ماہرین ہی صحیح نقطۂ نظر پیش کر سکتے ہیں؛ لیکن عوام میں جو یہ بات پھیل گئی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سورج گہن کے درمیان حاملہ عورتوں کے لئے کچھ خصوصی احکام ہیں، یہ صحیح نہیں، اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بس اسی قدر ہے کہ اس موقع کو کھیل، تماشہ اور لہو ولعب کا سامان بنانے کے بجائے عبرت و موعظت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنایا جائے اور یہ واقعہ ایمان کی تجدید، یقین میں اضافہ، آخرت کے استحضار اور رُجوع الی اللہ کا ذریعہ اور محرک بنے، یہی اس عظیم کائناتی واقعہ کا پیغام اور اس کی دعوت ہے۔

(۱۳؍اگست ۱۹۹۹ء)

شہابِ ثاقب — اسلامی نقطہ نظر

۱۷ ار اور ۱۸ ار نومبر کی شب قدرت کی آتش بازی کی شب تھی، اس رات آسمان سے شہاب ثاقب کی ایسی خوبصورت بارش ہوئی کہ ایک طرف آنکھیں اس کی دید کے لئے مشتاق تھیں اور دوسری طرف سائنس واں لرزہ براندام تھے کہ کہیں ان شوخ انداز پری پیکر شہابیوں کے قدم ناز فضا میں بنائے ان کے مصنوعی گھروندوں (سیاروں) کو نقصان نہ پہنچائیں، یہ شہاب ثاقب پانچ ہزار فی گھنٹہ کی تعداد میں زمین کی طرف لپک رہے تھے، کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ۱۸۳۳ء اور ۱۹۶۶ء میں بھی لوگوں کو یہ خوشگوار منظر دیکھنے کو ملا تھا، ۱۸۳۳ء میں شہاب ثاقب کی بارش کا یہ منظر ایک مؤرخ آر، ایم، ڈیونس کو اس قدر بھایا کہ اس نے اسے امریکہ کی تاریخ کے سو یادگار واقعات میں شمار کیا، اس قدرتی فلکیاتی واقعہ نے ہفتوں اخبارات اور جرائد میں کلیدی اہمیت حاصل کر لی اور فکر و نظر کا موضوع بنا رہا، اس کے فوائد اور نقصانات پر گفتگو ہوتی رہی اور امکانی خطرات اور اندیشے غور و فکر کا محور بنے رہے، آیئے! اس مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، کہ کوئی سا بھی واقعہ پیش آئے ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی پہلو سے اس پر غور کرے اور اس کو اپنے لئے عبرت و موعظت کا، ایمان میں اضافہ کا اور ذکر و اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

قرآن نے خدا کو صرف زمین ہی کا رب قرار نہیں دیا ہے؛ بلکہ خدا کو ''رب العالمین'' کہا ہے، یعنی پوری کائنات اور تمام عالموں کا رب، اس لئے اس دنیا کی فضا میں جو بے شمار بڑے چھوٹے، گرم اور ٹھنڈے، حیات کے لائق اور اس کے لئے غیر موزوں جتنے اجرام فلکی ہیں، وہ سب ایک نظام سے مربوط ہیں اور حکم الٰہی کے تابع ہیں، سورج یا کسی سیارہ سے شہابیوں کا گرنا قرآن مجید نے تسلیم کیا ہے، (الحجر:۱۸) حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ (بخاری:۲/۶۸۴)

اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ ہم نے آسمان میں ''برجیاں'' یعنی حفاظتی قلعے بنائے ہیں: ''وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجاً'' (الحجر:۱۶) عربی زبان میں ''سماء'' آسمانی کائنات کو بھی کہتے ہیں، جس کا ٹھوس وجود ہے اور واقعہ معراج میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے گو انسان کی عقل کوتاہ نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی ہے اور ''سماء'' کے معنی فضا کے بھی ہیں، جو بظاہر محض ایک خلا محسوس ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں اَن دیکھے قلعے تعمیر کئے ہوئے ہیں، یہ جہاں ایک طرف زمین سے اوپر کی طرف چڑھنے والی آلودگیوں کو تحلیل کرتی ہے اور انسان کو اس کے نقصان اور مضر اثرات سے بچاتی ہے وہیں دوسری طرف فضا میں جو بے شمار سیارے شب و روز مصروفِ رقص ہیں اور چلتے چلتے کبھی ان کے پاؤں نہیں تھکتے، ان کی طرف سے ہماری اس زمینی دنیا کو نقصان پہنچانے والے جو فضلات گرتے ہیں، ان کو بھی تحلیل کرتی جاتی ہے، یا تو ان کو زمین تک پہنچنے نہیں دیتی یا زمین تک پہنچتے پہنچتے ان کا حجم بہت ہی معمولی ہو جاتا ہے، عجب نہیں کہ یہی فضائی قلعے ہوں جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

دنیا میں شہابی پتھروں کے جو نمونے پائے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا پتھر چھ سو پینتالیس (۶۴۵) پونڈ وزن کا ہے، جو گرنے کے بعد گیارہ فٹ زمین کے اندر دھنس گیا، ایک اور مقام پر ''ساڑھے چھتیس ٹن لوہے کا تودہ'' پایا گیا، جس کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ شہاب ثاقب ہی ہے جو زمین تک آپہنچا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر شہابِ ثاقب اپنی اصل صورت میں زمین پر وارد ہوتے رہیں تو یہ زمین پر بسنے والوں کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہوگی؟ یہ تو شہاب ثاقب کا حجم ہے اور یہ کتنی بڑی تعداد میں ہر دن زمین کی طرف گرتے ہیں اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے کیجئے جن کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۴۶ء، ۳۰/۱۵، ۳۳۷) کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

> زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں

> سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے، ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے، بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے؛ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ر نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرق علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ (تفہیم القرآن: ۵۰۱/۲)

یہ تو شہاب ثاقب کے سلسلہ میں وہ فلکیاتی حقائق ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس "نظر آنے والی حقیقت" کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی "غیبی حقیقت" کو بھی متعلق کر دیا ہے، جسے انسان نہیں دیکھ سکتا اور وہ یہ کہ عالم بالا پر اللہ تعالیٰ کے جن فیصلوں کا اعلان فرشتوں کے درمیان کیا جاتا ہے، شیاطین ان کو سننے اور جاننے کے لئے اُوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، شہاب ثاقب کی یہ بارش ان کو اس سے روکتی ہے اور آسمان تک رسائی سے محروم رکھتی ہے، قرآن نے کئی مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے۔ (الحجر: ۱۸، الملک: ۵)

بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں خلافِ عقل معلوم ہوتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قانونِ فطرت کے تابع ہے، شیطان کے بھگانے اور اس کے سفر آسمانی کو روکنے سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں، ایک ہی واقعہ کا ایک ظاہری سبب ہو سکتا ہے، جو نگاہ کے احاطہ میں ہو اور ایک چھپا ہوا سبب، جسے دیکھا نہ جا سکے، اسی اَن دیکھے سبب تک پہنچنے اور اس کو ماننے کا نام "ایمان بالغیب" ہے، انسان اپنے وجود ہی پر غور کرے، بظاہر انسان کا وجود ایک مرد اور ایک عورت کے ملاپ کا نتیجہ ہے؛ لیکن کیا روح و زندگی کے پیدا ہونے کے لئے یہی کافی ہے؟ کیا یہ بات انسان کی قدرت میں ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کسی زندہ انسان کو وجود بخشے؟ اور کیا انسان کا یہ صنفی عمل ہمیشہ ہی تولید کا ذریعہ بنتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب

''نفی'' میں ہے، صنفی تعلق ایک ظاہری سبب ہے؛ لیکن اس کے پیچھے ''حکم خداوندی'' کا حقیقی سبب کارفرما ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے جو انسان کے وجود کا سبب بنتا ہے ورنہ کوئی جوڑا لاولد نہیں ہوتا اور ہر ماں باپ کے کتنے ہی بال بچے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے انسان کے امتحان کے لئے بہت سی حقیقتوں کو چھپا رکھا ہے؛ تاکہ اس بات کی آزمائش ہو سکے کہ انسان اَن دیکھی حقیقتوں پر بھی یقین کرنے کو تیار ہے! اللہ تعالیٰ انسانوں کی سرزنش اور تنبیہ کے لئے بارش روکتے ہیں اور کبھی حد سے زیادہ بارش بھیجتے ہیں، سیلاب بلاخیز، علاقہ کے علاقہ کو تباہ وتاراج کر دیتا ہے، طوفان اور زلزلہ کا عذاب آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب یہ بھی ہے کہ کوئی قوم باہمی افتراق میں مبتلا ہو اور ان کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ جائیں، یہ سب خدا کی طرف سے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات ہیں؛ لیکن ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب سے متعلق کر دیا ہے؛ تاکہ خدا جن باتوں کو بن دیکھے منوانا چاہتا ہے وہ بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں، آخرت کی دنیا وہ دُنیا ہوگی جس میں یہ تمام حقیقتیں بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں گی، فرشتے ان کی نگاہوں میں ہوں گے، جنت و دوزخ کو وہ اپنے سر کی آنکھوں دیکھے گا، صالحین تجلی ربانی کو اپنا سرمۂ چشم بنائیں گے، اس دن ان حقیقتوں پر ایمان لانے کا کوئی وزن نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ ایک دیکھی ہوئی حقیقت کا اقرار ہوگا، غرض شہابِ ثاقب کے ٹوٹنے کا ایک ظاہری سبب ہے، جو انسانی عقل کی گرفت میں آچکا ہے اور ایک غیبی سبب ہے جس کو انسان کی عقل نارسا دریافت نہیں کر سکتی اور جس کا علم ہمیں خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے ہوتا ہے، یہ بات نہ خلاف عقل ہے اور نہ خلاف فطرت۔

ایسے غیر معمولی کائناتی واقعات پیش آنے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا کائنات محض ایک تماشہ گاہ ہے اور ہم اس کے تماشہ بیں؟ یا ایسے واقعہ کے لئے کوئی اسوۂ نبوی بھی موجود ہے؟...... یقیناً موجود ہے! آپ نے سورج گہن کے موقع سے نماز ادا کی ہے؛ کیوں کہ یہ ایک غیر معمولی کائناتی واقعہ ہے، چاند گہن کے موقع سے بھی آپ ﷺ نے نماز

پڑھنے کی ہدایت دی ہے، (بخاری: ۱/۱۴۵) حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے زلزلہ کے موقع سے نماز ادا فرمائی، (سنن ابی داؤد) اسی لئے فقہاءِ حنفیہ اور شوافع نے زلزلہ، مسلسل بجلی کی چمک، تیز ہوا، دن کے وقت تاریکی، رات کے وقت غیر معمولی روشنی، مسلسل بارش اور برف باری، وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے اور اس طرح کی آفتوں کے موقع پر تنہا تنہا دو رکعت نماز ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے، (مراقی الفلاح: ۹۲، بدائع الصنائع: ۱/۲۸۳، شرح مہذب: ۵/۵۸) اور زلزلہ میں تو فقہاءِ حنابلہ نے بھی اس طرح نماز پڑھنے کو مستحب کہا ہے، (کشاف القناع: ۲/۳۷، المغنی: ۲/۴۲۹) اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم اس طرح گھبراہٹ والی چیز دیکھو تو دُعاء کے ذریعہ اللہ کی طرف متوجہ ہو اور بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ کا ذکر اور استغفار کرو۔ (نصب الرایۃ: ۲/۲۳۴)

ظاہر ہے کہ معمول سے بڑھ کر شہاب ثاقب کی بارش کا واقعہ یقیناً گھبرا دینے والا واقعہ ہے؛ کیوں کہ اگر یہ شہاب ثاقب اپنے اصل حجم میں زمین پر آپہنچے اور فضا سے گزر کر زمین پر یہ بارش ہونے لگے، تو شاید ہی کائنات کی کوئی چیز بچ سکے اور اگر وہ ان مصنوعی سیاروں ہی کو تباہ کر دے جن کو انسان نے فضا میں بھیجا تو بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ ہوگا اور جو لوگ آج کی ترقی یافتہ دُنیا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں، مواصلات اور ابلاغ کے جدید ذرائع پر جن کا کاروبار اور بہت سی بنیادی ضروریات موقوف ہیں، ان کے لئے یہ حادثہ زندگی کو کتنا بے لطف کر کے رکھ دے گا۔

اس لئے ایسے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل نماز عام نمازوں کی طرح ادا کی جائے، نماز تنہا ادا کی جائے نہ کہ جماعت سے، دُعاء کی جائی کہ خداوند! اس واقعہ کے شر سے ہماری اور پوری انسانیت کی حفاظت فرمائیے!!

(۲۷ نومبر ۱۹۹۸ء)

❁ ❁ ❁
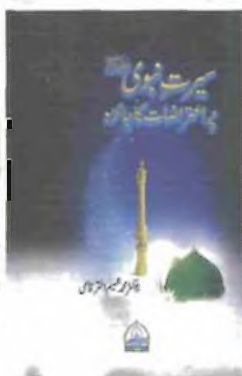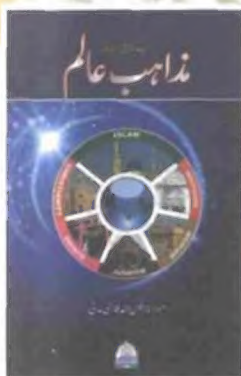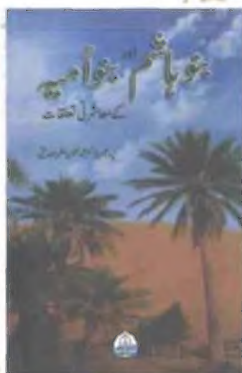
رحمان مارکیٹ ◎ غزنی سٹریٹ ◎ اردو بازار ◎ لاہور ◎ پاکستان
Ph: 042-37231119 , 0321-4021415
qasimulaloom@gmail.com